یادنامۂ داؤدی

مرتبین: تحسین فراقی
جعفر بلوچ

یادنامۂ داؤدی

مرتبین:

تحسین فراقی

جعفر بلوچ

دارالتذکیر

غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

نام کتاب: یاد نامۂ داؤدی
(Yadnama-e-Daoodi)

مرتبین: تحسین فراقی، جعفر بلوچ

سال اشاعت: جنوری ۲۰۰۳ء

کمپوزنگ: محمد امجد

طابع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

تعداد: ۵۰۰

قیمت: ۲۰۰ روپے

تقسیم کار:

دارالتذکیر، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور، فون: ۷۲۳۱۱۱۹

مکتبہ تعمیر انسانیت، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

ترتیب

شخص و عکس

منتخبات داؤدی

انتظاریہ

سرِ متن

(۱)

جناب خلیل الرحمٰن داؤدی (۱۹۲۳ء-۲۰۰۲ء) علمی و ادبی تحقیق کے مردِ میدان اور مخطوطہ شناسی میں یکتائے عصر تھے۔ اُنھوں نے اپنی خداداد تحقیقی صلاحیتوں کو اپنے خونِ جگر سے روشن تر کیا اور پھر ان سے کام لے کر ادب اور خصوصاً اُردو ادب کی ثروت مندی اور تابندگی میں قابلِ قدر اضافے کیے۔ اُنھوں نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے ادب کے متعدد نامعلوم اور نیم روشن پہلوؤں کو اُجاگر کیا اور اس طرح وہ آفاقِ حیات کی مزید توسیع و تنویر کی سعادت سے بہرہ یاب ہوئے۔

جناب خلیل الرحمٰن داؤدی نے اپنے نام کی برکت سے ادب میں براہیمی کردار بھی ادا کیا۔ دنیائے ادب و انشاء میں ضلالت اور تلبیس و تعوج کے بت کدوں پر وہ ہمیشہ تبرآزما رہے۔ اُنھوں نے اپنے قلم سے خیر و سلام کی روایتوں کو مزید مستحکم کرنے کا مبارک فریضہ سرانجام دیا اور وہ آیندگان کے لیے تحقیق و تنقید کی قابلِ تقلید مثالیں چھوڑ گئے۔

داؤدی صاحب کو اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اپنی عمر کے آخری بیس پچیس برسوں میں اُنھوں نے زیادہ تر عربی اور فارسی

مخطوطات پر کام کیا۔ ان کا بیشتر تصنیفی کام اُردو میں ہے، لیکن اُنھوں نے انگریزی زبان میں بھی متعدد تحقیقی مضامین سپردِ قلم فرمائے ہیں۔ اُن کی انگریزی تحریریں جہاں ان کی عمدہ تحقیق کی مظہر ہیں، وہیں تحریر و انشاء کی صحت اور خوبصورتی کا بھی اچھا نمونہ ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں داؤدی صاحب کے دو انگریزی مقالات بھی شامل کیے جا رہے ہیں، جن سے انگریزی زبان میں ان کے اسلوبِ اظہار و بیان کا کافی اندازہ ہو سکے گا۔

زیرِ نظر کتاب میں داؤدی صاحب کے بعض غیرمدون یا غیرمطبوعہ تحقیقی مقالات بھی پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان نوادرات سے ''یادنامۂ داؤدی'' کی افادیت و اہمیت مضاعف ہوگی۔ اسی طرح عربی اور فارسی کے بعض مخطوطات پر داؤدی صاحب کے تحقیقی اور تعارفی شذرات بھی شاملِ کتاب کیے جا رہے ہیں۔ ان شذرات سے داؤدی صاحب کی مخطوطہ شناسی کا اسلوب ہمارے سامنے آئے گا اور ہمیں معلوم ہوگا کہ اس فن میں داؤدی صاحب کا امتیاز و اختصاص کیا تھا۔ اس فن کے طالب علموں کے لیے بھی یہ شذرات رہنمائی کا باعث بنیں گے۔

''یادنامۂ داؤدی'' کا ایک حصہ داؤدی صاحب کے نام ان کے بعض جلیل القدر معاصرین کے مکاتیب پر مشتمل ہے۔ ان مکاتیب سے بھی ہم داؤدی صاحب کی شخصیت اور ان کے علم و فضل سے متعارف ہوتے ہیں اور ان سے ہم عصر اکابرِ علم و ادب سے داؤدی صاحب کے روابط و مراسم پر بھی مزید روشنی پڑتی ہے۔ ایسے مکاتیب کا مکمل ذخیرہ ان شاء اللہ مستقبل قریب میں مدون ہو کر کتابی صورت میں شائع ہوگا۔ گویا زیرِ نظر چند مکاتیب آئندہ صبحِ بہار کی ایک جاں فزا بشارت ہیں۔

''یادنامۂ داؤدی''، داؤدی صاحب کے علمی و ادبی کارناموں کا ایک مختصر اشاریہ ہے جو ان کی پہلی برسی (۲۶؍جنوری) کے موقع پر شائع کیا جا رہا ہے۔ ہمیں

اُمید ہے کہ یہ کتاب جہاں ایک طرف ہمیں داوٗدی صاحب کے علمی و ادبی آثار کے مزید مطالعہ و استحسان کی دعوت دے گی، وہیں مرحوم کی بہت سی غیر مطبوعہ نگارشات کی حفاظت و اشاعت کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بھی بنے گی۔

گماں مبرکہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

(۲)

جناب خلیل الرحمٰن داوٗدی کے احوال و آثار پر کام کے آغاز کا شرف اورینٹل کالج، لاہور کو حاصل ہوا۔ ۱۹۹۹ء میں یعنی داوٗدی صاحب کے حینِ حیات میں ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کی نگرانی میں رابعہ رضوی نے داوٗدی صاحب کے بارے میں ایم۔اے (اُردو) کا مقالہ مکمل کیا۔ پھر داوٗدی صاحب کی وفات کے چالیسویں کے موقع پر اورینٹل کالج ہی میں کالج کی انجمن اُردو کے زیرِ اہتمام داوٗدی صاحب کی یاد میں ایک تعزیتی اجلاس منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر عارف نوشاہی، محمد اکرام چغتائی، پروفیسر اقبال مجددی، ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر اور ڈاکٹر تحسین فراقی نے مقالات و تقاریر کی صورت میں داوٗدی صاحب کی شخصیت اور اُن کے فن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ پھر انھی مضامین و مقالات سے اورینٹل کالج، لاہور کے مجلّہ ''سخن'' کا گوشۂ خلیل الرحمٰن داوٗدی آراستہ کیا گیا۔ داوٗدی صاحب کے احوال و آثار کے تعارف اور استحسان کی ان تمام کاوشوں میں بنیادی محرک ڈاکٹر تحسین فراقی رہے ہیں اور زیرِ نظر کتاب کی ترتیب و تدوین میں بھی انھی کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ہم اس ادب پروری کے لیے ڈاکٹر صاحب کے ممنون ہیں۔

ہم ان تمام حضرات کے بھی احسان مند ہیں، جنھوں نے داؤدی صاحب کے بارے میں گراں قدر مضامین و مقالات سپردِ قلم فرمائے ہیں۔ جناب شقائق النعمان داؤدی نے مطلوبہ لوازمے کی فراہمی میں ہمیں خوش دِلانہ تعاون سے نوازا ہے۔ جناب ثاقب محمود اور جناب احسن تہامی نے کتاب کی طباعت و اشاعت کے مشکل مراحل میں ہماری مدد فرمائی ہے۔ ہم ان سب حضرات کے شکرگزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

جعفر بلوچ

۲۱/جنوری ۲۰۰۳ء

۸۔ غزالی پارک،

نزد وحدت کالونی، لاہور

شخص و عکس

رابعہ رضوی

خلیل الرحمٰن داوٗدی —— احوال و آثار

الف۔ حالاتِ حیات

۔خاندانی پس منظر:

خلیل الرحمٰن داوٗدی کے مورثِ اعلیٰ شیخ حمید الدین بن منصور خجندی بابر کے زمانے میں خجند سے ہندوستان آ کر سیکری ضلع مظفرنگر میں آباد ہو گئے تھے۔ لیکن شیخ حمید الدین کے صاحبزادے شیخ احمد نے جو کہ اپنے والد کی طرح خود بھی منصب دار تھے، شیر شاہ سوری کے عہد میں عامل مظفرنگر سے تعلقات کشیدہ ہونے کی بنا پر اپنے منصب اور چودیرائی سے مستعفی ہو کر سیکری کو خیرباد کہہ کر اپنے بیٹے مولانا داوٗد کے ساتھ لاوڑ میں سکونت اختیار کر لی۔ اس طرح شیر شاہ سوری کے زمانے میں خلیل الرحمٰن داوٗدی کا خاندان لاوڑ میں آباد چلا آ رہا ہے۔ لاوڑ اور شمس پور میں خلیل الرحمٰن داوٗدی کے بزرگوں کو شاہانِ مغلیہ کے فرامین کی رُو سے کچھ اراضی بطور وجہَ معاش ملی تھی۔ شاہانِ مغلیہ سے جو زمینیں خلیل الرحمٰن داوٗدی کے خاندان میں چلی آ رہی تھیں، وہ ملک معافی دوام (لاخراجی) کہلاتی تھیں۔ انگریزی عملداری میں بھی ان پر کوئی مال گزاری نہیں تھی، بلکہ برائے نام بہت معمولی رقم بطور ''ابواب'' وصول کی جاتی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد یو۔پی کے تمام زمینداروں کی زمینیں چھین لی گئیں جن میں متاثرین کی

زیادہ تعداد مسلمان زمینداروں کی تھی۔ اس طرح سے خلیل الرحمٰن داؤدی کا خاندان بھی ان زمینوں کی ملکیت سے محروم ہوگیا جو شاہانِ مغلیہ کے زمانے سے علی الاتصال مولانا داؤد کی اولاد کے پاس چلی آ رہی تھیں۔

خلیل الرحمٰن داؤدی کے آباء نے زمینداری چھوڑ کر طب جیسا مقدس پیشہ اختیار کیا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کے دادا کا نام محمد شفیع تھا۔ وہ قصبہ لاوڑ، ضلع میرٹھ میں اپنے جدی مکانوں میں رہتے تھے۔ وہ کسی دارالعلوم یا یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تو نہ تھے، مگر اُردو، فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ اس کے علاوہ بہت اچھے طبیب بھی تھے اور موضع چندوڑی میں کچھ عرصہ ایک سرکاری مدرسہ میں مدرس بھی رہے۔ وہ ادیب تو نہ تھے مگر طبیبِ حاذق تھے اور اس زمانے کے طبیب جملہ علوم متداولہ میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کے دادا کی شادی منشی عنایت اللہ کی بیٹی سے ہوئی۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کی دادی قصبہ سراوہ ضلع میرٹھ کے رئیس اعظم منشی عنایت اللہ کی صاحبزادی تھیں۔ منشی عنایت اللہ کے والد فیض الحسن صاحب تھے، جو آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کے امرائے منصب دار اور مقربین میں سے تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق وہ وزیر تھے، انگریزوں سے نبرد آزمائی میں اُنھوں نے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ انگریز کہتے تھے کہ اگر ایک فیض الحسن اور ہوتا تو انگریز دو آبے (گنگا، جمنا کا درمیانی علاقہ دو آبہ کہلاتا ہے) میں اپنے قدم نہیں جما سکتا تھا۔ بہرحال خاندانی روایات کے مطابق فیض الحسن صاحب کو پھانسی کی سزا ہوگئی تھی، لیکن اس زمانے میں سراوہ میں ایک بزرگ درویش حیدرشاہ رہتے تھے، فیض الحسن صاحب کی والدہ نے ان سے فیض الحسن کی پھانسی کی سزا ٹالنے کے لیے دُعا کرنے کی درخواست کی، جواباً حیدرشاہ صاحب نے کہا کہ فیض الحسن تو بچ جائے گا، لیکن جس دن، تاریخ اور وقت پر اسے پھانسی لگے گی، اس وقت میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی۔ چنانچہ

ایسا ہی ہوا۔ فیض الحسن صاحب کی تو جان بخشی گئی، لیکن حیدر شاہ دنیا سے اسی وقت رخصت ہو گئے۔ حیدر شاہ کا مزار سراوہ میں مرجعِ خلائق ہے، جہاں سالانہ عرس ہوتا ہے۔ فیض الحسن جو کہ مغلیہ حکمرانوں کے منصب دار تھے، اتنے بڑے جاگیردار تھے کہ سراوہ کے اطراف میں چاروں طرف انھیں کی زمینیں تھیں جو وراثت میں ان کی اولاد کو ملیں اور بعد میں بوجوہ ختم ہو گئیں۔ فیض الحسن کے والد حاجی قدرت اللہ بلیغ بہت بڑے عالم اور شاعر تھے۔ وہ میر و سودا کے معاصر تھے۔ اُنھوں نے ٦ دیوانِ فارسی اور ایک دیوان اُردو یادگار چھوڑا ہے جو اس وقت خلیل الرحمٰن داوٗدی کی ملکیت ہے۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی کی دادی فیض الحسن کے لڑکے عنایت اللہ کی لڑکی تھیں۔ اس زمانے میں تعلیمِ نسواں کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ گھر میں قرآن کی تعلیم پائی اور روایتی و رسمی طور پر اُردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی خلیل الرحمٰن داوٗدی کے دادا محمد شفیع سے ایک ہی اولاد تھی، یعنی خلیل الرحمٰن داوٗدی کے والد۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی کے والد کا نام عطاء الرحمٰن عرف محمد عطاء السمیع تھا، لیکن وہ محمد عطاء السمیع کے نام ہی سے مشہور ہوئے۔ اس زمانے میں لاوڑ میں صرف پرائمری سکول تھا۔ چنانچہ خلیل الرحمٰن داوٗدی کے والد عطاء الرحمٰن نے بھی پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ البتہ فارسی اور طب دوسرے اساتذہ سے پڑھیں، وہ طبیب تھے لیکن آج کل کے طبیبوں کی طرح نہیں تھے، بلکہ وہ نبض دیکھ کر نسخے لکھتے تھے، مریض سے کوئی فیس نہیں لیتے تھے۔ مریض ان سے نسخہ لکھا کر دوائیں بازار میں عطار کی دکان سے خریدتا تھا۔ وہ مریضوں کو دیکھنے بھی اپنی سواری ہی میں جایا کرتے تھے۔ اُنھوں نے طب کا پیشہ اپنے والد کی طرح فلاحِ عامہ کے لیے اختیار کیا تھا۔ معاش سے اس کا تعلق نہیں تھا۔

خلیل الرحمٰن داوٗدی کے والد بڑی پروقار اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے۔ نہایت سرخ و سفید دراز قامت اور رعب دار آدمی تھے، ان کا کوئی بھائی تھا نہ بہن، تنہا

تھے۔ ان کی شادی فاطمہ نامی خاتون سے ہوئی۔ یہ قصبہ بھٹیانہ تحصیل پالوڑ ضلع میرٹھ کے قاضی محمد ابراہیم کی صاحبزادی تھیں۔ یہ قاضیوں کا پشت ہا پشت سے نامور خاندان چلا آ رہا تھا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کی والدہ کے تین بھائی تھے، منظور الحق، احسان الحق اور رحمٰن الحق۔ شاہانِ مغلیہ کے درباروں سے فرامینِ شاہی کے ذریعہ قضاۃ کو بطورِ وجہ مددِ معاش زمینیں ملی تھیں۔ چنانچہ خلیل الرحمٰن داؤدی کی والدہ کے گھر میں بھی شاہانِ مغلیہ کی عطا کی ہوئی ملک معافی دوام زمینیں چلی آ رہی تھیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کی والدہ کی ان کے والد سے پہلے کوئی رشتہ داری نہ تھی، نہایت باوقار خاتون تھیں۔ ایک خوشحال خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُنھوں نے خلیل الرحمٰن داؤدی کے والد کی بہت خدمت کی اور مکمل طور پر گھریلو زندگی گزاری، ان کی عطا الرحمٰن یعنی خلیل الرحمٰن داؤدی کے والد سے دو اولادیں ہوئیں۔ ایک خود خلیل الرحمٰن داؤدی، دوسری ان کی چھوٹی بہن اُمِ حبیبہ خاتون۔ امِ حبیبہ کی عمر جب ۳ سال تھی تو خلیل الرحمٰن داؤدی کی والدہ کی وفات ہوگئی۔ اُمِ حبیبہ بالکل اپنے والد والا رنگ روپ اور وجاہت و رعنائی رکھتی تھیں، بالکل شہزادی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ خلیل الرحمٰن داؤدی سے چار سال چھوٹی تھیں۔ ان کی تمام تعلیم گھریلو تھی یعنی کسی سکول کالج کی تعلیم یافتہ نہ تھیں، گھر پر ہی قرآن کریم اور اُردو کی مروجہ تعلیم پائی تھی۔ ان کی شادی حامد برنی سے ہوئی، جو دہلی میونسپل کارپوریشن میں چیف ائسنگ انسپکٹر تھے، یہ ابھی حیات ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد دہلی میں ہی رہتے ہیں۔ تقسیم کے بعد خلیل الرحمٰن داؤدی تو پاکستان آ گئے، لیکن اُمِ حبیبہ ہندوستان ہی میں رہ گئیں۔ ان کا انتقال ۱۹۹۵ء میں دہلی (بھارت) میں ہوا۔ اُنھوں نے پانچ بچے یادگار چھوڑے ہیں، جن میں دو بیٹے شعیب حامد برنی، سہیل حامد برنی اور تین لڑکیاں جن میں صبیحہ، شاہینہ اور سعدیہ شامل ہیں۔

شجرۂ نسب:

خلیل الرحمٰن داؤدی کے مورثِ اعلیٰ مولانائے داؤد ہیں۔ ان کا شجرۂ نسب شیخ احمد ابن شیخ حمید الدین خجندی سے ہوتا ہوا، حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ مولانا داؤد کے دو لڑکے تھے، مولانائے یوسف اور مولانائے بازید۔ اس کے بعد مولانائے بازید سے نسل چلائی گئی ہے جو اشرف علی بن فضل علی بن نور علی تک مسلسل موجود ہے۔
خلیل الرحمٰن داؤدی نے اپنے مورثِ اعلیٰ مولانائے داؤد کی نسبت سے ہی اپنے نام کے ساتھ داؤدی لگایا ہے۔ مولانائے داؤد تک شجرۂ نسب یہ ہے: خلیل الرحمٰن ابن محمد عطاء السمیع ابن محمد شفیع ابن ہدایت علی (برادر اشرف علی مرتب شجرہ) ابن فضل علی ابن نور علی ابن رحمت اللہ ابن اللہ رکھا ابن شیخ سعد اللہ ابن امان اللہ ابن بایزید ابن مولانائے داؤد ابن شیخ احمد ابن شیخ حمید الدین خوزندی از اولاد محمد بن ابی ابوبکر صدیق خلیفہ اوّل۔

تاریخ ولادت:

خلیل الرحمٰن داؤدی کی تاریخ پیدائش ۲؍ مارچ ۱۹۲۳ء ہے۔ تعلیمی دستاویزات پر اور تمام اسناد پر خلیل الرحمٰن داؤدی کی یہی تاریخ پیدائش درج ہے۔ تحقیقی اعتبار سے خلیل الرحمٰن داؤدی کی تاریخِ ولادت میں کہیں بھی کوئی اختلاف موجود نہیں ہے۔ خود اُنھوں نے بھی راقمہ کے ساتھ ایک انٹرویو میں اس تاریخ پیدائش کو تسلیم کیا ہے۔

جائے پیدائش:

خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب قصبہ الاوڑ، ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ قصبہ الاوڑ ان کا آبائی قصبہ ہے اور شیر شاہ سوری کے زمانے سے ان کا خاندان الاوڑ میں آباد چلا آ رہا ہے۔

پرورش:

خلیل الرحمٰن داؤدی کی والدہ کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب داؤدی صاحب کی عمر صرف ۶ سال اور ان کی ہمشیرہ کی عمر ۴ سال تھی۔ خلیل الرحمٰن داؤدی اور ان کی ہمشیرہ کی پرورش ان کے والد کی تائی امۃ العزیز صاحبہ نے کی۔ امۃ العزیز صاحبہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی نواسی تھیں اور پھلت کی رہنے والی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اکٹھے اور مل جل کر رہنے کا رواج تھا، چنانچہ اسی گھر میں خلیل الرحمٰن داؤدی کے والد کے تایا زاد بھائی ظہور احمد صاحب اور منظور احمد صاحب کی بیویاں بھی موجود تھیں۔ امت العزیز صاحبہ نے خلیل الرحمٰن داؤدی اور ان کی ہمشیرہ کی ماں کی طرح محبت و شفقت سے پرورش کی۔

نام:

خلیل الرحمٰن داؤدی کا اصلی نام خلیل الرحمٰن ہے۔ یہ نام ان کے والد نے رکھا تھا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے پاکستان آنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں خلیل الرحمٰن کے ساتھ داؤدی کا اضافہ کیا۔ لیکن تعلیمی اسناد میں ان کا نام خلیل الرحمٰن ہی درج ہے، اپنے نام کے ساتھ داؤدی کے اضافے کے متعلق کہتے ہیں:

> ”میرے جدِ امجد اور مورثِ اعلیٰ مولانا ئے داؤد تھے۔
> ان کی نسبت سے میں نے داؤدی کا اضافہ کیا ہے۔“(۱)

چنانچہ ۱۹۵۲ء سے تا حال علمی و ادبی دنیا میں خلیل الرحمٰن داؤدی کے نام سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن ۱۹۵۲ء میں اپنے نام کے ساتھ داؤدی کا جو اضافہ کیا تھا، وہ اب ان کی پہچان بن چکا ہے اور اکثر و بیشتر احباب اُنھیں داؤدی صاحب کے نام ہی سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔

بچپن:

خلیل الرحمٰن داؤدی بچپن میں کھیل کود سے زیادہ پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتے تھے اور ان کی شہرت ایک غیر معمولی ذہین لڑکے کی تھی۔ بچپن میں جس قصبہ میں رہتے تھے، وہاں بجلی نہیں تھی، وہ لالٹینوں کا دور تھا۔ لیکن اپنی علم دوستی کی بدولت بچپن ہی میں داستانِ امیر حمزہ، طلسم ہوشربا اور بوستانِ خیال کی جلدیں چاند کی روشنی میں پڑھیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی چونکہ ایک ایسے خاندان کے فرد تھے، جو پشت ہا پشت سے علوم کا گہوارہ تھا، اس لیے اُنھیں ایک خاصا بڑا کتاب خانہ گھر ہی میں مل گیا۔ اُنھوں نے بچپن ہی میں بغیر کسی استاد کی مدد کے فارسی اور عربی میں معقول شد بد حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں جب خلیل الرحمٰن داؤدی کی عمر صرف ۱۰ سال تھی، اُنھوں نے ایک کتاب ''جواہراتِ طب فی سوادِ طب'' تصنیف کر ڈالی، لیکن افسوس کہ ان کی یہ تصنیف پاکستان آتے وقت ہندوستان میں رہ گئی اور ضائع ہوگئی۔ اسی طرح بچپن میں ہی انھیں شاعری کا شوق بھی ہوا، لیکن وہ جلد ہی اس لیے ختم ہو گیا کہ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ غالب یا اقبال نہیں بن سکتے، پھر اس میں وقت کے ضیاع کا فائدہ؟ بچپن میں خلیل الرحمٰن داؤدی نے جس صاحب کی صحبت سے بہت فائدہ اُٹھایا، وہ مولوی مظہر الحق تھے۔ یہ ستر سالہ بزرگ میرٹھ میں محلہ شاہ تھن میں رہتے تھے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی ان سے فیض و اکتساب کرنے کے لیے اپنا بستر ہی ان کے گھر لے گئے تھے۔ مولوی مظہر الحق شاعر تھے اور تسخیر تخلص کرتے تھے۔ میرٹھ کے ممتاز اور نامور شاعر میر مرتضیٰ بیان و یزدانی کے شاگرد تھے۔ بیان میرٹھی کا ایک رسالہ ''لسان الملک'' میرٹھ سے انیسویں صدی کے آخر ربع میں نکلتا تھا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے مولوی مظہر الحق تسخیر میرٹھی کا کلام ۱۸۸۳ء کے ''لسان الملک'' کے شماروں میں پڑھا اور ان کی صحبت اختیار کی اور

دراصل مولوی مظہر الحق کی صحبت کے اثر سے ہی شعر کہنا شروع کیے، خلیل الرحمٰن داوٴدی بتاتے ہیں کہ:

''اُن کا حال یہ تھا کہ شب میں سوتے سوتے اُٹھ جاتے تھے اور مجھے اُٹھا کر کہتے کہ مصرعۂ اولیٰ ہو گیا ہے، تم مصرعۂ ثانی لگا کر شعر پورا کر دو۔ ایک بار اُنھوں نے سوتے سے مجھے جگا کر کہا کہ اس مصرع پر گرہ لگاوٴ، مصرع یہ تھا: ''تڑپ اُٹھتا ہے دل پہلو میں جس دم یاد آتا ہے'' میں نے مصرعہ ثانی لگا کر شعر پورا کر دیا، میرا مصرعۂ ثانی یہ تھا: ''نمودِ صبح سے پہلے کسی کا روٹھ کر جانا'' اس کے ساتھ میں نے یہ شعر بھی کہا تھا:

نیازِ عشق و نازِ حسن میں دونوں برابر ہیں
کسی کو باخبر جانا، کسی کو بے خبر جانا''(۲)

داوٴدی صاحب فی البدیہہ بھی کہہ لیتے تھے، مثلاً ان کا بچپن میں ایک دوست ریاض اقبال تھا۔ اس نے ایک مرتبہ برہم ہو کر یہ مشہور شعر پڑھا:

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو خلیل الرحمٰن داوٴدی نے فوراً بداہتہً اور ارتجالاً یہ کہا:

نیا آشیانہ بنا لینے والے
فلک پر ابھی بجلیاں اور بھی ہیں

اس کے علاوہ اُنھوں نے نوحہ کے چند اشعار بھی لکھے۔ اگرچہ خلیل الرحمٰن داوٴدی سنت والجماعت عقاید رکھتے تھے اور کٹر سنی صدیقی گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ لیکن اس زمانے میں بعض علاقوں میں سنی حضرات بھی تعزیہ نکالتے تھے، لہٰذا اُنھوں نے بھی محرم

میں یہ شعر کہے اور تعزیہ کے ساتھ چلتے ہوئے پڑھے تھے:

زینت جنگ اُٹھ گئی، تاریک دنیا ہو گئی

دوسرا مصرعہ اب انھیں یاد نہیں رہا۔ اسی زمین میں دو شعر یہ بھی تھے:

من بکیٰ ابکیٰ تباکیٰ ہے کلیدِ مغفرت
آنکھ سے قطرہ گرا، گرتے ہی گوہر ہو گیا
صرصرِ ظلم و ستم سے اے خلیل غم زدہ
گل چراغِ ہستیؑ آلِ پیمبرؐ ہو گیا

بہر حال شاعری کا یہ سلسلہ زیادہ دیر چل نہ سکا، دراصل وہ بچپن میں غالب اور اقبال سے مرعوب ہی نہ تھے، بلکہ کلامِ غالب اور کلامِ اقبال کے حافظ تھے، کچھ ہی عرصے بعد انھیں احساس ہوا کہ ان دونوں کے بعد شاعری میں طبع آزمائی کرنا عبث ہے۔ ان کے خیال میں اس میدان میں ہاتھ پاؤں مارنا، جس میں انفرادیت قائم نہ ہو سکے، وقت کا ضیاع ہے۔

بچپن میں بچے عام طور پر کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی بھی اسکول کے زمانے میں کچھ کھیلوں کا شوق رکھتے تھے، مثلاً اپنے اسکول کے زمانے میں کبڈی، رسہ کشی، ہاکی، کرکٹ، دوڑ، غرض کئی کھیلوں میں حصہ لیتے تھے۔ لیکن پڑھنے لکھنے سے دلچسپی زیادہ تھی اور سب سے زیادہ شوق Debates کا تھا اور زمانۂ طالبعلمی میں بہت ذوق و شوق سے تقاریر میں حصہ لیتے تھے۔ پہلے کسی بھی موضوع پر اس کے حق میں دلائل دیتے اور پھر اس کے بعد اس کے خلاف بولتے، دونوں صورتوں میں دلائل کا ڈھیر لگا کر رکھ دیتے۔ داؤدی صاحب نے بتایا کہ یہ منطقی مزاج ان کے استاد مولوی مظہر الحق کی صحبت کا اثر تھا۔ غرض خلیل الرحمٰن داؤدی کا بچپن ایک ہونہار شاگرد، صحت مند کھلاڑی اور پرجوش Debater کے طور پر گزرا۔

شادی:

داؤدی صاحب کی شادی ۲۵ر اپریل ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ اُن کی بیوی کا نام بلقیس جہاں آراء تھا، اور وہ اُن سے آٹھ سال چھوٹی تھیں۔ قیاساً ان کی پیدائش ۱۹۳۱ء کی ہے۔ یہ شادی خلیل الرحمٰن داؤدی کی پسند کی شادی تھی، اپنی اس پسند کی شادی کے بارے میں خلیل الرحمٰن داؤدی کا اپنا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، لکھتے ہیں:

> ''میں اپنی بیوی کے بھائی محمد فضل کریم صاحب کو پہلے سے جانتا تھا۔ میں جس زمانے میں میرٹھ میں تعلیم پاتا تھا، اسی زمانے میں محمد فضل کریم صاحب سہارنپور سے تعلیم کے لیے میرٹھ آئے اور شہر میں اپنے والد کے دوست مولانا مظہر الحق صاحب ساکن محلہ شاہ تھن کے ہاں قیام کیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں میرا تعلق بھی مولانا مظہر الحق صاحب سے تھا۔ میں ان سے عربی پڑھتا تھا۔ سہارنپور کلکٹریٹ میں فضل کریم کے والد منشی نور احمد صاحب اور مولانا مظہر الحق ہم کار رہے تھے۔ اسی تعلق کی بنا پر منشی نور احمد صاحب نے اپنے بیٹے کو اپنے دوست مولانا مظہر الحق کی خدمت میں میرٹھ بغرضِ تعلیم بھیج دیا تھا۔ اس طرح میری فضل کریم صاحب سے دوستی ہوگئی۔ یہ ۴۲-۱۹۴۱ء کی بات ہے ستمبر ۱۹۴۸ء کو میں پاکستان آ گیا اور لاہور میں قیام کیا۔ اس زمانے میں میرے دوست فضل کریم صاحب بھی لاہور ہی میں تھے۔ کچھ عرصہ بعد، میں ان کے گھر واقع کرشن نگر میں مقیم ہوگیا۔ فضل کریم صاحب اس زمانے میں روزنامہ زمیندار لاہور کے

شعبہ اشتہارات کے منیجر تھے ان کی ہمشیرہ بلقیس جہاں آراء کی شادی پاکستان بننے سے قبل سہارنپور میں ایک شخص عبداللہ کے ساتھ ہوگئی تھی لیکن نباہ نہ ہوسکا اور عبداللہ نے دوسری شادی کرکے اسے بھائی کے گھر لاہور بھیج دیا تھا۔ میں نے اپنے دوست فضل کریم کی ہمشیرہ کے لیے خود کو پیش کردیا۔ اس طرح ۲۵ر اپریل ۱۹۵۲ء کو ہمارا نکاح ہوگیا۔"(۳)

خلیل الرحمٰن داؤدی کی زوجہ محترمہ بلقیس جہاں آراء نے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی تھی اس کے علاوہ اردو کی رسمی تعلیم بھی حاصل کرچکی تھیں۔ وہ کسی کالج یا یونیورسٹی کی فارغ التحصیل نہ تھیں۔ ایک مکمل گھریلو خاتون تھیں۔ ۲۱ر ستمبر ۱۹۹۱ء کو وہ فوت ہوگئیں۔

اولاد:

خلیل الرحمٰن داؤدی کے تین بچے ہیں جن میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں شامل ہیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کی سب سے بڑی بیٹی گل داؤدی ہیں جن کی ولادت ۵ر مئی ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ ایم اے انگریزی کے بعد ۱۹۸۱ء میں مرکزی اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلہ کے امتحان (.C.S.S) میں کامیاب ہوئیں اور کسٹم گروپ میں تعینات رہیں، اس کے بعد لاہور میں اسسٹنٹ کلکٹر کسٹم (گریڈ ۱۷، ۱۸) اور ڈپٹی کلکٹر کسٹم (گریڈ ۱۹) رہیں۔ اور پھر وفاقی محتسب کے سیکرٹریٹ واقع لاہور میں ڈائریکٹر رہیں اب ۲ سال سے وزارتِ اقتصادی امور حکومتِ پاکستان اسلام آباد میں ہیں۔

گل داؤدی کے بعد خلیل الرحمٰن داؤدی کے بیٹے شقائق النعمان داؤدی ہیں جو ۲۸ر اگست ۱۹۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ ایم۔اے معاشیات کیا۔ ۸ر نومبر ۱۹۹۱ء کو ان کی

شادی نیازی خاندان کی ایک لڑکی فرح راحیلہ کے ساتھ ہوئی جن سے ان کے تین فرزند حقائق الایقان داؤدی (ولادت ۱۵؍نومبر ۱۹۹۲ء)، عدنان نعمان داؤدی (ولادت ۱۵؍جنوری ۱۹۹۵ء) اور اشجع الشبان (ولادت ۴ اپریل ۱۹۹۸ء) ہیں۔

شمائلہ داؤدی خلیل الرحمٰن داؤدی کی سب سے چھوٹی بیٹی ہیں۔ ان کی ولادت ۲۵؍نومبر ۱۹۶۵ء کو ہوئی۔ بی۔اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اس کے بعد ۱۲؍جون ۱۹۸۲ء میں ان کی شادی میجر زاہد مبشر سے ہوگئی۔ اب ان کے شوہر فوج میں بریگیڈیر ہیں اور گلگت میں بحثیت اسٹیشن کمانڈر متعین ہیں۔ شمائلہ داؤدی کے تین بچے ہیں، جن میں دولڑکیاں عائشہ، زینب اور ایک لڑکا سعد شامل ہیں۔

رہائش:

خلیل الرحمٰن داؤدی تقریباً ۴۰ سال ٹیگور پارک نکلسن روڈ، لاہور میں اقامت گزیں رہے۔ ٹیگور پارک لاہور میں ان کا اپنا ذاتی مکان تھا وہ جائیدادِ متروکہ تھا جسے انھوں نے پوری قیمت ادا کر کے اپنے نام منتقل کرالیا تھا۔ ۱۵ فروری ۱۹۹۱ء کو خلیل الرحمٰن داؤدی نے ٹیگور پارک سے مقدس پارک گلشن راوی لاہور میں نقل مکانی کر لی۔ آج کل ان کے اکلوتے چشم و چراغ شقائق النعمان داؤدی اور ان کے بیوی بچے اسی مکان میں سکونت پذیر ہیں۔

تعلیم:

خلیل الرحمٰن داؤدی کی ابتدائی تعلیم ایک مذہبی مکتب سے شروع ہوئی جو ایک مسجد سے متعلق تھا۔ اس مکتب میں صبح کے وقت قرآن پڑھایا جاتا تھا اور بعد دوپہر اردو۔ یہ مکتب صرف درجہ دوم تک تھا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے اس مکتب میں قرآن کریم مکمل کیا اور درجہ دوم پاس کیا۔ اس کے بعد پرائمری سکول میں چلے گئے۔ اس زمانے

میں لاوڑ میں صرف پرائمری سکول تھا اور وہ جماعت چہارم تک تعلیم دیتے تھے۔ چنانچہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے جماعت سوم و چہارم پرائمری سکول لاوڑ سے پاس کیے۔ مزید تعلیم کے لیے انھیں لاوڑ سے باہر جانا پڑا۔ چنانچہ پرائمری سکول سے فارغ ہوکر وہ اپنے چچا ظہور احمد صاحب مرحوم کے پاس مرادنگر ضلع میرٹھ چلے گئے جہاں مڈل سکول تھا۔ وہاں سے انھوں نے اردو مڈل اور ہندی مڈل کے امتحانات پاس کیے۔ یو۔پی (صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ) میں مڈل اسکولوں میں پانچویں، چھٹی ساتویں جماعتیں ہوتی تھیں۔ ساتویں جماعت کا امتحان ورنا کیولر فائنل امتحان کہلاتا تھا۔ اسی کو مڈل کا امتحان کہا جاتا تھا۔ اس وقت ورنا کیولر فائنل امتحان (Departmental Examinations Unitedprovinces) کے رجسٹرار کا دفتر واقع الہ آباد لیتا تھا۔ جو ڈیپارٹمنٹ آف پبلک انسٹرکشن یو۔پی (سررشتہ تعلیم، صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ) کا ایک ذیلی ادارہ تھا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے ۱۹۳۶ میں مڈل سکول مرادنگر کی پانچویں جماعت میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۹ء میں ساتویں جماعت کا ورنا کیولر فائنل امتحان (مڈل کا امتحان) بزبانِ اردو فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس زمانے میں اگر کسی طالبعلم کے کسی مضمون میں ۷۵ فیصد سے زیادہ نمبر آتے تھے تو اس طالبعلم کو اس مضمون میں ایک اعزاز دیا جاتا تھا جسے ڈسٹنکشن (Distinction) کہا جاتا تھا۔ چنانچہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے ورنا کیولر فائنل (اُردو مڈل) امتحان ۱۹۳۹ء میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ ریاضی میں ڈسٹنکشن کے ساتھ پاس کیا، یعنی ریاضی میں ۷۵ فیصد سے زائد نمبر حاصل کیے۔ اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں خلیل الرحمٰن داؤدی نے ورنا کیولر فائنل امتحان بزبانِ ہندی (ہندی مڈل) سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس طرح اُنھوں نے اپنے چار سالہ قیامِ مرادنگر میں اُردو مڈل اور ہندی مڈل کے امتحانات پاس کیے۔ مرادنگر میں صرف مڈل اسکول تھا جس میں صرف ساتویں جماعت تک تعلیم دی جاتی

تھی، اس لیے اُنھیں مزید تعلیم کے لیے مرادنگر سے میرٹھ منتقل ہونا پڑا۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی اپنے چچا ظہور احمد صاحب کے پاس مرادنگر میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک تقریباً ۴ سال کا عرصہ رہے۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی کے چچا منصرم مویشی خانہ تھے، یہ ڈسٹرکٹ بورڈ میرٹھ کی ملازمت تھی۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی کے چچا ظہور احمد ان کے والد کے تایا زاد بھائی تھے۔ اُنھوں نے خلیل الرحمٰن داوٗدی کو نہایت محبت و شفقت سے اپنے پاس رکھا اور انھیں گھر سے دوری کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ اس کے بعد داوٗدی صاحب آٹھویں کلاس میں داخلہ کے لیے ۱۹۴۰ء میں فیض عام انٹرمیڈیٹ کالج میرٹھ کا رُخ کیا۔ فیض عام میرٹھ سے اُنہوں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۳ء تک آٹھویں، نویں اور دسویں جماعتیں پاس کیں۔ ہر جماعت میں دو سیکشن اے (A) اور بی (B) ہوا کرتے تھے۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی آٹھویں سے دسویں تک تینوں سال بی سیکشن میں رہے۔ ان کلاسوں کے نتائج کارڈ کے مطابق اُنہوں نے کلاس (VIII-B) کا امتحان رول نمبر 60 سے دیا اور آٹھویں جماعت کے دونوں سیکشنوں A اور B میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی اور ریاضی میں 100 میں سے 100 نمبر حاصل کیے۔ اسی طرح کلاس (IX-B) کے امتحان میں بھی خلیل الرحمٰن داوٗدی نے دونوں سیکشنوں A اور B میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ جماعت نہم کے امتحان میں اُنہوں نے ریاضی میں 100 میں سے 94 نمبر لیے۔ اسی طرح دسویں جماعت کے (First Terminal Examination) میں بھی فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ بالآخر ۱۹۴۳ء میں میٹرک کا امتحان بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن یو۔پی الٰہ آباد سے فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور دو مضامین اُردو اور ریاضی میں ۷۵ فیصد سے زائد نمبر حاصل کر کے ان مضامین میں ڈسٹنکشن (Distinction) کا اعزاز لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امتحانات بہت سخت ہوتے تھے اور کسی مضمون میں ۷۵ فیصد سے زائد نمبر لینا بہت ہی مشکل ہوتا تھا۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی

ہونہار طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ فیضِ عام انٹرمیڈیٹ کالج کی یونین کے وائس پریذیڈنٹ بھی رہے۔ فیضِ عام انٹرمیڈیٹ کالج میرٹھ کے سبھی اساتذہ نہایت شفیق اور اصحابِ علم و فضل تھے۔ بالخصوص اُردو کے پروفیسر غیور احمد رزمی صاحب سے خلیل الرحمٰن داؤدی سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور ان سے کسبِ فیض کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ پروفیسر غیور رزمی صاحب شاعر تھے اور اعلیٰ درجہ کی شاعری کرتے تھے۔ لیکن افسوس کہ ناقدریٔ روزگار کا شکار رہے۔ اب بھی خلیل الرحمٰن داؤدی کی زبان پر اُن کے چند اشعار رواں ہیں، ان میں سے دو یہ ہیں:

ہوا کرتی ہیں دانائی سے بھی گمراہیاں پیدا!
تمھیں تعلیم سے الحاد کا سودا نہ ہو جائے

اذانوں کی صدائیں قہقہوں میں ڈوب جاتی ہیں
تمھاری یہ ہنسی فریاد کا غوغا نہ ہو جائے

خلیل الرحمٰن داؤدی، زمانۂ طالب علمی میں ریاضی میں اس حد تک غیر معمولی استعداد رکھتے تھے کہ ان سے ایک دو کلاس آگے کے طلباء بھی ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے میٹرک کے بعد ریاضی رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور ۱۹۴۳ء میں میرٹھ کالج میں انٹرمیڈیٹ سائنس میں داخلہ لے لیا۔ میرٹھ کالج میں ان کے مضامین فزکس، کیمسٹری اور ریاضی تھے۔ لیکن خلیل الرحمٰن داؤدی ۱۹۴۵ء کے انٹرمیڈیٹ سائنس کے امتحان میں شریک نہ ہو سکے کیونکہ ان کی فزکس کی حاضریاں کم تھیں، اسی وجہ سے ان کا ایک سال ضائع ہو گیا اور اُنھیں یہ کالج چھوڑ دینا پڑا۔ چنانچہ اُنھوں نے ۱۹۴۵ء میں میرٹھ کالج چھوڑ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایف۔ایس۔سی سیکنڈ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح ۱۹۴۶ء میں ایف۔ایس۔سی کا امتحان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پاس کیا اور سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ اسی طرح ۱۹۴۸ء میں بی۔ایس۔سی کا امتحان

سیکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے آئے۔

خلیل الرحمٰن داوٗدی جماعت اوّل سے بی۔ایس۔سی تک باقاعدہ طالبعلم کی حیثیت سے اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے رہے، لیکن اسی دوران میں پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے اُنھوں نے علومِ شرقیہ کے امتحانات بھی پاس کیے۔ ڈیپارٹمنٹ آف پبلک انسٹرکشن یو۔پی (سررشتۂ تعلیم، صوبہ جات متحدہ آگرہ واودھ) کے ذیلی ادارے عربک اینڈ پرشین ایگزامینیشنز واقع الٰہ آباد کا فارسی امتحان منشی ۱۹۴۲ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کے بعد پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے ہی پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۴۵ء میں منشی کا امتحان پاس کیا، لیکن حالتِ علالت میں امتحان دینے کی وجہ سے صرف ۳۲۶ نمبر حاصل کر سکے، یعنی ۴ نمبروں سے سیکنڈ ڈویژن رہ گئی۔

علی گڑھ میں تعلیمی و سیاسی سرگرمیاں:

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی میں خلیل الرحمٰن داوٗدی کی تعلیم کا زمانہ وہی ہے جو تحریکِ پاکستان کا ہے۔ چنانچہ خلیل الرحمٰن داوٗدی بھی اپنے علیگ طلباء کے ساتھ پاکستان کی تشکیل میں عملاً شریکِ جدوجہد رہے۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موسم گرما کی تعطیلات کے بعد ۱۹۴۵ء میں سیکنڈ ایئر (ایف۔ایس۔سی سالِ دوم) میں داخلہ لے لیا جب تحریکِ پاکستان کا شباب تھا اور مسلمانانِ ہند اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے، قائداعظم کے خیالات دوقومی نظریہ پر مبنی تھے، یعنی ہندوستان میں دو قومیں رہتی ہیں، ہندو اور مسلمان۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ آزادیٔ ہند اس صورت سے عمل میں لائی جائے کہ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کے نام سے مسلمانوں کو دے دیے جائیں، لیکن اس کے برعکس جو مسلمان مسلم لیگ کے بجائے انڈین نیشنل

کانگریس، جمعیۃ العلمائے ہند، مجلسِ احرار، خاکسار وغیرہ دوسری جماعتوں میں شامل تھے، وہ قائداعظم کے مطالبۂ پاکستان کی نفی کرتے ہوئے اس پر اصرار کر رہے تھے کہ صرف مسلم لیگ میں شامل مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان بنے جبکہ ہم بھی ہندوستانی مسلمان ہیں جو پاکستان نہیں چاہتے بلکہ ہندوؤں کے ساتھ جمہوریہ ہند میں رہنا چاہتے ہیں، یعنی وہ تقسیمِ ہند اور پاکستان کے مخالف تھے۔ قائداعظم کو یہ ثابت کرنا تھا کہ پورے ہندوستان کے مسلمان تقسیمِ ہند کے نتیجہ میں پاکستان چاہتے ہیں۔ قائداعظم کو اپنے ثبوت کے لیے موقع ہاتھ آ گیا۔ ۱۹۴۶ء میں سینٹرل اسمبلی کے انتخابات آ گئے، جس میں مسلمانوں کی ۳۰ سیٹیں تھیں۔ انتخابات جداگانہ ہوئے تھے۔ ۳۰ سیٹوں میں سے بیشتر اقلیتی صوبوں میں تھیں، قائداعظم نے پوری ۳۰ سیٹوں پر مسلم لیگ کے امیدوار کھڑے کیے اور ان کے مقابلے پر دوسری جماعتوں کے مسلمان امیدوار آئے۔ مسلم لیگ امیدوار کا مقابلہ دوسری جماعتوں نے متحد ہو کر کیا۔ لیکن مسلم لیگ تیس کی تیس سیٹیں جیت گئی۔

خلیل الرحمٰن داوٗدی اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تحریکِ پاکستان میں دیگر طلباء کے ساتھ سرگرمِ عمل رہے۔ مسلم یونیورسٹی کی مسلم لیگ کے سربراہ منظرِ عالم تھے، جو ایک بارعب شخصیت کے مالک تھے اور ان کی مونچھوں کے پیشِ نظر طلباء اُن کے بارے میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

مونچھوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے منظر نشاں ہمارا

علی گڑھ کے طلباء کی پیش رفت سے علی گڑھ کے علاقے سے صوبائی اسمبلی میں بشیر صاحب مسلم لیگ کے امیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوئے اور اے۔ بی۔ اے حلیم صاحب مرکزی اسمبلی کے لیے منتخب ہو گئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ

کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان مرکزی اسمبلی کے لیے میرٹھ ڈویژن سے امیدوار تھے۔ ان کے مقابلے میں مولانا طفیل احمد منگلوری کانگریسی کے صاحبزادے محمد احمد کاظمی تھے جو الٰہ آباد میں وکالت کرتے تھے، وہ پہلے بھی اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے اور اسمبلی میں خلع بل پیش کرنے کی شہرت رکھتے تھے۔ کاظمی صاحب کٹر کانگریسی تھے، جن کی حمایت کے لیے پورا دارالعلوم دیوبند باہر نکل آیا تھا۔ میرٹھ ڈویژن کانگریسیوں اور جمعیۃ العلمائے ہند کے اکابر کا گڑھ تھا۔ مقابلہ بہت سخت تھا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی چونکہ لاوڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے اور یہ ان کا اپنا علاقہ تھا، اس لیے وہ بھی علی گڑھ سے اپنے علاقے میں آ گئے تھے اور اس وقت تک واپس علیگڑھ نہ گئے جب تک نواب زادہ صاحب کی جیت کا اعلان نہ ہو گیا۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے تحریکِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خلیل الرحمٰن داؤدی بھی بطور طالب علم ان سیاسی سرگرمیوں میں شامل رہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی ان سیاسی سرگرمیوں کے متعلق بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین ہمیشہ سینٹرل اسمبلی کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں اُنھوں نے قائداعظم سے کہا کہ پورے ہندوستان میں جو حلقہ آپ کے نزدیک کمزور ہو، وہ مجھے دے دیا جائے، کیونکہ میرے شاگرد ہر جگہ موجود ہیں۔ اس طرح پورے ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان حاصل کرنے کی جنگ ہندوؤں اور انگریزوں کے ساتھ لڑی اور علی گڑھ کے طلباء کا کردار اس تحریک کا جزوِ اعظم ہے۔ اس لیے قائداعظم کہا کرتے تھے کہ علی گڑھ مسلمانوں کا اسلحہ خانہ ہے۔''(۴)

یوں تو خلیل الرحمٰن داؤدی علی گڑھ میں دورانِ قیام متعدد شخصیتوں سے متأثر ہوئے، لیکن سب سے زیادہ اُنھوں نے اپنے استاد ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سے اکتسابِ علم کیا۔ اپنے اساتذہ کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ میرے شفیق استاد تھے۔ ڈاکٹر رفیع احمد چودھری صدر شعبۂ طبیعیات بھی میرے آئیڈیل رہے۔ میں خود بھی سائنس دان بننا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر رفیع احمد چودھری انٹرنیشنل اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین لارڈ ردرفورڈ کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انھیں یہاں بلایا گیا اور گورنمنٹ کالج لاہور کے فزکس ڈیپارٹمنٹ کا چیئرمین لگا دیا گیا۔''(۵)

علی گڑھ ایک اعلیٰ تعلیمی درسگاہ تھی اور ایک طالبعلم کے لیے ایک مکمل تربیت گاہ۔ خلیل الرحمٰن داؤدی علی گڑھ میں جتنا عرصہ رہے، ایک ہونہار طالبعلم کی حیثیت سے رہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سر سیّد احمد خاں کی دُوراندیشی نے بہت سے معمارِ قوم پیدا کیے ہیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی علی گڑھ کی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے علاوہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے فوائد کے متعلق بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''اگر سر سیّد احمد خان کی دُور اندیشی نے علی گڑھ نہ بنایا ہوتا تو نہ معلوم آج ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا، نہ تو پاکستان بنتا اور نہ ہندوستان میں اُنھیں کوئی مقام ملتا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا فیضان یہی تھا کہ انگریزی عہد میں مسلمانوں کو عزت و وقار سے زندہ رہنا نصیب ہوا ورنہ ہندوستان کے ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمان شودر سے زیادہ نہ ہوتے۔ علیگڑھ مسلم تہذیب و تمدن کا نمونہ تھا۔ علیگڑھ کے طلباء کی ایک شناخت تھی۔ سیاہ

شیروانی جس کے کالر پر کھجور اور ہلال کا مونوگرام بنا ہوتا تھا۔
علیگڑھ کٹ پاجامہ، سر پر ترکی ٹوپی جو بعد میں جناح کیپ ہوگئی
تھی۔ مغربی لباس نہ ہونے کے برابر تھا، چنانچہ میں بھی جب تک
علی گڑھ میں رہا، اسی لباس میں رہا۔''(٦)

علی گڑھ میں جہاں خلیل الرحمٰن داوٗدی تعلیمی و تنظیمی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل رہے، وہاں انھیں دورانِ تعلیم بعض دلچسپ حالات و واقعات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً تقسیمِ ہند کے فوراً بعد جب یو۔پی میں نپت کی وزارت تھی، سومنات کے مندر کی تعمیر کا چرچا ہوا، یہ وہی سومنات کا مندر تھا، جسے کبھی محمود غزنوی نے حملہ کر کے تاراج کر دیا تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد جب اس کی تعمیر نو شروع ہوئی تو علی گڑھ یونیورسٹی میگزین میں ایک نہایت شاندار نظم چھپی، جس کا ایک شعر یہ تھا:

گونجتی ہے پھر فضاؤں میں صدائے سومنات
پھر کسی غزنی سے کوئی غزنوی پیدا کرو

یو۔پی کے کانگریسی وزیرِ اعلیٰ نپت نے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کو مجبور کیا کہ وہ اس میگزین کے ایڈیٹر کو یونیورسٹی سے خارج کر دیں۔ بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر ڈاکٹر سر ضیاء الدین نے اس حکم کی تعمیل میں ایڈیٹر کو یونیورسٹی چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ جس کی وجہ سے طلباء کی ایک بڑی تعداد میں غصہ کی لہر دوڑ گئی اور بڑے پیمانے پر احتجاج شروع ہوگیا۔ اس واقعے کی تفصیلات کے بارے میں خلیل الرحمٰن داوٗدی کہتے ہیں:

''ہم سب طلباء نے اس کے خلاف احتجاج کیا، وہ
احتجاج اتنا شدید تھا کہ میں جب یاد کرتا ہوں تو کانپ اُٹھتا
ہوں۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین اپنے دفتر کا دروازہ بند کر کے پچھلی

دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے کانپ رہے تھے۔ بالآخر انھیں یہ
لکھ کر یونیورسٹی چھوڑنی پڑی کہ بیشتر طلباء اور ان کے والد میرے
شاگرد رہے ہیں، میں نے گزشتہ پچاس سال اس درسگاہ کی
خدمت کی ہے اور اب میں اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کر رہا
ہوں۔"(۷)

غرض علیگڑھ کی درسگاہ تعلیمی ہی نہیں، طلباء کی تہذیبی، تمدنی اور ذہنی نشوونما کے لیے بھی ایک بہترین اور شان وشکوہ والی درسگاہ تھی۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کی ذہنی تربیت اور ان کے علمی و ادبی ذوق کی آبیاری میں علی گڑھ کالج کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہاں سے وہ جب فارغ التحصیل ہوئے تو وہ ایک سیاسی شعور رکھنے والی اور ادبی ذوق کی حامل شخصیت کے روپ میں سامنے آئے۔

ادبی زندگی:

خلیل الرحمٰن داؤدی کے اندر علمی و ادبی صلاحیتیں بچپن ہی سے ودیعت تھیں اور وہ عطیۂ خداوندی کے سبب سوچنے، سمجھنے اور لکھنے کی صلاحیت سے بہرہ یاب تھے، یہی وجہ ہے کہ بچپن ہی سے ان کے اندر شعری و ادبی ذوق کی جھلک دِکھائی دیتی ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کے ادبی ذوق کی تعمیر و تشکیل میں ہر چند کہ ان کے خاندانی پس منظر اور ماحول کا اثر بھی دِکھائی دیتا ہے۔ تاہم اس ضمن میں ان کے علی گڑھ کے زمانۂ تعلیم، کالج کے ماحول اور عظیم علمی و ادبی شخصیات سے میل ملاپ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

خلیل الرحمٰن داؤدی نے اپنی ادبی زندگی میں بہت سی کتب کی ترتیب و تدوین کا فریضہ انجام دیا ہے اور ان کے متعدد مضامین، تقاریر اور فیچر ان کی مصروف

ادبی زندگی کا پتہ دیتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے اپنی زندگی کے اولین ۲۵ برس ملک کے ممتاز ترین ادباء، فضلاء اور علماء کی مصاحبت و مقاربت میں گزارے۔ جن شخصیات نے ان کی ادبی زندگی کی پرداخت میں اہم کردار ادا کیا، ان میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا صلاح الدین احمد، سیّد امتیاز علی تاج، سیّد عابد علی عابد، مولانا محمد شفیع سابق پرنسپل اورینٹل کالج، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا غلام مرشد، ممتاز حسن، شیخ محمد اکرام وغیرہ شامل ہیں، خود خلیل الرحمٰن داؤدی کا اعتراف ہے کہ:

> ''ان حضرات کے ساتھ مختلف اوقات میں میری شبانہ روز نشستیں رہی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے فیضانِ صحبت سے میں بہت مستفید ہوا ہوں۔''(۸)

جب سر فرانس موڈی گورنر پنجاب نے دفعہ 92A کے تحت نواب افتخار حسین ممدوٹ وزیراعلیٰ پنجاب کی وزارت کو تحلیل کیا اور دوسرے الیکشن میں میاں ممتاز دولتانہ کامیاب ہو کر وزیراعلیٰ پنجاب بنے تو ممتاز خان دولتانہ نے ۱۹۵۱ء میں حکومتِ پنجاب کے تحت ایک نیا محکمہ ''اسلامیات'' کے عنوان سے قائم کر دیا۔ اس محکمہ کے سیکرٹری سیّد نور احمد ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ پنجاب تھے، لیکن تمام انتظام و انصرام مولانا ابراہیم علی چشتی فرزند ارجمند مولانا محرم علی چشتی مرحوم کے سپرد تھا جو محکمہ اسلامیات کے ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ اس محکمہ کا مقصد تھا کہ اسلام سے متعلق امہات الکتب کو جدید ترتیب و تصحیح کے بعد صحیح متون کی شکل میں قوم تک پہنچا کر خدمت انجام دی جائے، اس سلسلے میں سنت والجماعت سے متعلق صحاح ستہ (صحیح البخاری، صحیح المسلم، موطا امام مالک، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور ابنِ ماجہ) مفرداتِ امام راغب اصفہانی اور تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی وغیرہ کے علاوہ اثنا عشری مسلک سے متعلق اصول الکافی یعقوب کلینی،

ریاض المسائل، تفسیر محمد بن حسن طوسی اور نہج البلاغہ وغیرہ کے صحیح متون کی اشاعت مقصود تھی۔ اس اشاعتی پروگرام کے سلسلے میں خلیل الرحمٰن داؤدی نے ان کتابوں پر تعارفی مضامین لکھے جو مختلف اخبارات میں ساتھ ساتھ شائع ہوتے رہے، اس طرح ان کا تعلق محکمہ اسلامیات، حکومتِ پنجاب سے بھی ہو گیا اور وہ مولانا ابراہیم علی چشتی کے مقربین میں شامل ہو گئے، لیکن جلد ہی اُنھوں نے چند متنازع مسائل کی وجہ سے یہ ادارہ چھوڑ دیا۔

خلیل الرحمٰن داؤدی ابتداء میں ایک فری لانس صحافی تھے، وہ کسی خاص اخبار کے دفتر سے وابستہ نہیں رہے، چنانچہ اُنھوں نے متعدد اخبارات کے لیے مضامین تحریر کیے ہیں، جن اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوئے، ان میں روزنامہ زمیندار لاہور، روزنامہ امروز، روزنامہ آفاق، روزنامہ ملت، روزنامہ احسان اور روزنامہ مغربی پاکستان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام اخبارات پاکستانی صحافت میں درجۂ اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۲ء تک ریڈیو پاکستان لاہور سے خلیل الرحمٰن داؤدی کی تقاریر اور فیچر نشر ہوتے رہے۔ یہ تقاریر اور فیچرز ان کی ادبی زندگی کے حوالے سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

خلیل الرحمٰن داؤدی کی ادبی زندگی کا ایک رُخ اس وقت نمایاں ہوا، جب وہ مجلس ترقیٔ ادب، لاہور میں ملازمت کرتے تھے۔ یہاں اُنھوں نے کلاسیکی ادب کی بعض کتابوں کی ترتیب و تدوین کی خدمت سرانجام دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی خلیل الرحمٰن داؤدی کے یہاں خدمتِ ادب ہی کا پہلو حاوی ہے، کیونکہ محض ملازمت کی خاطر اتنے گہرے مطالعے کے ساتھ کتب کی ترتیب و تدوین کا کام کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا۔

خلیل الرحمٰن داؤدی کی ادبی زندگی کے اس اجمالی جائزے سے ایک اہم بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ اہمیت ادبی حوالوں کو دی ہے۔ اُنھوں نے اب تک جو تحریر کیا ہے، اس کا پورا اندازہ ادبی حلقوں کو نہیں تاہم اگر بنگاہِ غائر دیکھا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ کام کسی طرح بھی مقدار اور معیار کے اعتبار سے کم اہمیت کا حامل نہیں ہے، وہ مقدار کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ ہے اور معیار کے اعتبار سے بھی بہت سے محققین کی تحقیق پر بھاری ہے۔ آج بھی جب کہ وہ کُنجِ گمنامی میں دن بسر کر رہے ہیں، ان کے مطالعے کا شوق ختم نہیں ہوا اور آج بھی ان کا اوڑھنا بچھونا ادب ہی ہے۔ اگر چہ ضعیفی اور آنکھوں کی بیماری نے مجبوریاں حائل کر رکھی ہیں، تاہم ان کا نوشت و خواند کا عمل آج بھی جاری ہے۔ ادب آج بھی ان کے لیے محض ایک مشغلہ نہیں، بلکہ زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے۔

ذریعۂ روزگار:

خلیل الرحمٰن داؤدی نے کبھی ملازمت نہیں کی، اس لیے باقاعدہ روزگار کا تصور ان کی شخصیت سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے معاش کے ذرائع دو طرح کے رہے ہیں:

(۱) اخباری مضامین کا معاوضہ، ریڈیو پاکستان کی تقاریر اور فیچرز کا معاوضہ اور مجلس ترقیٔ ادب سے شائع ہونے والی کتابوں کا معاوضہ۔

(۲) پورے پاکستان کے تمام بڑے بڑے کتب خانوں اور عجائب گھروں کو نادر مطبوعات اور مخطوطات کی فراہمی۔

خلیل الرحمٰن داؤدی کے بارے میں عمومی طور پر لوگوں کا یہ تأثر ہے کہ

اُنھوں نے کتب اور مخطوطات کی فروخت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا، لیکن ان کے اپنے بیان سے اس بات کی نفی ہوتی ہے، خود ان کا کہنا ہے:

''میں نے پوری زندگی شخصی طور پر کسی فرد کو کوئی مطبوعہ کتاب یا مخطوطہ فروخت نہیں کیا، جو ضرورت مند یا اہلِ علم میرے پاس کسی کتاب یا مخطوطے کے لیے آیا، میں نے ہمیشہ بلا معاوضہ اس کی خدمت کی۔ میں کسی ضرورت مند کو کتابیں نذر کرتے وقت نہ تو ان کی تعداد کو دیکھتا ہوں اور نہ ان کی قیمت کا خیال رکھتا ہوں، ہر ضرورت مند کی طلب بڑی فراخ دِلی سے پوری کر کے خوش ہوتا ہوں۔ البتہ اداروں، کتاب خانوں اور عجائب گھروں سے نادر مطبوعات اور مخطوطات کی مناسب اور معقول قیمتیں وصول کرتا ہوں۔ اس ذریعے سے مجھے اتنی یافت ہو جاتی ہے کہ میں معقول انکم ٹیکس بھی ادا کرتا ہوں۔ میں مخطوطات پر جو تحقیقی کام کرتا ہوں، قیمت دراصل اسی کی ہوتی ہے۔''(۹)

درج بالا اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے کوئی باقاعدہ ملازمت اختیار نہیں کی۔ البتہ کتابوں کی خرید و فروخت کے ذریعہ اُنھوں نے اپنے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھا۔

مجلس ترقیٔ ادب سے تعلق کے حوالے سے بھی خلیل الرحمٰن داؤدی کی حیثیت ایک ادیب ہی کی رہی ہے۔ جنرل ایوب خان نے ۱۹۵۸ء میں مارشل لا نافذ کر کے ملک کا نظم و نسق سنبھالا اور دیگر اقدامات کے ساتھ ساتھ میاں افتخار الدین (پروگریسو پیپرز لمیٹڈ) کے اخبارات ''پاکستان ٹائمز''، ''امروز'' اور ''لیل و نہار'' وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ فیض احمد فیض ایڈیٹر ''پاکستان ٹائمز، فارغ کر دیئے گئے۔ جسٹس ایس اے رحمان

اور ایس ایم شریف فیڈرل ایجوکیشن سیکرٹری نے سیّد امتیاز علی تاج سے مجلس ترقیٔ ادب کو سنبھالنے کی استدعا کی۔ امتیاز علی تاج اس پر آمادہ ہو گئے اور اُنھوں نے مجلس ترقیٔ ادب کی نظامت سنبھال لی۔ یہ ۱۳ر جنوری ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے اسی روز سے مجلس ترقیٔ ادب کے کاموں میں امتیاز علی تاج کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مساعی نے ان اداروں کو علمی و تحقیقی کتابوں کی اشاعت کا ایک مرکز بنا دیا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے مجلس کے لیے تقریباً ۲۰ کتابیں مرتب کیں، جن میں سے ۱۶ کتابیں سیّد امتیاز علی تاج کے زمانے میں شائع ہوئیں اور ۴ کتابیں ان کے انتقال کے بعد شائع ہونے سے رہ گئیں۔

ریڈیو پاکستان لاہور سے خلیل الرحمٰن داؤدی کی جو تقاریر اور فیچرز نشر ہوئے، وہ بھی ان کی باقاعدہ ملازمت کے زمرے میں نہیں آتے، البتہ ان تقاریر اور فیچرز کے نشر ہونے سے باقاعدہ معاوضہ انہیں وصول ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف اخبارات میں جو مضامین ان کے شائع ہوتے رہے، وہ بھی ان کی کفالت کا ایک ذریعہ رہے ہیں۔

ب۔ آثارِ قلم

داؤدی صاحب کے آثارِ قلم کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) مرتبہ کتب

(ب) غیر مدون مضامین

(ج) غیر مدون ریڈیائی فیچرز اور تقاریر

(د) مخطوطات کے تعارفی نوٹ

(الف) مرتبہ کتب:

خلیل الرحمٰن داوٗدی نے مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور سے وابستگی کے دوران میں مندرجہ ذیل بیس کتابیں مرتب کیں۔

(۱) مذہبِ عشق:

نہال چند لاہوری کی یہ تصنیف جسے خلیل الرحمٰن داوٗدی نے مرتب کیا، مجلس ترقیٔ ادب لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی نے ''مقدمہ مذہبِ عشق'' کے عنوان سے ۱۴۱ صفحات پر مبنی ایک مبسوط مقدمہ بحیثیتِ مرتب تحریر کیا ہے۔

(۲) دیوانِ درد:

خلیل الرحمٰن داوٗدی نے خواجہ میر درد کا کلام ''دیوانِ درد'' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ یہ دیوان مجلس ترقیٔ ادب لاہور نے پہلی بار فروری ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ اس دیوان پر داوٗدی صاحب نے ۱۸۱ صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا ہے۔ اس مقدمے کو ۱۳ ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

- i۔ آباوٗ اجداد خواجہ میر درد
- ii۔ خواجہ ناصر عندلیب
- iii۔ حالات خواجہ میر درد
- iv۔ شاگردانِ خواجہ میر درد
- v۔ جائزہ تصانیف خواجہ میر درد
- vi۔ تصانیف فارسیہ خواجہ میر درد
- vii۔ دیوانِ اُردوئے خواجہ میر درد
- viii۔ درد کے وہ اشعار جو شاملِ دیوان نہیں ہیں

ix۔ تبصرہ

x۔ درد، میر اور سودا کی ہم طرح غزلیں

xi۔ طباعتِ کلامِ درد

xii۔ اختتامیہ

xiii۔ موجود نسخ کی تصحیح و ترتیب

(اس اشاعت کے ختم ہو جانے کے بعد ۱۹۸۸ء میں ''دیوانِ درد'' کی دوسری اشاعت عمل میں آئی۔ لیکن اس دوسری اشاعت میں خلیل الرحمٰن داؤدی کے لکھے ہوئے مقدمے کو نصف سے زیادہ خارج کر دیا گیا ہے اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔)

(۳) قواعد زبان اُردو (رسالہ گل کرسٹ):

جان گل کرسٹ کی تصنیف ''قواعد زبان اُردو'' مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے دسمبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے اس تصنیف پر ۵۲ صفحات کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔

(۴) بہارِ دانش:

مرزا جان طپش کی اُردو مثنوی ''بہارِ دانش'' مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے پہلی بار ستمبر ۱۹۶۳ء کو شائع ہوئی جس پر خلیل الرحمٰن داؤدی نے ۳۶ صفحات پر مشتمل دیباچہ تحریر کیا ہے۔

(۵) سروشِ سخن:

سیّد محمد فخر الدین حسین سخن کی تصنیف ''سروشِ سخن'' جسے خلیل الرحمٰن داؤدی

نے مرتب کیا، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے ستمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔

(۶) یادگارِ غالب:

مولانا الطاف حسین حالی کی سوانح عمری ''یادگارِ غالب'' جسے خلیل الرحمٰن داؤدی نے مرتب کیا، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے دسمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کا مقدمہ سنتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

(۷) بہارستانِ ناز:

حکیم فصیح الدین رنج کا تذکرۂ شاعرات ''بہارستانِ ناز'' مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی مجلس ترقی ادب، لاہور سے مارچ ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کا لکھا ہوا اس کتاب کا مقدمہ ۷۵ صفحات کو محیط ہے۔

(۸-۹) گلستانِ سخن (جلد اوّل و دوم):

مرزا قادر بخش صابر دہلوی کا تذکرہ ''گلستانِ سخن'' جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے جون ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ جلد اوّل کا مقدمہ دو اصحاب کا تحریر کردہ ہے۔ حالاتِ زندگی پر مشتمل حصہ خلیل الرحمٰن داؤدی کا تحریر کردہ ہے جبکہ مقدمے کا دوسرا حصہ گلستانِ سخن کے عنوان سے ڈاکٹر وحید قریشی کا تحریر کردہ ہے۔ مقدمے کے یہ دونوں حصے صفحہ ۳ سے شروع ہو کر صفحہ نمبر ۱۱۹ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

(۱۰) قصۂ اگر گل:

سعادت خان ناصر کی تصنیف ''قصۂ اگر گل'' مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے جنوری ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی، جس پر خلیل الرحمٰن داؤدی نے پچیس (۲۵) صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا ہے۔

(۱۱) اُردو کی قدیم منظوم داستانیں:

خلیل الرحمٰن داؤدی کی مرتب کردہ یہ کتاب مجلس ترقیٔ ادب لاہور سے جون ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے ۱۰ صفحات پر مشتمل مقدمے میں ان منظوم داستانوں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔

(۱۲) مجموعۂ نثر غالب:

جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کی مرتب کردہ یہ کتاب مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں غالب کی مختلف اُردو نثری تصانیف کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ہر رسالہ کے آغاز پر خلیل الرحمٰن داؤدی کا مختصر تعارف بھی درج ہے۔

(۱۳) کلیاتِ انشاء (جلد اوّل):

انشاء اللہ خاں انشاء کے کلام کی جلد اوّل ''کلیاتِ انشاء'' کے نام سے مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے جولائی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر آمنہ خاتون نے تحریر کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے صرف انشاء کے کلام کی تدوین کی ہے۔

(۱۴) نو رتن:

محمد بخش مہجور کی تصنیف ''نو رتن'' کو خلیل الرحمٰن داؤدی نے مرتب کیا۔ اور اسے مجلس ترقیٔ ادب، لاہور نے دسمبر ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ اس کتاب پر خلیل الرحمٰن داؤدی نے ۳۴ صفحات کا جامع مقدمہ تحریر کیا ہے۔

(۱۵) قصص ہند:

''قصصِ ہند'' کا دوسرا حصہ جسے محمد حسین آزاد نے تصنیف کیا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کے تعارف کے ساتھ مجلس ترقیٔ ادب، لاہور سے شائع ہوئی۔ اپنے تعارف میں

خلیل الرحمٰن داؤدی نے مصنف کے حالاتِ زندگی، تصنیفات و تالیفات اور قصصِ ہند کے تینوں حصوں کا مختصر تعارف کروایا ہے۔ یہ تعارف کل ۱۰ صفحات پر مبنی ہے۔

(۱۶) رسومِ ہند:

"رسومِ ہند" جس کی تالیف کپتان ہالرائیڈ اور ان کے معاونین کی مرہونِ منت ہے، خلیل الرحمٰن داؤدی نے مرتب کی اور اسے مجلس ترقیٔ ادب، لاہور نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے اس پر ۸ صفحات کا دیباچہ تحریر کیا ہے۔

(۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰):

کلیاتِ انشاء (جلد دوم)، گل وصنوبر، طلسم حیرت، فسانۂ عجائب۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کی مرتب کردہ یہ چاروں کتب شائع نہ ہوسکیں۔ امتیاز علی تاج کے انتقال کے بعد ۲۷ برس تک یہ کتب غیر مطبوعہ رہیں۔ مجلس ترقیٔ ادب، لاہور کے موجودہ ناظم جناب احمد ندیم قاسمی نے بوجوہ ان کتب کی اشاعت کا ابھی تک بندوبست نہیں کیا۔ افسوس ان غیر مطبوعہ کتب کی کیفیت یہاں پیش نہیں کی جا سکتی، کیونکہ خلیل الرحمٰن داؤدی کے پاس بھی اب ان کا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

(ب) خلیل الرحمٰن داؤدی کے غیر مدون مضامین (مکمل فہرست):

مضمون کا عنوان	اشاعت
موطا امام مالک	روز نامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۲۱/ دسمبر ۱۹۵۱ء
امام بخاری	روز نامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۲۲/ دسمبر ۱۹۵۱ء
امام مسلم	روز نامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۲۵/ دسمبر ۱۹۵۱ء
امام نسائی	روز نامہ زمیندار، لاہور مورخہ ۷/ جنوری ۱۹۵۲ء
امام ابنِ ماجہ	روز نامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۹/ جنوری ۱۹۵۲ء
سنن ابی داؤد	روز نامہ مغربی پاکستان، لاہور، مورخہ ۹/ جنوری ۱۹۵۲ء

جامع ترمذی	روزنامہ مغربی پاکستان، لاہور، مورخہ ۱۳ر جنوری ۱۹۵۲ء
اصول الکافی	روزنامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۳۱ر جنوری ۱۹۵۲ء
امام فخر الدین رازی	روزنامہ احسان، لاہور، مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۵۲ء
تفسیر کبیر	روزنامہ احسان، لاہور، مورخہ ۲۷ر جنوری ۱۹۵۲ء
امام فخر الدین رازی	روزنامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۳۰ر جنوری ۱۹۵۲ء
آئمہ اربعہ کی کتبِ احادیث پر ایک راست نظر	روزنامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۵۲ء
محمد بن حسن طوسی	روزنامہ احسان، لاہور، مورخہ ۲۴ر فروری ۱۹۵۲ء
نہج البلاغہ	روزنامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۲۵ر فروری ۱۹۵۲ء
امام الادب راغب اصفہانی	روزنامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۵۲ء
علامہ طباطبائی	روزنامہ احسان، لاہور، مورخہ ۱۶ر مارچ ۱۹۵۲ء
سرزمینِ مصر میں اسلامی پرچم لہرانے کے بعد	روزنامہ زمیندار، لاہور، مصر نمبر، مورخہ ۱۱ر فروری ۱۹۵۲ء
قومی تہذیب پر زبان و ادب کے اثرات	روزنامہ امروز، لاہور، مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۵۲ء
انتقام فتح ایوبی	روزنامہ امروز، لاہور، مورخہ ۳ر مارچ ۱۹۵۲ء
میلہ چراغاں	روزنامہ امروز، لاہور، مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۵۲ء
اُردو غزل گوئی کا آدمِ اوّل	روزنامہ امروز، لاہور، مورخہ ۱۲ر مارچ ۱۹۵۲ء
چنگیز خان	روزنامہ امروز، لاہور، مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۲ء
ناسخ و آتش ایک ہی آئینہ میں	روزنامہ آفاق، لاہور، مورخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۵۲ء
حبا سیّد کی مدنی العربی	روزنامہ آفاق، لاہور، مورخہ یکم دسمبر ۱۹۵۲ء
شاہجہاں اور فنونِ لطیفہ	روزنامہ آفاق، لاہور، مورخہ ۲ر فروری ۱۹۵۳ء
شالامار باغ اور میلہ چراغاں	روزنامہ امروز، لاہور، مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۵۴ء

غ اور امیر ایک ہی آئینہ میں	روزنامہ امروز، لاہور، مورخہ ۱۹؍ جولائی ۱۹۵۴ء
جدوجہدِ آزادی کا یک عظیم المرتبت مجاہد	روزنامہ امروز، لاہور، مورخہ ۱۴؍ اگست ۱۹۵۴ء
امائن کا فارسی نظم میں ترجمہ	روزنامہ ملت، لاہور، مورخہ ۱۱؍ اکتوبر ۱۹۵۴ء
سرسیّد کی آثار الصنادید ور مولانا حالی	روزنامہ ملت، لاہور، مورخہ ۸؍ نومبر ۱۹۵۴ء
امائن اور آثار الصنادید	روزنامہ ملت، لاہور، مورخہ ۲۸؍ نومبر ۱۹۵۴ء
ثار الصنادید	روزنامہ لت، لاہور، مورخہ ۲۹؍ نومبر ۱۹۵۴ء
شالامار باغ میں یلۂ چراغاں کا آغاز	روزنامہ ملت، لاہور، مورخہ ۲۸؍ مارچ ۱۹۵۵ء
۵۰ کی جنگِ آزادی کا یک مجاہد	روزنامہ آفاق، لاہور، مورخہ ۲۶؍ اگست ۱۹۵۶ء
ام فخر الدین رازی	ماہنامہ الفرقان، لاہور، بابت فروری ۱۹۵۲ء
ریخ خود کو دہراتی ہے	ماہنامہ ''آداب عرض'' لاہور، بابت جولائی ۱۹۵۴ء
لِ آزادی کا یادگار مجاہد	ماہنامہ آداب عرض، لاہور، بابت ستمبر ۱۹۵۴ء
Muslim Contributio to Mathematic	ماہنامہ اسلامک لٹریچر (انگریزی)، لاہور، ناشر شیخ محمد اشرف، بابت ستمبر ۱۹۵۳ء
Religion & Moralit	ماہنامہ اسلامک لٹریچر (انگریزی)، لاہور، ناشر شیخ محمد اشرف، بابت دسمبر ۱۹۵۴ء
ام رسول مہر	شخصیات نمبر، مجلہ نقوش، لاہور، ایڈیٹر محمد طفیل، شمارہ ۴۷، ۴۸، بابت جنوری ۱۹۵۵ء
دستۂ نازنیناں	اورینٹل کالج میگزین، لاہور، ایڈیٹر ڈاکٹر سیّد عبداللہ، بابت نومبر ۱۹۵۵ء

دہلی اخبارات	کتاب ۱۹۵۷ء (کوائف و صحائف)، ناشر ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، کراچی، مئی ۱۹۵۷ء
میرٹھ میں	مجلّہ خیال، لاہور، مدیران ناصر کاظمی و انتظار حسین، سن ستاون نمبر (یادگارِ ۱۹۵۷ء)، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۷ء
۱۸۵۷ء سے قبل کی اُردو مطبوعات	اُردو نامہ، لاہور، ایڈیٹر عطش دُرانی، بابت اگست ۱۹۸۳ء (قسط اوّل)
۱۸۵۷ء سے قبل کی اُردو مطبوعات	اُردو نامہ، لاہور، ایڈیٹر عطش دُرانی، بابت ستمبر ۱۹۸۳ء (قسط دوم)

(غالبیات)

دل کے خوش رکھنے کو ایسا ہی خیال اچھا ہے	روزنامہ زمیندار، لاہور، مورخہ ۲۴/ مارچ ۱۹۵۲ء
ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں	روزنامہ آفاق، لاہور، مورخہ ۱۴/ اپریل ۱۹۵۲ء
کیا مرزا غالب مورخ بھی تھے	روزنامہ ملت، لاہور، مورخہ ۱۵/ فروری ۱۹۵۴ء
ادبیاتِ غالب میں اضافہ	روزنامہ امروز، لاہور، مورخہ ۲۲/ فروری ۱۹۵۴ء
مرزا غالب کا ایک نادر قطعہ	روزنامہ آفاق، لاہور، مورخہ ۱۴/ فروری ۱۹۵۵ء
دیوانِ غالب اُردو (ایک نادر مخطوطہ)	ماہنامہ 'ماہِ نو' کراچی، بابت فروری ۱۹۵۹ء
غالب اور محققینِ غالب (۱)	روزنامہ امروز، کراچی، مورخہ ۱۵/ فروری ۱۹۵۹ء
غالب اور محققینِ غالب (۲)	روزنامہ امروز، کراچی، مورخہ ۱۶/ فروری ۱۹۵۹ء

(ج) خلیل الرحمٰن داؤدی کے غیر مدون ریڈیائی فیچرز اور تقاریر

(مکمل فہرست):

عنوان تقریر یا فیچر	تاریخ نشر
ترجموں کا دور... دورِ جدید	۲/ مارچ ۱۹۵۰ء
نواب مصطفٰی خاں شیفتہ... سلسلۂ انقلاب ۱۸۵۷ء کی چند شخصیتیں	۸/ ستمبر ۱۹۵۲ء

مارک میں ڈیری فارمنگ... ملک ملک کی صنعت ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۲ء

دہلی کے اخبارات میں... جنگِ آزادی کی کہانی ۱۰/نومبر ۱۹۵۲ء

سعودی ایشیائی ممالک میں... سیاحوں کی زبانی ۲۳/فروری ۱۹۵۳ء

جامع مسجد بغداد... اسلامی ثقافت اور مساجد ۱۶/مارچ ۱۹۵۳ء

جنگِ آزادی کا اثر سیاست پر ۳/مئی ۱۹۵۳ء

جامع مسجد دہلی... اسلامی ثقافت اور مساجد ۸/جون ۱۹۵۳ء

پاکستانیت... بلند عزمی ۲۸/جون ۱۹۵۳ء

مولانا جعفر تھانیسری... جنگِ آزادی کے مؤرخین ۲۶/جولائی ۱۹۵۳ء

غزوۂ احد... رزمِ حق و باطل ۱۴/اکتوبر ۱۹۵۳ء

ترتیب... اُردو صحافت کے پچاس سال ۱۰/اکتوبر ۱۹۵۳ء

کنھیالال... جنگِ آزادی کے مورخین یکم نومبر ۱۹۵۳ء

اداریہ... اُردو صحافت کے پچاس سال ۲۸/نومبر ۱۹۵۳ء

البیرونی... ہمارے بزرگ (اسکول براڈ کاسٹ) ۳۰/نومبر ۱۹۵۳ء

Cooper... جنگِ آزادی کے غیر ملکی مورخین یکم جنوری ۱۹۵۴ء

امیر خسرو... ہمارے بزرگ (اسکول براڈ کاسٹ) ۱۸/فروری ۱۹۵۴ء

Meleson... جنگِ آزادی کے غیر ملکی مورخین ۱۸/مئی ۱۹۵۴ء

شہدائے بالاکوٹ... جنگِ آزادی کے پیشرو ۴/اگست ۱۹۵۴ء

میرٹھ... جنگِ آزادی کی کہانی، شہروں کی زبانی یکم اکتوبر ۱۹۵۴ء

اقتباسات از مکتوباتِ امام ربانی مجدد الف ثانی ۲۶/اکتوبر ۱۹۵۴ء

سعد بن ابی وقاص... ہمارے سپہ سالار ۲۸/اکتوبر ۱۹۵۴ء

حضرت نظام الدین اولیاء ۱۰/دسمبر ۱۹۵۴ء

مولانا محمد علی جوہر کی صحافت	۴/جنوری ۱۹۵۵ء
پانی پت ... فیصلہ کن لڑائیاں	۷/فروری ۱۹۵۵ء
دورِ جدید ... ترجموں کے دَور	۲۵/ مارچ ۱۹۵۵ء
ابنِ بطوطہ کے نام ... آپ کا مخلص	یکم جون ۱۹۵۵ء
مغربی پاکستان تاریخ کے آئینہ میں	۲/ستمبر ۱۹۵۵ء
صحابہؓ اور عشقِ رسول ﷺ ... شمعِ رسالت کے پروانے	۲۹/اکتوبر ۱۹۵۵ء
مارکوپولو ... سیاحوں کی کہانی (اسکول براڈکاسٹ)	۱۳/فروری ۱۹۵۶ء
کتب خانوں کے آداب	۲۶/اپریل ۱۹۵۶ء
کپتان کک ... سیاحوں کی کہانی	۴/ جون ۱۹۵۶ء
اُردو اور فارسی شاعری میں ذکرِ خلیل (عیدالاضحیٰ)	۱۹/ جولائی ۱۹۵۶ء
حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط	۶/ اگست ۱۹۵۶ء
حضرت داتا گنج بخشؒ کے تبلیغی کارنامے	۲۵/ستمبر ۱۹۵۶ء
سیرالاولیاء ... نظام الدین اولیاء کے ملفوظات سے اقتباسات	۲۲/نومبر ۱۹۵۶ء
مکہ معظّمہ ... دنیا کی سیر	۱۰/ دسمبر ۱۹۵۶ء
نندکمار اور وارن ہیسٹنگز ... افسانہ اور حقیقت	۲۳/ دسمبر ۱۹۵۶ء
مدوجذرِ اسلام بتقریب یومِ حالی	۳۱/ دسمبر ۱۹۵۶ء
شہیدِ حریت ٹیپو سلطان کا خطبہ	۴/مئی ۱۹۵۷ء
انجمن (مذاکرہ) موضوع: جنگِ آزادی کی تعبیریں	۱۳/مئی ۱۹۵۷ء

شرکاء: چیف جسٹس ایس۔اے۔رحمٰن، مولانا صلاح الدین احمد
عابد علی عابد، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فرید آبادی، عبدالمجید سالک
اور خلیل الرحمٰن داؤدی

اُردو ادب اور انقلابِ ۱۸۵۷ء اقتباس از اسبابِ بغاوتِ ہند ۹/ مئی ۱۹۵۷ء

اُردو ادب اور انقلابِ ۱۸۵۷ء اقتباس از دستنبوئے غالب ۱۱/ مئی ۱۹۵۷ء

اُردو ادب اور انقلابِ ۱۸۵۷ء اقتباس از داستانِ غدر ۱۲/ مئی ۱۹۵۷ء

اُردو ادب اور انقلابِ ۱۸۵۷ء اقتباس از روزنامہ منشی جیون لال ۱۳/ مئی ۱۹۵۷ء

اُردو ادب اور انقلابِ ۱۸۵۷ء اقتباس از بیگمات کے آنسو ۱۴/ مئی ۱۹۵۷ء

اُردو ادب اور انقلابِ ۱۸۵۷ء اقتباس از قیصر التواریخ ۱۵/ مئی ۱۹۵۷ء

اُردو ادب اور انقلابِ ۱۸۵۷ء اقتباس از تصویر کا دوسرا رُخ ۱۶/ مئی ۱۹۵۷ء

۱۸۵۷ء کی عیدِ قربان ۹/ جولائی ۱۹۵۷ء

اتمامِ حجت... اُردو مرثیہ میں شہادت زارِ کربلا ۳/ اگست ۱۹۵۷ء

حضرتِ عثمانؓ کے غیر فانی کارنامے ۶/ جولائی ۱۹۵۸ء

حضرت امام حسینؓ کے خطبات... قولوا للناس حسنة ۲۵/ جولائی ۱۹۵۸ء

ارشاداتِ حضرت علیؓ ۳۱/ مارچ ۱۹۵۹ء

حضرت عثمان غنیؓ کے ارشادات ۲۶/ جون ۱۹۵۹ء

حقِ ہمسایہ... اسوۂ حسنہ ۸/ ستمبر ۱۹۵۸ء

فوایدالفواد سے اقتباسات... حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی یاد میں ۱۰/ اکتوبر ۱۹۵۹ء

عیدِ قربان کی معاشرتی اہمیت ۶/ جون ۱۹۶۱ء

فتوحاتِ عثمانی... حضرت عثمانؓ کی یاد میں ۱۴/ جون ۱۹۶۱ء

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ اور اشاعتِ اسلام یکم اگست ۱۹۶۱ء

غزواتِ رسولؐ... ہادیِ اعظمؐ ۳۰/ اگست ۱۹۶۱ء

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی اور اسلامی قدروں کی تجدید ۲۲/ اگست ۱۹۶۱ء

تہذیب الاخلاق... مرحوم ادبی رسائل ۹/ اکتوبر ۱۹۶۱ء

سلاطینِ وقت بارگاہِ نظام الدین اولیاء میں	۱۰/ اکتوبر ۱۹۶۱ء
مقامِ صدیقؓ	۲۰/ دسمبر ۱۹۶۱ء
تہذیبِ نسواں	۱۸/ دسمبر ۱۹۶۱ء
رمضان میں ظاہر و باطن کی ہم آہنگی	۱۲/ مارچ ۱۹۶۱ء
حضرت عمرؓ کی فتوحات	۱۳/ جون ۱۹۶۱ء
حضرت داتا گنج بخشؒ	۳/ اگست ۱۹۶۱ء
میرا کتاب خانہ تحقیق	۲۱/ نومبر ۱۹۶۱ء
جمعۃ الوداع	۲/ مارچ ۱۹۶۲ء
حضرت بابا فرید گنج شکر کے ملفوظات	۸/ جون ۱۹۶۲ء
حضرت ابوبکرؓ کے عہد کی فتوحات	۲۱/ نومبر ۱۹۶۲ء
حضرت عثمانؓ کا عہدِ خلافت	۱۳/ مئی ۱۹۶۳ء
حج بیت اللہ	۲۲/ اپریل ۱۹۶۴ء
مجدد الف ثانی اور تجدیدِ دین	۲۹/ جون ۱۹۶۵ء

(د) تعارف مخطوطات:

مخطوطہ وہ کتاب یا رسالہ ہوتا ہے، جو ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ مخطوطات کی اہمیت آج بھی مسلم ہے، لیکن پریس کے آنے سے پہلے تو ان کی اہمیت و افادیت کئی گنا زیادہ تھی اور ان کی تیاری اور نگہداشت کے لیے خصوصی اہتمام ہوتا تھا۔ ان نادر نسخوں پر نہایت عمدہ روشنائی استعمال ہوتی تھی اور خط نہایت نفیس ہوتا تھا۔ بعض نسخوں پر سونے کا کام ہوتا تھا۔ خلیل الرحمٰن داؤدی گزشتہ ۵۰ سال سے مخطوطات پر تحقیق کا کام انجام دے رہے ہیں، وہ مخطوطات کے بہت بڑے پارکھ ہیں۔ اُنھوں نے بے شمار مخطوطات

کا تعارف کرایا ہے اور فہرست سازی کی ہے۔

مخطوطہ شناسی کے فن کو جناب خلیل الرحمٰن داؤدی نے درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ان کے متعارفہ خطی نسخوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ یہ مخطوطات عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں ہیں۔

حوالے اور حواشی:

(۱) خلیل الرحمٰن داؤدی سے راقمہ کا انٹرویو، بتاریخ، ۸ر ستمبر ۱۹۹۹ء۔

(۲) ایضاً۔

(۳) داؤدی صاحب کے خودنوشت سوانحی کوائف (غیر مطبوعہ)۔

(۴) رک، حوالہ نمبر ا۔

(۵) ایضاً۔

(۶) رک، حوالہ نمبر ۳۔

(۷) داؤدی صاحب سے راقمہ کا انٹرویو، ۹ر ستمبر ۱۹۹۹ء۔

(۸) ایضاً۔

(۹) رک، حوالہ نمبر ۳۔

رابعہ رضوی

جناب خلیل الرحمٰن داوٗدی کی شخصیت

خلیل الرحمٰن داوٗدی کی شخصیت ایک کھلی کتاب کے مانند ہے، ان کی فصاحت و بلاغت، علم و تجربہ سے ہر عمر، ہر طبقے کا فرد فیضیاب ہو سکتا ہے۔ وہ ایک ایسی متنوع پہلوؤں کی حامل شخصیت ہیں جو گوشۂ گمنامی میں بھی ادب کی خدمت میں سرشار دِکھائی دیتے ہیں۔ توانا جسم کے مالک، بولتے ہیں تو زمانوں کا تجربہ لمحوں میں نچڑ آتا ہے۔ لیکن بولتے بولتے انتہا پر پہنچ کر اچانک سامنے والے کو یہ کہہ کر متوجہ کرتے ہیں، ''میں نے بات کہاں سے شروع کی تھی۔''

وہ ایک درمیانہ قد، مضبوط اعصاب اور مضبوط جسم کے مالک ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ اپنی عمر سے کم دِکھائی دیتے ہیں۔ بہت چھوٹی عمر میں یہ کہہ کر شعر گوئی کو ترک کر دیا کہ وہ غالب یا اقبال نہیں بن سکتے۔ یہ ان کی اٹل قوتِ ارادی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

وقت کی رواں گردش میں ادیبوں، مصنفوں، شاعروں کو ہمیشہ زمانے کی ناقدری کا احساس رہا ہے یا شاید یہ ہمارے معاشرے کا رواج ہے کہ ہم زندوں سے زیادہ مردوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ خلیل الرحمٰن داوٗدی بھی ایسی ہی ناقدری کا شکار نظر آتے ہیں۔ کمرے میں چاروں اطراف سیمنٹ یا پتھر کی دیواروں کے بجائے کتابوں کی دیواریں ہیں، جس کے ایک کونے میں ایک پلنگ پر سرہانے

کتابیں سجائے داؤدی صاحب نوشت و خواند میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آج کل آنکھوں میں موتیا اترنے کے سبب ''نور و ظلمت'' کی کشمکش کا شکار ہیں۔ کوئی بھی ادبی شخصیت جو اپنے زمانے میں فعال رہی ہو اور جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علمی و ادبی خدمت میں وقف کیے رکھا ہو، معذوری کی وجہ سے اس طرح منجمد ہونے سے جس المیے کا شکار ہوتی ہے، اس کا اندازہ عام لوگوں کو نہیں ہو سکتا۔

خلیل الرحمٰن داؤدی ایک ملنسار شخصیت کے مالک ہیں، ملاقاتیوں سے پرتپاک اور جوش سے ملتے ہیں اور ایسا کرتے وقت نہ صرف ان کا بلند آہنگ لہجہ ان کا ساتھ دیتا ہے۔ بلکہ ان کے وجود کا ہر عضو اس پرجوش انداز کی تائید کرتا ہے جو آنے والے کو بتاتا ہے کہ اس نے آ کر غلطی نہیں کی۔ اسی ملنساری کی دوسری بڑی خوبی ان کی مہمان نوازی ہے۔ کسی کے آنے پر وہ اپنے ملازم کو بہت سی ہدایات اوپر نیچے جاری کرتے ہیں اور جب تک وہ کچھ لے نہیں آتا تب تک بے چینی میں معذرت کرتے جاتے ہیں۔ مجھے ان سے ملاقات کے دوران اکثر مشاہدہ ہوا کہ خلیل الرحمٰن داؤدی چائے بناتے جاتے ہیں، ملازم سے چیزیں لانے کی فرمائش بھی کرتے ہیں اور نہ لائے تو خاصے برہم بھی ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے مخصوص بلند لہجے میں تیز تیز گفتگو بھی فرماتے جاتے ہیں۔ سنجیدہ مزاج کے مالک ہیں مگر اس سنجیدگی میں بھی ایک تیکھاپن موجود ہے۔

خلوص، دیانتداری، حوصلہ مندی، صبر و استقلال ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہیں، لیکن ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی زندگی کے بارے میں ان کا مثبت نقطۂ نظر ہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی میں بہت سیر و سیاحت کی اور بہت بھرپور زندگی گزاری۔ یہی چیزیں ان کی شخصیت میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔ زندگی کے کرب انگیز حالات میں بھی ان کا توازن و اعتدال قائم رہتا ہے، ان کی جبین شکن آلود نہیں

ہونے پاتی۔ وہ ایک باذوق سلجھے ہوئے انسان ہیں جو مقام و مرتبہ انہیں آج حاصل ہے، یہ ان کا اپنا پیدا کردہ ہے، مزاج میں استغنیٰ اور بے نیازی ہے۔ باہمہ اور بے ہمہ والی کیفیت ہے۔ تحریر و تقریر میں استدلال ان کی شخصیت کا مرکزی وصف ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے زندگی کے تمام تقاضوں کو تج کر صرف کتابون میں پناہ ڈھونڈ لی ہے، لیکن ایسا نہیں۔ وہ ایک باعمل اور بااصول آدمی ہیں، نظم و ضبط کے بڑے پابند ہیں۔ یہ ان کے خصائص میں سے ایک اہم خصوصیت ہے کہ اصول پر بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔ وہ نہ اصول توڑتے ہیں نہ اصولوں پر مصالحت کرتے ہیں۔ وہ ناراض ہی ان لوگوں سے ہوتے ہیں جو بے اصولی کرتے ہیں۔ بے تحاشا محنت کرنے کے عادی ہیں، کام آہستہ آہستہ کرتے ہیں، لیکن بہت محنت سے کرتے ہیں۔ قدیم مخطوطات پر تحقیق کا کام جس قدر محنت اور لگن سے اُنھوں نے کیا ہے، اس کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ وہ ہر چیز کو بہت سنبھال اور سنوار کر رکھنے کے عادی ہیں۔

ماضی کے واقعات و تجربات ہر انسان کی زندگی کا حاصل ہوتے ہیں اور خاص طور پر جب انسان کا تجربہ پختگی میں ڈھل جائے تو انسان اس پختگی و تجربہ اور اپنے شعور سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور بعض اوقات بہت سے حالات و واقعات انسان کو بہت حساس بنا دیتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن داؤدی اپنی عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں ماضی کے واقعات گاہے بگاہے یاد آتے ہیں اور یادوں کے اس سلسلے میں بہت سے معاصر شاعروں اور ادیبوں کے حالات و واقعات ان کی رواں زبان سے ادا ہوتے جاتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن داؤدی کسی خاص موضوع پر گفتگو کریں یا ہدف تقریر کوئی معاصر شخصیت ہی کیوں نہ ہو، وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیتے ہیں۔ ایسے میں ان کی

چند معاصرانہ چشمکیں بھی سامنے آتی ہیں، جن میں کچھ لوگ ایسے بھی سامنے آتے ہیں، جو ہماری تعلیم و سیاست کے ''خداوند'' سمجھے جاتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن داؤدی ایسی شخصیت ہیں، جنھوں نے ادب کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ وہ علی گڑھ میں سائنس کے طالب علم تھے، لیکن تقسیم کے بعد مکمل طور پر ادیب ہو کر رہ گئے، بہت بے باک اور پراعتماد شخصیت کے مالک ہیں۔ اُنھوں نے مسائل کا بڑی جرأت مندی سے مقابلہ کیا اور آج جو مقام انھیں حاصل ہے، یہ سب اُنھوں نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے اور ہم انھیں بجاطور پر Self-made شخص کہہ سکتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن داؤدی نے جس ماحول میں پرورش پائی، وہ ایسا ماحول تھا، جب تقسیم کی کشاکش جاری تھی۔ ان حالات و مصائب نے ان کو بھی متاثر کیا۔ انھیں اس ہجرت میں جہاں اپنے آباؤ اجداد سے جدا ہونا پڑا، وہاں علی گڑھ جیسی پرشکوہ اور علمی درسگاہ کو چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا۔ وہ سائنس دان بننا چاہتے تھے، لیکن قدرت ان کو ایک سائنسدان کے روپ میں قبول نہ کر سکی۔ اس لیے کبھی کبھی لہجے میں وہ محرومی جھلک جاتی ہے جو ان کے شوقِ پارینہ کا عکس ہے، ان کا کہنا ہے:

میں سائنس دان بننا چاہتا تھا، لیکن مشیتِ ایزدی کو منظور نہ تھا۔ اسی دوران ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان بن گیا۔''(۱)

خلیل الرحمٰن داؤدی ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں۔ ان کی تحریریں ان کے مطالعے کی جھلک پیش کرتی ہیں، وہ لفظ کی حرمت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا طرزِ تحریر ترتیب و تنظیم کے اسی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے، جس میں وہ زندگی گزارتے ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی خلیل الرحمٰن داؤدی کی وسعتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ پر رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''داؤدی صاحب اُردو ادب کی ان شخصیات میں شامل ہیں، جنھوں نے اُردو تحقیق کے میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی شخصیت کا جو پہلو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے، وہ ان کی جامعیت ہے۔ وہ اُردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی پر حاکمانہ دسترس رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے نہ صرف کلاسیکی ادب کا نہایت گہرا مطالعہ کر رکھا ہے، بلکہ جدید ادب سے بھی انھیں اطمینان بخش واقفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ تحقیقی موضوعات پر کچھ لکھتے ہیں، تو قدم قدم پر وسعتِ مطالعہ ان کی معاون ہوتی ہے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے موضوعِ تحقیق پر ہونے والی تمام سابقہ تحقیقات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور ان کی نگاہ ان ان مآخذ تک پہنچتی ہے جن سے ہمارے کم حوصلہ محققین بالعموم محروم رہتے ہیں اور اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ داؤدی صاحب کی وسعتِ مطالعہ حیران کن ہے۔ اس میں پھیلاؤ ہی نہیں گہرائی بھی ہے، مشکل دینی موضوعات سے لے کر علمی، ادبی و تحقیقی موضوعات تک کوئی چیز بھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں۔ اس سب پر مستزاد ان کا غیر معمولی حافظہ ہے جس میں ہزاروں اشعار اور سیکڑوں دلچسپ واقعات اپنی پوری جزئیات کے ساتھ آج بھی محفوظ ہیں۔''(۲)

خلیل الرحمٰن داؤدی نے ایک زمانہ ادب کے دشت میں گزارا ہے اور ان کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ وہ علم و ادب کو ایک سنجیدہ مسئلے کے طور پر لیتے رہے ہیں، اُنھوں نے مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور میں محض تنخواہ وصول کرنے کی غرض سے کام نہیں کیا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ملازمت ان کے لیے ایک ایسے ٹھکانے کی وجہ بنی رہی، جہاں وہ اپنی علمی پیاس کو بھی بجھا سکے اور ادب کی خدمت بھی انجام دے سکے۔ اس ملازمت کے دوران اُنھوں نے متعدد کتب کی تدوین کا فریضہ انجام دیا اور ان پر مبسوط مقدمے تحریر کیے۔

وہ ایک صاف گو انسان ہیں، جو ہر قابل کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ لیکن

غیر علمی اور غیر تخلیقی رویوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ ایسے سچے اور کھرے انسان کا مقدر کنج گمنامی ہے۔ چنانچہ داؤدی صاحب کو بھی یہی انعام ملا ہے۔

جناب خلیل الرحمٰن داؤدی مسلمہ طور پر ایک ثقہ علمی شخصیت ہیں۔ ان کی تحریروں سے گہرائی اور نکتہ رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی مدون کی ہوئی کتابوں کے دیباچوں اور دیگر مضامین اور فیچرز سے ان کے خصائصِ تحقیق بخوبی ظاہر ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں ماہنامہ "فکر و خیال" کے ایڈیٹر شمیم جاوید اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مرتب جناب خلیل الرحمٰن داؤدی ادبی دنیا کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ داؤدی صاحب کے تبحر علمی کے بڑے بڑے محقق معترف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ داؤدی صاحب نے تحقیق کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جہاں ان کے بیشتر ہمعصر نہیں پہنچ سکے۔ اُنھوں نے کلاسیکی کتابوں پر ایسے ایسے پرمغز اور مبسوط مقدمات لکھے ہیں کہ تحقیق کا حق ادا ہو گیا ہے۔"(۳)

کسی محقق یا ادیب کو اس حیثیت سے دیکھنا بھی بے حد اہمیت کا حامل ہوتا ہے کہ وہ محض بنے بنائے راستوں پر گامزن ہے یا مخفی پگڈنڈیوں سے اپنے لیے راستہ تلاش کر کے نئی راہوں کو دریافت کرتا ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کے ہاں محض معلوم حقائق کی صدائے بازگشت نہیں بلکہ اُنھوں نے اُردو کی تحقیق و تنقید کے سرمایہ میں متعدد قابلِ قدر اضافے بھی کیے ہیں۔ اس حوالے سے وہ ہمیں عصرِ حاضر کے دیگر محققین میں منفرد دِکھائی دیتے ہیں۔

کسی ادیب، نقاد یا محقق کی شخصیت کا ایک پہلو اس بات میں بھی پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ خود کو عام زندگی میں کس طرح نمایاں کرتا ہے۔ کیا وہ محض اپنی تحریروں میں سے خود کو منعکس کرنا چاہتا ہے یا مختلف ذرائع ابلاغ کا سہارا لے کر اپنے آپ کو نمایاں

کرنا چاہتا ہے، اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ہمیں خلیل الرحمٰن داؤدی کی شخصیت کا ایک عجیب رُخ معلوم ہوتا ہے، اُنھوں نے خود کو ذرائع ابلاغ کے حوالے سے کبھی مشروط نہیں کیا بلکہ ان کی شخصیت اس بات کو ترجیح دیتی ہے کہ وہ کُنجِ گمنامی میں بیٹھ کر علم کی توسیع کا فریضہ انجام دیتے رہیں، ایسی شخصیات کی زندگی ان کی تحریروں میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ داؤدی صاحب نے بھی اسی اسلوب سے اپنی ادیبانہ اور محققانہ زندگی کے لیے وقار و اعتبار کا سامان فراہم کیا ہے۔

خلیل الرحمٰن داؤدی کی ریڈیائی تقاریر اور فیچرز کو اگر ایک نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی نظر زندگی کی وسعتوں پر تھی۔ ان تقریروں اور فیچروں کے ذریعے اُنھوں نے اپنے ماحول اور معاشرہ پر اصلاحی نظر ڈالی اور تہذیب و معاشرت کے بہت سے ان دیکھے پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔

خلیل الرحمٰن داؤدی کی شخصیت دو حصوں میں منقسم دِکھائی دیتی ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جس میں اُنھوں نے اپنی ادبی زندگی تنقید و تحقیق اور معاصرانہ چشمک میں گزاری اور دوسرا حصہ فہرست سازی اور مخطوطات کی تدوین ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جو ان کی شخصیت کو فعال بناتا ہے اور بقول خود ان کے وہ اپنی شخصیت کی پہچان کا حوالہ صرف اپنے مخطوطات کو کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ مخطوطات کی تحقیق کا جو کام اُنھوں نے کیا اس کا اعتراف ملکی سطح پر بہت کم کیا گیا ہے۔ لیکن بیرونی ممالک خصوصاً عربی ممالک میں ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اسی اہمیت کی بنا پر مختلف عربی ممالک نے مخطوطات کی اس گراں قدر تحقیق کی بدولت انہیں کئی اعزازات سے نوازا ہے۔ ان کی تحقیق ہی ان کی اصل پہچان ہے اور ان کی یہی تحقیقی کاوش انھیں ایک بلند مرتبہ بھی عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی خلیل الرحمٰن داؤدی کی تحقیق کے حوالے سے یوں رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''داؤدی بنیادی طور پر محقق ہے۔ خصوصاً کتابیات کے سلسلے میں ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اسی کو اُنھوں نے کاروبار بنایا۔ قدیم قلمی کتابوں اور نادر مطبوعات کے سلسلے میں ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ تحقیقی اعتبار سے اُنھوں نے جو چند کتابیں ترتیب دیں وہ مجلس ترقیٔ ادب سے شائع ہوئیں۔ متن کی تصحیح میں اُنھوں نے خاص رنگ پیدا کیا۔ علاوہ ازیں کتابوں کے جو دیباچے لکھے ان میں اپنی وسیع معلومات اور محققانہ بالغ نظری سے بعض گتھیوں کو سلجھایا۔ اگر وہ پوری طرح تحقیق پر آتے تو قاضی عبدالودود کے بعد اُردو کے اہم محققین میں شمار ہوتے۔''(۴)

خلیل الرحمٰن داؤدی کے علم وفن کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جناب خلیل الرحمٰن داؤدی علم و ادب کا وہ روشن ستارہ ہیں، جس کی روشنی سے علم و ادب کے گھر آنگن منور ہو جاتے ہیں۔ اُنھوں نے جتنے تحقیقی کام کیے، اُن سے اُردو ادب میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ بہت کام کر سکتے تھے، لیکن ستم ہائے روزگار کا شکار رہے اور ان کی وہ کتابیں تیار نہ ہو سکیں جن کا اُنھوں نے منصوبہ بنایا تھا۔ قدیم تذکرے، دواوین اور مثنویات جو مجلس ترقیٔ ادب لاہور سے شائع ہوئی ہیں، ان کے علم کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان کا حافظہ کمال کا ہے۔ جتنی دیر بولتے ہیں، علم و ادب کے موتی زبان سے جھڑتے رہتے ہیں۔ مخطوطہ شناس ایسے ہیں کہ شاید ہی کوئی دوسرا اس وقت پاکستان میں موجود ہو۔ اُردو، فارسی، عربی کی قلمی کتابوں کے ایسے پارکھ ہیں کہ ذرا سی دیر میں گندم کو بھوسے سے الگ کر لیتے ہیں۔''(۵)

خلیل الرحمٰن داؤدی کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ جس موضوع پر لکھنا چاہتے ہیں، کوشش کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اس وقت تک دُنیا بھر میں جو کچھ لکھا جا چکا ہو، وہ ان کے مطالعے سے گزر جائے اور وہ اس موضوع پر مزید اضافے کر سکیں۔ ترتیب

متن کے تمام ممکن الحصول نسخوں تک رسائی ہو جائے یا مصنف کا اپنا متن دریافت ہو جائے مختلف نسخوں میں اختلافِ متن کی وضاحت کو وہ نہایت ضروری خیال کرتے ہیں اور تازہ معلومات کی روشنی میں اپنے نتائج تحقیق کی اصلاح و ترمیم کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کے اسلوب کار کو واضح کرنے کے لیے یہ واقعہ بیان کرنا کافی ہوگا۔ ان کی کتاب ''اگرگل'' چھپ کر پریس سے آ گئی تھی۔ خلیل الرحمٰن داؤدی اس کتاب کے مقدمے میں فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ عاصی کی تصنیف ہے یا ناصر کی یہ مقدمہ لکھتے وقت تذکرہ خوش معرکہ زیبا مصنفہ سعادت خاں ناصر، انھیں نہیں ملا تھا۔ جب ''اگرگل'' چھپ کر آئی تو تاج صاحب نے بتایا کہ مشفق خواجہ صاحب کا مرتبہ ''تذکرہ خوش معرکہ زیبا'' آ گیا ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے دیکھا تو اس میں ''اگرگل'' کا مصنف ناصر درج تھا، چنانچہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے فوراً ''پسِ طباعت'' کے عنوان سے ایک چٹ چھپوا کر مقدمہ کے آخر میں لگوا دی کہ کتاب کے چھپ جانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تحریر سعادت خاں ناصر کی ہے۔ اس واقعہ سے حقیقت تک رسائی کے لیے ان کی ان تھک محنت، کاوش اور احتیاط پسندی کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

خلیل الرحمٰن داؤدی دوہری شخصیت کے مالک نہیں بہت اصول پرست انسان ہیں، وقت کے پابند اتنے ہیں کہ اگر کوئی وقت پر ملنے نہ آئے تو اس شخص سے ملاقات پر اسے جاتے دم تک اس بات کا احساس دِلاتے رہتے ہیں کہ وہ وقت کا پابند نہیں۔ ایک ادبی اور تحقیقی شخصیت کے علاوہ وہ ایک شفیق باپ اور محبت کرنے والے دادا بھی ہیں۔ وہ ایک ذمہ دار سربراہِ خاندان ہیں۔ ان کی ادبی اور محققانہ اہمیت کا کچھ اندازہ ان کے بچوں کو بھی ہے۔ چنانچہ ان کے بیٹے شقائق النعمان داؤدی خلیل الرحمٰن داؤدی کی شخصیت کے متعلق کہتے ہیں:

''ان کے ادبی تأثرات آنے والے برسوں میں مزید ابھر کر سامنے آئیں

گے اور ان کی ادبی تحقیق دیر تک زندہ رہے گی۔''

خلیل الرحمٰن داؤدی علم و ادب کا سمندر اپنے سینے میں سمیٹے گوشۂ تنہائی میں بیٹھے صدف و گوہر ضرورت مندوں کو بانٹتے رہتے ہیں، لیکن اپنے گراں قدر تحقیقی کارناموں کے باوجود دنیاوی ادبی اعزازات سے محروم ہیں، ان کا کہنا ہے:

''خوشامد اور تملق میرا شیوہ نہیں، اس لیے مجھے کوئی ادبی اعزاز کیوں ملتا۔ جنھیں اپنی عزتِ نفس کی پاسداشت ہوتی ہے وہ اعزازات و انعامات کے لیے دریوزہ گری نہیں کرتے۔ میں نے ہر علمی خدمت کے لیے ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا'' کو پیشِ نظر رکھا ہے۔''(٦)

غرض خلیل الرحمٰن داؤدی سدابہار اور فیض رساں شخصیت کے مالک ہیں، جن کے فیضانِ تحریر سے حال کی طرح استقبال بھی مستفید اور متمتع ہوتا رہے گا۔

حوالے اور حواشی:

(۱) خلیل الرحمٰن داؤدی سے راقمہ کا انٹرویو، بتاریخ ۴ر جولائی ۱۹۹۹ء

(۲) پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی سے گفتگو، مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۹ء (بمقام لاہور)

(۳) شمیم جاوید، فکر و خیال (ماہنامہ) اکتوبر، نومبر ۱۹۶۷ء، ص ۸۰

(۴) ڈاکٹر وحید قریشی سے گفتگو، مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۹۹ء، بمقام لاہور

(۵) ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتوب بنام راقمہ، محرّرہ ۸ر اکتوبر ۱۹۹۹ء

(٦) خلیل الرحمٰن داؤدی سے راقمہ کا انٹرویو، بتاریخ ۸ر ستمبر ۱۹۹۹ء

گفتگو: ڈاکٹر وحید قریشی

تحریر: جعفر بلوچ

کچھ داؤدی صاحب کے بارے میں

جناب خلیل الرحمٰن داؤدی کو میں نے شاید پہلی بار لاہور میں فٹ پاتھوں پر پرانی کتابیں بیچنے والوں کے ہاں دیکھا تھا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہوگی۔ میں اس زمانے میں تاریخ کا لیکچرار تھا۔ اور اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ پنجاب یونیورسٹی میں داخل کرنے کے بعد اسلامیہ کالج گوجرانوالہ چلا گیا تھا۔ وہیں میں نے ڈی لٹ کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرحسن میرا موضوع تھا۔ ان دنوں فٹ پاتھوں پر پرانی کتابیں بکثرت ملتی تھیں۔ شاید ہندوؤں کے جانے کے بعد اس کاروبار میں کچھ تیزی آ گئی تھی۔ میں ہفتہ کے روز لاہور چلا آتا اور اتوار کو گوجرانوالہ واپس جاتا۔ اس دور میں پرانی کتابوں کے جن شائقین سے میری ملاقاتیں فٹ پاتھوں پر ہوئیں، اُن میں احسان دانش اور عبدالرحمٰن چغتائی کے نام خصوصاً اہم ہیں۔

انھی حضرات میں داؤدی صاحب بھی شامل تھے۔ لیکن اس وقت تک ان سے میرا تعارف نہیں ہوا تھا۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں، میں اسلامیہ کالج لاہور آ گیا۔ اور غالباً اس زمانے سے داؤدی صاحب سے میرے روابط بڑھے۔ وہ نکلسن روڈ پر ٹیگور پارک میں رہتے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی گل داؤدی ان کی گود میں ہوتی تھی۔ اُنھوں نے میرحسن کے بارے میں کئی چیزیں مجھے عنایت کیں۔ ان کے مزاج میں اس وقت بھی شدت تھی، اور شاید وہ اس زمانے میں بھی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔(۱) بہت جلد غصے میں آ جاتے تھے۔ کسی مسئلے پر رائے زنی کرتے تو ان کے انداز میں تحکم کی جھلک

ہوتی تھی۔ ممتاز حسن اور امتیاز علی تاج سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ممتاز حسن جب بھی کراچی سے لاہور آتے تھے، اپنے چھوٹے بھائی نسیم حسن کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ لیکن وہ زیادہ وقت داؤدی صاحب کے ساتھ گزارتے تھے۔ نسیم حسن صاحب سے میری بھی قرابت داری تھی۔ وہ رشتے میں میرے پھوپھا تھے۔ لاہور میں قیام کے دوران میں ممتاز حسن صاحب اکثر داؤدی صاحب کے ساتھ رات کو گیارہ بجے کے قریب میرے ہاں آجایا کرتے تھے اور پھر دیر تک نشست رہتی تھی۔ میں مجلس ترقیٔ ادب کی گورننگ باڈی کا بھی ممبر تھا۔ چنانچہ داؤدی صاحب سے امتیاز علی تاج کے ہاں بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ عابد علی عابد ان دِنوں "صحیفہ" کے ایڈیٹر تھے۔ ان سے بھی انہیں دِنوں میرے مراسم بڑھے۔

داؤدی صاحب نے مجلس کے لیے بعض کتابیں بھی ایڈٹ کیں۔ مجلس نے ان سے بعض نادر کتابیں خرید بھی کیں۔ ان معاملات میں تاج صاحب میری رائے بھی لیتے تھے اور میری رائے پر بہت اعتماد کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ داؤدی صاحب سے میرے مراسم اتنے بڑھ گئے کہ بعض اداروں کو کتابیں دیتے وقت بعض اوقات وہ میری رائے بھی لکھوا لیتے تھے۔ مثلاً داؤدی صاحب نے نیشنل میوزیم کراچی کو پنجابی زبان و ادب کی جو کتابیں دیں، ان کے نوٹس مجھ سے لکھوائے تھے۔ کتاب شناسی کے حوالے سے داؤدی صاحب میں تین باتیں اہم تھیں۔ ایک تجربہ کہ وہ جس موضوع پر کام کرتے تھے۔ اس کے پورے مآخذ (Sources) کھنگال ڈالتے تھے اور پھر ایسے ایسے نکتے نکال لیتے تھے کہ ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ تحقیق میں قاضی عبدالودود کی طرح انتہاپسند تھے۔ کچی تحقیق اور ثانوی مآخذ پر مبنی مضامین انہیں سخت ناپسند تھے اور اس اصول کو اُنھوں نے اپنی مرتبہ کتابوں میں بھی ملحوظ رکھا ہے۔ تیسری بات یہ کہ بعض محققین کی تحقیق کے کھوکھلے پن کو وہ شدت

سے محسوس کرتے تھے اور بلڈ پریشر کی وجہ سے وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بڑی شد و مد سے کرتے تھے۔ اس صاف گوئی کی وجہ سے ان کے بعض دوست بھی ان کے دشمن بن جاتے تھے، لیکن داؤدی صاحب اس کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔

داؤدی صاحب علمی و ادبی کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان سے تعاون کرنے میں بہت فراخ دل تھے۔ وہ ملنے جلنے والے اہلِ علم کو قیمتی کتابیں اکثر بطور تحفہ دیتے رہتے تھے اور کوئی کسی موضوع پر کام کر رہا ہوتا تو اس پر داؤدی صاحب کی سخاوت کی بارش اور زیادہ ہوتی تھی۔ وہ کتابوں کی فروخت کا تعلق انداز سے نہیں بلکہ صرف اداروں سے رکھتے تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ کیا۔ اداروں کو کتابوں کی فروخت کے حوالے سے بھی میرا داؤدی صاحب سے خاصا گہرا تعلق رہا۔ میں پنجاب پبلک لائبریری کی گورننگ باڈی کا بھی سیکرٹری رہا اور اس حیثیت سے کتابوں کی خرید کا جملہ کام میرے سپرد تھا۔ لاہور میوزیم ایکوزیشن کمیٹی کا میں تیس برس ممبر رہا۔ کچھ عرصہ میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی کمیٹی کا چیئر مین بھی رہا۔ اسی طرح مجلس ترقیِ ادب اور ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے لیے بھی کتابیں خریدنے کے مواقع مجھے حاصل رہے۔ کتابوں کی خرید کے ان معاملات، وسائل میرا داؤدی صاحب سے تحقیقی موضوعات پر بھی اکثر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں کتابوں کے بارے میں داؤدی صاحب کی معلومات سے میں نے بھی فائدہ اُٹھایا۔ قلمی کتابوں کی کتابت، روشنائی اور کاغذ کے بارے میں حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے بعد میں داؤدی صاحب کی رائے کو حتمی تصور کرتا تھا۔ افسوس کہ اس موضوع پر اُنھوں نے تفصیل اور اختصاص کے ساتھ کچھ نہیں لکھا اور اس علم کو وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ انہیں اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ اُردو کے محقق عام طور پر یک فنے ہوتے ہیں اور اُردو کے سوا دوسری زبانوں میں ان کی استعداد عموماً نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اور یہ چیز تحقیق و تنقید اور دیگر علمی و ادبی کاموں میں ان کی کمزوری کو

ظاہر کرتی ہے۔ داؤدی صاحب کو عربی اور فارسی زبانوں پر جو عبور حاصل تھا، اس کی وجہ سے قدیم اُردو ادب کے بارے میں ان کی تحقیق صحیح اور صائب ہوتی تھی۔ تاہم ان کی چھپی ہوئی کتابیں ان کے علم کا بہت تھوڑا حصہ ظاہر کرتی ہیں۔ کاش وہ اُردو تحقیق میں زیادہ کام کر جاتے، لیکن ان کے مزاج کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ جم کر کام نہیں کرتے تھے۔ جم کر بیٹھنے سے زیادہ گھومنے پھرنے کے دلدادہ تھے اور اسی گھومنے پھرنے میں ان کا زیادہ وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ لکھنے سے زیادہ بولنے کا شوق ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ بعض محققین کا اندازِ تحقیق ان کی گفتگو کا دل پسند موضوع ہوتا تھا اور وہ اپنی محفلوں میں ان کے علم کی سطحیت کو بے نقاب کرتے رہتے تھے۔ گفتگو کے اس چسکے نے انہیں اطمینان سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بایں ہمہ وہ جو کچھ کر گئے ہیں۔ وہ علمی و ادبی حوالے سے قابلِ قدر ہے۔ خصوصاً اپنی مرتب کردہ کتابوں پر ان کے دیباچے بہت اچھے اور فاضلانہ ہیں۔ غالباً ۶۵-۱۹۶۴ء میں اُنھوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کی مطبوعات کی فہرست مرتب کرنی شروع کی اور کئی برس اس میں کھپا دیئے۔ میں پچھلے سال ٹانگ کے آپریشن کے سلسلے میں ہسپتال میں داخل تھا تو وہ میری مزاج پرسی کے لیے آئے اور اُنھوں نے بتایا کہ ۱۸۵۷ء سے قبل کی مطبوعات کے بارے میں وہ اپنا کیٹلاگ (Catalogue) مرتب کر چکے ہیں جو اشاعت کے لیے تیار ہے۔ میری فرمائش پر اُنھوں نے وعدہ کیا کہ اس کتاب کا مسودہ وہ پاکستان اُردو اکادمی کو اشاعت کے لیے دیں گے۔ یہ مسودہ شاید چار پانچ سو صفحات پر پھیلا ہوا تھا اور مکمل تھا۔ چند روز کے بعد مجھے ہسپتال ہی میں ان کے انتقال کی خبر ملی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

حواشی:

(۱) خلیل الرحمٰن داؤدی کبھی بھی بلڈ پریشر کے مریض نہیں رہے۔ [شقائق النعمان]

ڈاکٹر عارف نوشاہی

مخطوطات کے لیے خلیل الرحمٰن داؤدی کی خدمات☆

خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب کو ہم سے جدا ہوئے آج ٹھیک چالیس دن گزر چکے ہیں اور اس اجتماع کی معنویت بڑھ گئی ہے۔ میرے لیے ان کی اچانک وفات کو باور کرنا اور اس سے پیدا ہونے والے خلا کے نقصانات سے نمٹنا دو طرح سے مشکل ہو رہا ہے۔ ایک تو ان سے گذشتہ بیس پچیس سال سے تعلقِ خاطر تھا جس میں کمی کبھی نہیں آئی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلق گہرا ہوتا چلا گیا۔ دوسرا یہ کہ میں ان کی وفات سے چند ہی روز پہلے اسلام آباد سے لاہور آ کر ان سے مل چکا تھا اور یہ ملاقات زندگی کی گرم جوشی اور رونق سے معمور تھی۔ آخری بار تیرہ جنوری کو ان سے فون پر بات ہوئی تو معمول کی لحن داؤدی موجود تھی۔ تیرہ دن بعد یکا یک چھبیس جنوری کی صبح اُن کی وفات کی خبر سننا میری لیے ناقابلِ یقین بھی تھا اور صدمہ انگیز بھی۔ یہ خبر میں نے گورڈن کالج میں سنی اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس روز مجھ سے صدمے اور ملال سے کلاس میں کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ المیہ یہ تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے سالِ اوّل کے طالب علموں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو داؤدی صاحب کو جانتا ہو اور میں ان کا نام لے کر اپنے غم کا اظہار کر سکتا اور اپنے دُکھ کا بوجھ ہلکا کرتا۔ میں نے طالب علموں کو کلاس سے جلد فارغ کر کے تنہا یہ صدمہ برداشت کرنے کی ناکام کوشش کی۔

اس اجتماع میں تشریف فرما سبھی احباب داؤدی صاحب کے نام اور کام سے

خوب واقف ہیں اور آج مجھے اپنے دل کی بات کرنے میں آسانی ہو گی۔ اس طرح
کے تعزیتی جلسوں میں ہم بچھڑنے والے کے بارے میں اپنے قلبی تاثرات، احساسات
اور خوشگوار یادیں بیان کر سکتے ہیں اور چونکہ ہمیں ''اذکروا امواتکم بالخیر '' کی
تلقین بھی موجود ہے، لہٰذا میں اپنے بیانات داؤدی صاحب کے اعلیٰ علمی اخلاق اور
اپنے حق میں ان کی نیکیوں کے ذکر سے مزین کروں گا اور آخر میں ایک اور اہم موضوع
کی طرف بھی آپ کی توجہ دلاؤں گا۔

میں ۱۹۷۴ء میں کتاب خانۂ گنج بخش مرکز تحقیقاتِ فارسی ایران و پاکستان
راول پنڈی (اب اسلام آباد) سے وابستہ ہوا اور اس کے بعد ہی کسی وقت داؤدی
صاحب سے تعارف ہوا جب وہ اس کتب خانے کے لیے مخطوطات لایا کرتے تھے۔ یہ
سلسلہ ۱۹۷۸ء میں ایران میں اسلامی انقلاب تک برقرار رہا۔ اس کے بعد کتب خانے
نے کئی سال تک کتب کی خریداری موقوف رکھی اور ادھر داؤدی صاحب نے اپنی توجہ
فارسی مخطوطات سے ہٹا کر عربی مخطوطات کی طرف کر لی۔ لیکن ۱۹۸۳ء میں جب ایرانی
ادارے نے دوبارہ کتب کی خریداری شروع کی تو میں نے داؤدی صاحب سے ان کے
جمع شدہ فارسی مخطوطات اور نادر مطبوعات کا سارا ذخیرہ مرکز کے لیے خرید لیا۔ پاکستان
میں اس وقت پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے علاوہ مخطوطات کے جو دو بڑے ذخائر موجود
ہیں، یعنی قومی عجائب گھر پاکستان کراچی اور کتابخانۂ گنج بخش، اسلام آباد، ان میں
مخطوطات کی بہت بڑی تعداد داؤدی صاحب ہی کی فراہم کردہ ہے۔ وہ یہاں لاہور
عجائب گھر کو بھی قلمی نسخے مہیا کرتے رہے اور قومی ادارۂ تحفظ دستاویزات (نیشنل
آرکائیوز آف پاکستان) اسلام آباد کے ہاں بہت سا مواد داؤدی صاحب ہی کا فراہم
کیا ہوا ہے اور وہاں یہ ذخیرہ انھی کے نام سے منسوب ہے۔ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ
قیام پاکستان کے بعد جب یہاں مخطوطات اور دستاویزات جمع کرنے کے لیے نئے

ادارے قائم ہوئے تو داؤدی صاحب ان کی آبیاری کرنے میں پیش پیش تھے۔ داؤدی صاحب کا خواب پاکستان میں قومی مرکز مخطوطات قائم کروانے کا تھا اور وہ بتایا کرتے تھے کہ وزارتِ ثقافت میں اپنے علم دوست وفاقی سیکرٹری کی وساطت سے حکومتِ پاکستان سے اس مقصد کے لیے ایک کروڑ روپے کی گرانٹ بھی مختص کروا لی تھی چونکہ ہمارے ہاں حکومتیں بدلنے سے پچھلے سارے منصوبے کالعدم ہو جاتے ہیں، اس لیے یہ خواب بھی تبدیلیٔ حکومت کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اگر یہ مرکز قائم ہو جاتا یا اب بھی قائم ہو جائے تو ہم اپنے اسلاف کے باقی ماندہ علمی ذخیرے کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر سکتے ہیں۔

میں نے لاہور میں مولوی شمس الدین مرحوم (متوفی ۱۹۶۸ء) کو تو نہیں دیکھا(۱) لیکن چوک انارکلی مسلم مسجد کے نیچے ان کی دکان پر جانے والے بزرگوں مثلاً شرافت نوشاہی مرحوم، حکیم محمد موسیٰ امرتسری مغفور اور دیگر معاصرین سے سنا ہے کہ مولوی صاحب کی دکان صرف کتاب فروشی کا مقام نہ تھی بلکہ مولوی صاحب کی علمی معلومات اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے اطراف و اکناف کے علماء و فضلا کی مستقل نشست گاہ تھی۔ جب متلاشیانِ کتب ہر جگہ سے مایوس ہو کر مولوی صاحب کے پاس جاتے تو وہ خاطر داری بھی کرتے اور اپنی گرہ سے محققین کی مطلوبہ کتب کی جلدیں بنوا کر انھیں تحفتہً بھی پیش کرتے۔ کچھ یہی صورتِ حال میں نے داؤدی صاحب کے ہاں دیکھی، وہ آنے والوں کی خوب مہمان نوازی بھی کرتے بلکہ ساتھ ساتھ اپنے ملازم کی فہمائش بھی کرتے رہتے کہ تواضع کے لیے فلاں چیز کیوں نہیں لائے، جاؤ لے کر آؤ۔ اور مہمانوں کی علمی حاجت روائی بھی کرتے۔ داؤدی صاحب ہمارے محققین کے اس طبقے سے تھے، جو عربی، فارسی اور اُردو ادب کے مآخذ پر بیک وقت نظر رکھتے ہیں۔ اس دور میں برِعظیم میں ایسے جامع الالسنہ محقق انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ سو داؤدی صاحب کے

پاس تینوں زبانوں کے اساتذہ، محققین اور طلبہ رجوع کرتے اور وہ ان کی رہنمائی فرماتے بلکہ اپنے خاص دوستوں کو ان کی ضرورت کے مطابق اپنے مخطوطات بھی بلا قیمت پیش کر دیتے۔ اِس دور میں جب کہ مطبوعہ کتب خرید کر تحفتہً دینے میں بھی بار محسوس ہوتا ہے، داؤدی صاحب کا قیمتی مخطوطات کا کام کرنے والوں کی نذر کر دینا ان کی علم پروری اور فراخ دلی کی نشانیاں ہیں۔ مجھ پر ان کی خصوصی مہربانی تھی اور مخطوطات کے معاملے میں بڑا اعتماد تھا۔ اگر ان کے پاس سلسلۂ نوشاہیہ کے کسی مصنف یا کاتب کا کوئی مخطوطہ آتا تو وہ بن مانگے ہی اس پر اپنے دستخط ثبت کر کے مجھے بھیج دیتے۔ میرے پاس عمر بخش نوشاہی رسول نگری کی پنجابی تصنیف آبِ حیاتی اور محمد ہاشم تھرپالوی کی مفتاح العلاج کا قلمی نسخہ جو ایک نوشاہی کاتب کا لکھا ہوا ہے، داؤدی صاحب کی اسی فیاضی کی یادگاریں ہیں۔

داؤدی صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی کتب خانے کو مخطوطات فراہم کرنے سے پہلے ہر مخطوطے پر ایک تعارفی نوٹ لکھتے تھے جس میں کتاب کا نام، مصنف کے مختصر حالات، کتاب کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ ہونے کی نشاندہی اور اس کتاب کے دیگر معلومہ نسخوں کی تفصیل اور ان نسخوں میں اپنے نسخے کا مقام اور اپنے مآخذ کا نام لکھتے۔ ان کے پاس اس کام کے لیے حوالے کی بنیادی کتب موجود تھیں اور وہ بڑی محنت سے نوٹس تیار کر کے مخطوطات کے ساتھ لگاتے اور کتب خانوں کو بھیجتے۔ ان نوٹس کی ایک نقل اپنے پاس بھی محفوظ رکھتے۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے اسی نوعیت کے کثیر التعداد نوٹس ان کے پاس دیکھے تھے جن کے ساتھ یہ وضاحت بھی موجود تھی کہ یہ مخطوطات کس کتب خانے کے حوالے کیے گئے۔ اگر یہ کاغذات اب بھی موجود ہوں تو ہمیں ان کی اشاعت کا اہتمام کرنا چاہیے مثلاً اورینٹل کالج میگزین یا مجلہ تحقیق کا ایک شمارہ اس کے لیے مختص کر دینا چاہیے۔ ان یادداشتوں کی اشاعت سے دوگونہ فائدہ ہوگا۔ ایک تو داؤدی

صاحب کی محنت اور نسخہ شناسی میں مہارت سامنے آئے گی، دوسرا ہزاروں کی تعداد میں ایسی کتابوں اور نسخوں کے کوائف اہلِ علم کو مہیا ہو جائیں گے جو اس وقت پاکستان یا پاکستان سے باہر کے کتب خانوں میں چلے گئے ہیں اور ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ ہمارے آبا کی یہ کتابیں اور علم و حکمت کے یہ خزانے کہاں غریب الوطن ہیں۔ جب بیس سال پہلے مرکز تحقیقاتِ فارسی پاکستان میں موجود فارسی مخطوطات کا یونین کیٹلاگ تیار کروا رہا تھا تو اس زمانے میں میں نے داؤدی صاحب کے ہاں دستیاب فارسی مخطوطات کی فہرست تیار کر لی تھی جو بعد میں احمد منزوی نے فہرست مشترک نسخہ ہاے خطی فارسی پاکستان کی چودہ جلدوں میں شامل کر لی۔ بھلے آج وہ مخطوطات داؤدی صاحب کے ہاں دستیاب نہیں ہیں اور مختلف کتب خانوں کو جا چکے ہیں، لیکن اتنا تو ہوا کہ ہم سیکڑوں گمنام کتابوں، مصنفوں اور کاتبوں کے ناموں سے واقف ہو گئے۔ ابنِ ندیم (م ۳۷۸ھ) نے جلد سازوں، کاغذ بنانے والوں اور کتب فروشوں کے ہاں جا کر کتابوں کے بارے میں معلومات جمع کی تھیں۔ تب کہیں اس کی معرکہ آراء کتاب ''الفہرست'' مرتب ہوئی۔ ابنِ ندیم کی متعارف کردہ بیشتر کتب آج موجود نہیں ہیں لیکن اس سے الفہرست کی اہمیت کم نہیں ہوئی بلکہ مزید بڑھ گئی ہے، کیوں کہ صدر اسلام کی تصنیفی سرگرمیوں اور علماء کے طبقات و اصناف سے واقفیت کا یہی ایک قابلِ اعتماد ماخذ ہے۔

داؤدی صاحب بتایا کرتے تھے کہ کسی مخطوطے پر محض یہ ایک سطری جملہ لکھنے کے لیے کہ ''اس کتاب کا کوئی اور نسخہ دستیاب نہیں ہے'' اُنھیں ہفتوں، مہینوں بیسیوں حوالے کی کتب دیکھنا پڑتی تھیں۔ اور جب تک وہ مطمئن نہ ہوتے تھے، نہ اپنا نوٹ لکھتے تھے نہ نسخہ فروخت کے لیے پیش کرتے تھے۔ فارسی مخطوطات کی حد تک میں جانتا ہوں کہ وہ جب اپنے ہاں کی تمام حوالہ جاتی کتب دیکھ چکتے اور خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی تو مزید اطمینان کے لیے نسخے کے اوّل و آخر کے اوراق کے عکس بنوا کر یا خود

نسخے ہی مجھے بھیج دیتے تاکہ میں اپنے ہاں دستیاب مآخذ کی مدد سے کتاب اور مصنف کی شناخت میں ان کی معاونت کروں۔ افغانستان پر روسی حملے اور بعد میں خانہ جنگی کے باعث جب وہاں سرکاری اور نجی کتب خانوں کے قلمی نسخے لٹ کر پاکستان پہنچے تو اس میں کثیر تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو وسطی ایشیا اور خراسان میں تصنیف ہوئی تھیں اور ان کی فہرست سازی نہ ہونے کی وجہ سے گمنام پڑی تھیں۔ ایسی کتابوں اور ان کے مصنفین کا برصغیر یا یورپ کی متداول فہرستوں میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس لیے داؤدی صاحب ایسے غیر متعارف مخطوطات یا ان کی فوٹو کاپی استفسار کی غرض سے مجھے بھیجتے تو خود میرے لیے فارسی ادب کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے ایک نئی دُنیا کا انکشاف ہوتا۔ داؤدی صاحب کا منشا اپنے نسخے کی قدر و قیمت متعین کرنا ہوتا تھا لیکن اس کے پہلو بہ پہلو مجھے جو شاندار علمی فوائد حاصل ہوتے رہے، اس کا اعتراف کرنے میں مجھے یہاں کوئی باک نہیں ہے۔ میں نے داؤدی صاحب کے فراہم کردہ ایسے مخطوطات پر جو مفصل مقالے لکھے اور ایران میں شائع ہوئے جسے میں اپنا ایسا علمی اندوختہ سمجھتا ہوں اس کا ذکر یہاں مثال کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔

غالباً ۱۹۹۷ء میں داؤدی صاحب نے ایک ضخیم قلمی نسخہ مجھے بھیجا۔ کتاب کا نام ''مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف'' اور مصنف کا نام سیف جام ہروی مقدمے سے معلوم تھا لیکن داؤدی صاحب اس کتاب اور مصنف کے بارے میں مزید جاننا چاہتے تھے۔ میں اس کتاب کے نام سے پہلے متعارف ہو چکا تھا۔ جب ۱۹۹۱ء میں دہلی سے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے ''غزلہای حافظ بر اساس مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف از سیف جام ہروی ہم عصر حافظ'' شائع کی۔ میں نے داؤدی صاحب سے کہا کہ جب تک ڈاکٹر نذیر احمد کی کتاب سامنے نہ ہو اس نسخے کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید اس کی پروا نہ کرتا، لیکن داؤدی صاحب چونکہ بنیادی طور پر محقق

تھے، اُنھوں نے یہ کتاب حاصل کرنے کی ٹھانی اور اپنے ذاتی ذرائع استعمال کرتے ہوئے، کوئی چھے ماہ کی تگ و دو کے بعد دہلی سے اپنے عزیزوں کی وساطت سے کتاب منگوانے میں کامیاب ہو گئے اور اس کا نسخہ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ اتمامِ حجت ہو گیا ہے اب تم اپنی تحقیق پیش کرو۔ میں نے اس کتاب اور داؤدی صاحب کے نسخے کی اہمیت پر ایک مفصل مضمون فارسی میں لکھا اور تہران سے چھپوا کر(۲) اس کی کاپی مع مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف کے اصل نسخہ کے داؤدی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی اور ان سے درخواست کی کہ اس مخطوطے کو پاکستان ہی میں کہیں محفوظ کروائیں کیونکہ یہ نسخہ جس کتب خانے میں بھی جائے گا، اس کا سرمایۂ افتخار ہو گا۔

اب اس نسخے کی اہمیت کا حال سنیے: ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ اُنھوں نے بہت پہلے مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف کے دو نسخوں برٹش میوزیم (ناقص نسخہ) اور کابل یونیورسٹی کے روٹوگراف کی مدد سے جو آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لیے حاصل کیے گئے تھے، اپنے نوٹس تیار کیے تھے اور جب ۱۹۹۰ء میں وہ اپنا مسودہ شائع کرنے لگے تو لائبریری میں روٹوگراف دوبارہ دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن عکس لائبریری سے نہ مل سکا۔ اس کی مائیکروفلم وہ ایک ایرانی محقق کو دے چکے تھے اور ادھر کابل یونیورسٹی سے یہ اطلاع ملی تھی کہ وہاں کا نسخہ بھی غائب ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ''آن دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مرد'' جیسی صورتِ حال سے دوچار تھے۔(۳) داؤدی صاحب کا نسخہ دراصل کابل یونیورسٹی کا وہی گم شدہ نسخہ ہے۔ یہ کتاب فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں ہندوستان میں مرتب ہونے والا قدیم ترین انتخابِ اشعار ہے، جس میں فارسی ادب کے ابتدائی ادوار کے شعرا کے ساتھ ساتھ معاصر شعرا کا کلام بھی نقل ہوا ہے۔ مصنف حافظ شیرازی کا ہم عصر تھا اور اس نے حافظ کی ۱۲۶ غزلیں اس میں محفوظ کر لی ہیں، گویا

یہ حافظ کے کلام کی ایک معاصر روایت ہے۔

۱۹۹۸ء میں داؤدی صاحب نے مجھے ایک اور مخطوطہ بھیجا۔ یہ نویں صدی ہجری میں خراسان کے ایک نقشبندی شیخ طریقت زین الدین قواس کے ملفوظات کا مجموعہ تھا جسے امیر سیّد محمد نے مرتب کیا۔ یہ نسخہ بھی منحصر بہ فرد تھا۔ محمد ہاشم کشمی نے اپنی تصنیف نسمات القدس میں اس کتاب سے اقتباسات دیئے ہیں لیکن اس کا نسخہ کہیں نہیں ملتا تھا۔ میں نے داؤدی صاحب سے اس کی اہمیت کا ذکر کیا اور اس پر کام کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اُنھوں نے حسبِ معمول اپنی علم نوازی اور کشادہ دلی سے کام لیتے ہوئے نسخہ مجھے مرحمت کر دیا۔ میں نے یہ متن اپنے ایک تفصیلی مقدمے کے ساتھ ایران سے شائع کروایا۔(۴) میرے مقدمے میں داؤدی صاحب کے الطافِ کریمانہ کا ذکر موجود ہے۔

پچھلے سال ۲۰۰۱ء میں داؤدی صاحب نے ایک اور ضخیم مخطوطہ ارسال کیا۔ یہ وزیری تخلص کے شاعر کا فارسی کلیات تھا۔ مجھ سے داؤدی صاحب کا استفسار شاعر کے حالات کے بارے میں تھا۔ داؤدی صاحب کا تجسّس اور استفسار اپنی جگہ درست تھا کیوں کہ بعد میں تحقیق سے پتا چلا کہ وزیری تخلص کے کسی شاعر کا تذکرہ نہ فارسی کتبِ تذکرہ میں ملتا ہے نہ فارسی ادب کی تاریخوں میں۔ اس کلیات کے داخلی شواہد سے یہ دل چسپ انکشاف ہوا ہے کہ شاعر تاتاری نژاد ہے اور چین اس کا وطن تھا۔ اکبر کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا اور یہاں اکبر، جہانگیر اور خانِ خاناں کی مدح میں قصیدے لکھے۔ وہ ایک خمسہ کے علاوہ آٹھ اور تصانیف کا مالک بھی ہے۔ اس نسخے میں اس کی چھوٹی چھوٹی مثنویوں، قصیدوں اور غزلوں کے کوئی ساڑھے چودہ ہزار اشعار درج ہوئے ہیں۔(۵) آپ قیاس فرما سکتے ہیں کہ چین اور ہندوستان کے ادبی رشتے کے حوالے سے یہ نسخہ کس قدر اہم ہے اور جو داؤدی صاحب کے ذخیرے کی زینت

ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ ایرانی انقلاب کے بعد داؤدی صاحب کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ شاہِ ایران کے جانے کے بعد دنیا بھر کے مراکزِ مخطوطات اور نوادر کے نیلام گھروں میں اب فارسی مخطوطات کی پہلے جیسی قدر و قیمت نہیں رہی۔ اس لیے داؤدی صاحب نے اپنی توجہ عربی مخطوطات کی فراہمی کی طرف مبذول کر لی تھی۔ لیکن فارسی قلمی نسخے جمع کرنا اُنھوں نے یکسر موقوف نہیں کیا تھا۔ ان کی وفات تک ان کے پاس کوئی ایک ہزار فارسی مخطوطات جمع ہو گئے تھے۔ مجھے وہ بار بار پیغام بھیجتے کہ کچھ وقت نکال کر لاہور آؤں اور ان کا یہ ذخیرہ دیکھوں۔ مجھے یہ موقع ان کی وفات سے صرف تین ہفتے پہلے ملا اور میں نے دو اور پانچ جنوری کو دو الگ الگ نشستوں میں ان کے ہاں موجود تمام فارسی مخطوطات ایک ایک کر کے دیکھ لیے اور چند ایک اہم ترین نسخوں کے بارے میں یادداشتیں بھی تیار کر لیں۔ پہلی نشست میں پروفیسر ڈاکٹر مُعین نظامی صاحب، استادِ شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج، لاہور اور دوسری نشست میں پروفیسر محمد رفیق صاحب، استاد شعبۂ فارسی، گورنمنٹ کالج، لاہور شریک تھے بعد میں سیّد اویس علی سہروردی صاحب مدیر ''سہرورد'' کو بھی داؤدی صاحب نے خود فون کر کے بلوا لیا اور ہم نے مل کر مخطوطات دیکھے۔ اب کی بار مجھے اس ذخیرے میں افغانستان کے نوادر کے ساتھ ساتھ ریاست بہاولپور کے مصنفین کی فارسی تصانیف کے نسخے بھی ایک خاص تعداد میں دکھائی دیے جو کم از کم میرے لیے سب نئے تھے۔ یہ نسخے بہاولپور کے کسی صاحبِ ذوق کتب اندوز کے کتب خانے سے آئے تھے اور پنجاب کا علمی سرمایہ ہیں۔

داؤدی صاحب سے آخری ملاقات ان کے مکان کے جس کمرے میں ہوئی، اس میں ایک طرف ان کا پلنگ بچھا ہوا تھا اور چاروں طرف کتابوں اور مخطوطوں کے

بنڈل رکھے تھے، وہ اپنے اسی پلنگ سے اُٹھ کر ہسپتال منتقل ہوئے لیکن زندگی نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ صحت یاب ہو کر مخطوطات کے اس حصار میں واپس آتے اور ان مخطوطات کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے۔ میں نے ان سے اپنی آخری ملاقات میں تجویز پیش کی تھی اور سہروردی صاحب اس کے گواہ ہیں کہ داؤدی صاحب آپ اپنے نام پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ایک ذخیرۂ کتب قائم کریں اور یہ مخطوطات وہاں جمع کروا دیں۔ داؤدی صاحب نے اس مجلس میں تو اپنے ردِعمل کا اظہار نہ کیا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان سے آئندہ ملاقاتوں پر اس تجویز پر جب دوبارہ گفتگو ہوگی تو میں انھیں اس تجویز پر عملی جامہ پہنانے پر تیار کر لوں گا۔ لیکن افسوس کہ ہمارا یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

اب میں یہاں جمع علما اور فضلا اور اربابِ اختیار و اقتدار سے محض علمی دوستی، تہذیب پروری اور اس کالج کے اسم بامسمیٰ ہونے یعنی مشرق شناسی کے نام پر درخواست کروں گا کہ وہ داؤدی صاحب کے چھوڑے ہوئے اس قیمتی، نایاب مشرقی ذخیرۂ کتب کو محفوظ کرنے کی کوئی تدبیر کریں۔ داؤدی صاحب کی علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علمی کے دور میں تحریکِ پاکستان کی حمایت سے لے کر تشکیلِ پاکستان کے بعد یہاں آ کر علمی اداروں کی تعمیر اور مجلسِ ترقیٔ ادب کی توقیر میں جو حصہ ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ ان خدمات کا صلہ چکانے کا ایک نہایت ہی مہذب طریقہ یہ ہو گا کہ پنجاب یونیورسٹی داؤدی صاحب کے لواحقین سے ان کا چھوڑا ہوا یہ قیمتی ذخیرۂ کتب مخطوطات ایک معقول معاوضہ ادا کر کے حاصل کر لے۔ اس کام سے تین فوائد تو فوری طور پر بہ یک وقت مرتب ہوں گے۔ ایک یہ مخطوطات ہمیشہ کے لیے پاکستان اور علمی شہر لاہور میں محفوظ ہو جائیں گے۔ جو اس شہرِ علم و ادب کے شایانِ شان ہے، دوسرا یونیورسٹی کے کتب خانے کے وقار میں اضافہ ہو گا اور تیسرا یہ کہ داؤدی صاحب کے

لواحقین کے مادی حقوق کا تحفظ ہو جائے گا۔ مستقبل میں دائمی طور پر محققین کو اس ذخیرے سے جو معنوی فوائد حاصل ہوتے رہیں گے، اس کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں۔

بدشگونی کی بات کرنا اچھا تو نہیں ہے لیکن محض ماضی کی ایک غفلت سے سبق حاصل کرنے کے لیے عرض کروں گا کہ خان بہادر پروفیسر مولوی محمد شفیع اسی کالج کے فاضل استاد تھے جن کے علمی کارناموں اور مشرقی تحقیقات کی دھوم چار دانگ عالم میں ہے، اُنھوں نے اپنے تحقیقی ذوق کے پیشِ نظر اپنے گھر میں نفیس مخطوطات کا ذخیرہ جمع کیا تھا۔(۱) ان کی وفات کے بعد اس کتب خانے کا حشر کیا ہوا؟ وہ کتاب خانہ چوروں اور دلالوں کے ہتھے چڑھا اور کوئی کتاب یہاں بکی، کوئی وہاں۔ خدا داؤدی صاحب کی روح کو شاد فرمائے کہ ان کی کوششوں سے یہ کتب خانہ مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچ گیا اور اس کے کچھ بچے کھچے مخطوطات نیشنل لائبریری آف پاکستان، اسلام آباد میں محفوظ ہو گئے۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ جس کالج کی تحقیقی روایت کی شناخت ہی مولوی شفیع کے نام سے ہے، اس کی ناک کے نیچے اس شخص کا کتب خانہ برباد ہوا اور پنجاب یونیورسٹی اپنے اس محسن استاد کے گنج ہائے گرانمایہ کو اپنے ہاں محفوظ کرنے میں ناکام رہی۔ امید رکھنی چاہیے کہ اب کی بار یونیورسٹی لاہور میں کسی دوسرے المیے کو وقوع پذیر ہونے نہیں دے گی۔ اگر ہمارا یہ تہذیبی سرمایہ کسی دوسرے ملک کے کتب خانے کی زینت بن گیا تو غنی کشمیری کا یہ شعر حسبِ حال ہو گا:

غنی روزِ سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ روشن کرد نورِ دیدہ اش چشم زلیخا را

توضیحات:

☆ داؤدی صاحب کی یاد میں منعقد ہونے والے تعزیتی جلسہ، اورینٹل کالج، لاہور، ۶ر مارچ ۲۰۰۲ء میں پڑھا گیا۔

(۱) مولوی شمس الدین مرحوم (وفات ۱۱ر جنوری ۱۹۶۸ء) کی علم پروری، کتب کی داد و دہش اور دکان کی کیفیت پر کچھ مطبوعہ تاثرات حسبِ ذیل کتب میں مل جاتے ہیں:

الف شریف احمد شرافت نوشاہی، شریف التواریخ، جلد سوم، حصہ دو از دہم، طبع لاہور، صفحات ۲۰۸-۲۰۹۔

ب محمد ایوب قادری، کاروانِ رفتہ، طبع کراچی، ۱۹۸۳ء، صفحات ۱۲۹-۱۳۹۔

ج اقبال احمد فاروقی، تذکرہ علمائے اہلِ سنت و جماعت، لاہور، طبع لاہور، ۱۹۸۷ء، صفحات ۳۹۴-۳۹۶۔

(۲) یہ مضمون ''مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف: منبعی کہن در شعر فارسی و صنایع ادبی'' عنوان کے تحت مجلّہ معارف، تہران، جلد ۱۶، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۹۹ء، صفحات ۵۰-۶۷ میں شائع ہوا اور اس کی بازگشت ایران اور ہندوستان میں سنائی دی۔ ایران سے ایک محقق سیّد علی میر افضلی نے مضمون پڑھ کر مجھے خط لکھا کہ اسے مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف میں منقول شیخ اوحد الدین اور عمر خیام کا کلام درکار ہے۔ ہندوستان سے خود ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر مختار الدین احمد صاحب نے نسخۂ کابل کی بازیافت پر مسرت کا اظہار کیا۔

(۳) ڈاکٹر نذیر احمد نے اِس ستم ظریفانہ صورتِ حال کا خود ذکر کیا ہے۔ دیکھیے: ان کا مقدمہ بر ''غزلہای حافظ بر اساس مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف از سیف جام ہروی ہم عصر حافظ'' طبع دہلی، ۱۹۹۱ء، صفحہ ۵۵۔

(۴) یہ مقدمہ اور متن رضا مایل ہروی کی یاد میں ترتیب دیئے جانے والے مجموعۂ مقالات ''برگ بی برگی'' مرتبہ نجیب مایل ہروی، طبع تہران، ۱۳۷۸ شمسی / ۱۹۹۹ء، صفحات

۴۳۵-۵۱۷ میں شائع ہوا۔ بعد میں صرف مقدمہ میرے فارسی مجموعہ مقالات ''نامۂ تحقیق''، طبع تہران، ۲۰۰۲ء میں بھی شامل ہوا۔

(۵) کلیاتِ وزیری اور شاعر کے حالات پر میں نے ایک تیس صفحے کا مضمون تیار کر لیا تھا، اس کی اشاعت عن قریب متوقع ہے۔

(۶) ان نفائس کی تفصیل فہرست مخطوطاتِ شفیع مرتبہ محمد بشیر حسین، طبع لاہور، ۱۹۷۲ء میں دیکھی جا سکتی ہے۔

[اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو میں خلیل الرحمٰن داؤدی مرحوم کی یاد میں انجمن اُردو کے تحت منعقدہ تعزیتی جلسے میں پڑھا گیا، نیز مجلّہ سخن، شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، بابت ۲۰۰۲ء]

محمد اکرام چغتائی

داؤدی صاحب

مسلمانوں کی علمی تاریخ کے دورِ زرّیں کی ایک نامور شخصیت ابن الندیم بھی ہے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ورّاق (کتب فروش) تھا۔ نادر و نایاب کتابوں کا لین دین اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ یہ اس کا ذریعۂ معاش تو ضرور تھا، لیکن وہ فطری طور پر کتابوں کا شائق (Bibliophile) بھی تھا۔ جو کتاب بھی اس کے ہاتھ لگتی، وہ اس کے ظاہری اور معنوی محاسن کو آنکتا۔ اس کی تیاری کے تمام مراحل، مصنف کے جملہ کوائف اور موضوع کی چھان پھٹک کرتا اور پھر اپنی حاصل کردہ معلومات کو صفحۂ قرطاس پر قلم بند کر دیتا۔ کتاب کے ساتھ اس کی گہری وابستگی اور وسیع معلومات نے تمام ممالکِ اسلامیہ کے علمی حلقوں میں اس کا نام معتبر بنا دیا۔ بالآخر اس نے اپنے عمر بھر کے حاصلاتِ مطالعہ کو اپنے انتقال (۳۸۵ھ) سے چند سال قبل (۳۷۷ھ) اپنی تالیف ''الفہرست'' میں بڑی ہنرمندی سے یک جا کر دیا۔ اب ہزار سال سے اوپر ہو گئے، لیکن آج بھی یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے اواخر تک کے بیشتر علومِ اسلامیہ اور مذاہبِ مختلفہ کا واحد ماخذ ہے، حتیٰ کہ مغرب کے ثقہ شائقین کتب اور فہرست ساز (مثلاً جے ڈی پیرسن: مقالہ ''بلوگرافی'' در: انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، طبع جدید، جلد اوّل) کی نظر میں یہ کتاب شناسی کے موضوع پر دنیا کی اوّلین کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ابن الندیم اور خلیل الرحمٰن داؤدی مرحوم کی

شخصیتوں میں بہت سے مماثل پہلو دِکھائی دیتے ہیں۔ داؤدی صاحب نے اپنے عمر کا بیشتر حصہ کتابوں کی تلاش وتفحص میں بسر کیا۔ کونوں کھدروں سے علمی جواہر نکالتے، صدیوں کی گرد سے اٹے ہوئے ان خزینوں کی جھاڑ پونچھ کرتے اور جب وہ چمک اُٹھتے تو انھیں جوہر شناسوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے۔ کتب فروشی اُن کا شوقِ کاروبار تو تھا ہی، لیکن مرورِ زماں سے یہ ان کا کاروبار شوق بن گیا اور پھر اُنھوں نے اپنی زندگی کا سفر کتاب کی جانب یا اس کے ساتھ نہیں، بلکہ اس کے ''اندر'' کیا، یعنی ''سفر فی الکتاب''۔ سیانے لوگوں کا کہنا ہے کہ تمام دنیوی اور باطنی اسفار کی آخری منزل یہی سفر ہوتا ہے۔

معلوم نہیں، اس سفر کا آغاز کب ہوا، لیکن وہ جب بھی نظر آئے، اِسی دشت کی بادیہ پیمائی میں دِکھائی دیے۔ اُن کے لیے حصولِ کتب پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد وہ خطی اور طبع شدہ نوادرات پر مہینوں کام کرتے رہتے۔ حوالہ جاتی کتب کا ورق ورق کھنگالتے اور ان کے مولفین کے سوانحی کوائف جمع کرتے، نیز ان کے صوری اور معنوی محاسن کے بارے میں بکھری ہوئی معلومات کو اکٹھا کرتے اور پھر ان تمام جمع کردہ معلومات کو انتہائی اختصار، لیکن جامعیت کے ساتھ ہر کتاب کے شروع میں قلم بند کر دیتے۔ عربی، فارسی اور اُردو کے سیکڑوں نہیں، ہزاروں مخطوطات و مطبوعات پر اُن کی تحریر کردہ یہ عبارتیں اُن کی وسعتِ نظر، متعلقہ بنیادی مصادر پر کامل گرفت اور اُن کی شبانہ روز محنت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اب تو ایسی تمام کتب، ملک اور بیرونِ ملک کے متعدد کتاب خانوں کی زینت بن چکی ہیں، اور قارئین ان کے نفسِ موضوع کے ساتھ ساتھ داؤدی صاحب کی لکھی ہوئی پُر از معلومات عبارتوں سے بھی مستفید ہوں گے۔ کیا ہی اچھا ہوتا، اگر یہ عبارتیں یک جا ہو کر، موضوع وار مرتب ہو جائیں تو ان پر مشتمل کتاب دورِ حاضر کی ''الفہرست'' قرار پاتی اور آیندہ صدیوں تک اہلِ علم ان سے فیض

ب ہوتے رہتے۔

دورِ جدید کے انسان نے جو اطوارِ زندگی اپنا رکھے ہیں، وہ زیادہ تر
کثیرالمقصدیت کے شکار ہیں۔ بہ ظاہر یہ طرزِ زندگی پرکشش اور خوش نما نظر آتی ہے،
لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ کامیابی کے پردے میں ناکامی کی داستان ہے۔ مختلف
شعبہ ہاے زندگی میں جو لوگ قابلِ اتباع گردانے گئے، وہ تمام عمر یک مقصدیت کی راہ
پامردی سے گامزن رہے، اور بالآخر آسودۂ منزل ہوئے۔ داؤدی صاحب بھی ایسے
ہی خوش بخت نفوس میں سے تھے، جنھوں نے اوائلِ عمر ہی میں اپنے لیے ایک مقصدِ
حیات متعین کر لیا اور پھر نامساعد حالات کے تھپیڑے اور بادِ مخالف کی طوفان خیزی بھی
ان کے پایۂ استقامت میں لغزش پیدا نہ کر سکی۔ طفلی اور نوجوانی کے ابتدائی ایام میرٹھ
میں گزرے، تقسیم کے بعد پاکستان آئے تو کسبِ معاش کے لیے کوچۂ صحافت میں جا
نکلے اور جوانی کے منہ زور جذبات و احساسات کا اظہار، کاٹ دار اور تیکھے طرزِ نگارش کی
زیروں میں کرنے لگے۔ مولانا غلام رسول مہر مرحوم جیسے، عالمانہ صحافت کے بانیوں کی
قربت اور راہ نمائی کے باعث اُن کے نیشِ قلم کی تیزی قدرے کم ہوئی۔ چند سال بعد
وہ صحافتی زرد نویسی سے اکتا گئے اور پھر کتاب سے ایسا ناطہ جوڑا کہ وہی ان کا اعلیٰ ترین
مقصدِ حیات ٹھہرا، اور آخری سانس تک اسی کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ اس
میدان میں اتار چڑھاؤ آتے رہے، گرد و نواح کے ماحول کے غیر عالمانہ رویوں سے
بھی نبرد آزما رہے، لیکن یک مقصدیت کے سہارے وہ ان کٹھنائیوں کو برداشت کر
گئے۔ سچ پوچھیے تو اپنے شعبۂ زندگی میں سبھی کامرانیوں کا یہی راز ہے اور اہلِ تحقیق و
تدقیق کے ملکی اور غیر ملکی حلقوں میں ان کی قدر و منزلت، اسی ثابت قدمی کے طفیل
ہے۔

اگر اُن کی پوری علمی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت منکشف

ہوتی ہے کہ اس میں دو مقامات ایسے ہیں جب وہ علمی اور معاشی: دونوں اعتبار سے
آسودۂ حال رہے۔ ایک دور تو وہ تھا جب اُنھوں نے کلاسیکی اُردو ادب کی کم یاب و
نایاب اہم تصنیفات کو نئے اندازِ تحقیق سے ترتیب دینے کا بیڑا اُٹھایا۔ یہ تمام نوادر اُن
کی ذاتی ملکیت میں تھے، قابلِ استناد مراجع بھی اُن کی دست رس میں تھے۔ اُن کی
علمی اعانت کے لیے نوجوان اور باصلاحیت رفقاے کار موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر
مجلسِ ترقیٔ ادب کے ناظم جناب امتیاز علی تاج اُن کے مداحوں میں تھے اور داؤدی
صاحب اُن کے بیش تر نجی اور قانونی معاملات میں دخیل تھے۔ ان سہولتوں نے داؤدی
صاحب کے ذوقِ تحقیق کو تیز کیا اور ان کے ترتیب دیے ہوئے متون، قطار اندر قطار
منظرِ عام پر آنے لگے۔ جونہی تاج مرحوم خاندانی تنازعہ کا شکار ہوئے، داؤدی صاحب
کا مجلس کے ساتھ تعلق منقطع ہو گیا اور بہ وجوہ دوبارہ بحال نہ ہو سکا۔ ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ تاج صاحب کے سانحۂ ارتحال کے بعد نہ صرف مجلس سے بلکہ اُردو زبان و ادب
ہی سے منہ موڑ لیا۔ چنانچہ کم و بیش تیس برسوں میں اُردو کی کوئی کلاسیکی کتاب مرتب کی
اور نہ کوئی تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا۔ حتیٰ کہ اُنہوں نے رفتہ رفتہ اُردو کتابوں کی خرید و
فروخت ہی سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس کے بجاے خود کو صرف قلمی نسخوں کے لین دین تک
محدود کر لیا اور وہ بھی فارسی، اور زیادہ تر عربی کے۔

بالعموم انسان اپنی عملی زندگی کا سفر بڑی شاہراہوں سے شروع کرتا ہے۔ رفتہ
رفتہ جب قواے عمل میں اضمحلال کا آغاز ہو جائے تو پھر وہ خود بخود چھوٹی راہوں پر چل
پڑتا ہے اور بالآخر چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر لڑکھڑاتے ہوئے ایک ایسی بند گلی میں پہنچ
جاتا ہے، جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ داؤدی صاحب کا سفرِ حیات بھی کم و بیش انھی
مراحل سے گزرا۔ ابتدائی دور میں زیادہ تر اُردو زبان و ادب سے متعلق نایاب و کمیاب
کتب، جرائد، اخبارات وغیرہ کی خرید و فروخت کرتے رہے، اور وہ بھی کھیپ کی صورت

میں۔ تقسیمِ ہند کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، اس لیے لٹے پٹے ذخیروں کی ڈھیروں کتابیں، آسانی سے مل جاتی تھیں۔ تازہ تازہ الگ ہونے والے حصوں میں آمدورفت قدرے آسان تھی، اس لیے کتابوں کے حصول اور ترسیل میں مشکلات حائل نہیں تھیں۔ یوں داؤدی صاحب کا یہ کاروبار چل نکلا اور خوب ریل پیل رہی۔

داؤدی صاحب مرحوم اپنے اس کاروبارِ شوق کے طویل اور کٹھن سفر میں اس وقت کو اپنا حاصل سمجھتے تھے، جو اُنھوں نے ممتاز حسن مرحوم کے ساتھ گزارا تھا۔ ممتاز حسن جیسی معارف پرور شخصیت کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان دِنوں وہ وزارتِ خزانہ کے ایک اہم منصب پر فائز تھے۔ پھر وہ نیشنل بنک کے مرکزی دفتر میں کرتا دھرتا ہو گئے۔ مالی وسائل ان کی نوکِ قلم پر تھے، چناں چہ اُنھوں نے ان کا کچھ حصہ کتابوں کی خریداری پر صرف کر دیا اور اپنے بنک میں ایک اہم کتاب خانے کی بِنا ڈالی۔ بنک اور کتاب خانہ، ایک انہونی سی بات لگتی ہے، لیکن یہ سب کچھ ممتاز حسن مرحوم کی علم پروری کا مرہونِ منت ہے۔ بنک کی یہ لائبریری قریب قریب داؤدی صاحب سے خرید کردہ کتب ہی سے معرضِ وجود میں آئی۔ داؤدی صاحب سے ہر طرح کی کتابیں خریدنے والے بہت سے لوگ تھے اور پھر وہ اپنی روایت کے مطابق کسی موضوع پر کام کرنے والوں سے کسی قیمتی چیز تک کے دام نہیں لیتے تھے۔ ممتاز حسن مرحوم کے ساتھ بھی ان کے تعلقات ایسے ہی تھے۔ ذاتی حوالے سے گرم جوشی کی جھلک بھی نظر آتی تھی، لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ممتاز حسن مرحوم نے انھیں ایک عالم، محقق، ملک کے ایک علمی خیرخواہ کی حیثیت سے جو مان دیا اور تمام لین دین کے باوصف اُن کی عزتِ نفس کا ہر طرح سے خیال رکھا: وہ داؤدی صاحب کے دل کی گہرائیوں میں بس گیا، اور اس کی یاد اُن کا سرمایۂ عمر قرار پایا۔ اگر ممتاز حسن مرحوم کی عمر وفا کرتی تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ داؤدی صاحب کی، برصغیر کے مسلمانوں کے علمی اور

ادبی سرمائے کو محفوظ کرنے میں انجام دادہ، خدمات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کسی اعلیٰ علمی اعزاز کا اہتمام کر دیتے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا، اور پھر اُن کی رحلت کے بعد بھی مقتدر علمی اشخاص کو داؤدی صاحب کی ایسی قدر افزائی کا خیال نہ آیا۔ یہ قومی سطح پر ہمارے علمی بانجھ پن کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

داؤدی صاحب کے ساتھ عرصۂ دراز تک ملاقات رہی۔ علمی معاملات میں وہ ہر طرح کی اعانت کرتے۔ زبانی اور تحریری معلومات فراہم کرتے۔ جو کتاب اہم ہوتی، وہ بلا قیمت دیتے، کیوں کہ (اُن کی نظر میں) سنجیدگی سے کام کرنے والے اصحاب سے کسی بھی نادر اور قیمتی کتاب یا جریدے کے دام وصول کرنا ''فعلِ شنیع'' تھا۔ چند سال ہمسائیگی میں گزرے اور یوں ان کا دستِ شفقت مزید دراز ہو گیا اور اُنھوں نے میرے لیے اپنے علمی خزانوں کے تمام در وا کر دیے۔ اُن سے اکتسابِ فیض کی داستان خاصی طویل ہے، جس کو اپنی عدیم الفرصتی کے باعث ابھی چھیڑنا مناسب نہیں۔

جب میں نے پہلی بار داؤدی صاحب کا نام سنا، اس وقت وہ ٹیگور پارک کے ایک دو منزلہ مکان میں رہائش پذیر تھے۔ اُن سے ملنے گیا تو اُن کا گھر تلاش کرنے میں مشکل پیش آئی۔ ایک دکان سے اُن کا اتا پتا پوچھا اور ان کے شغلِ کتب کا حوالہ دیا تو قدرے عامیانہ لہجے میں جواب دیا کہ آپ ''کتاباں والے'' کا پوچھ رہے ہیں؛ بعد میں داؤدی صاحب سے برسوں ملتا رہا، لیکن ''کتاباں والا'' کے الفاظ ہمیشہ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔

ایک زمانے میں، مَیں سائیکل پر اپنے دفتر جایا کرتا تھا اور ان کا ٹیگور پارک والا گھر میرے راستے میں پڑتا تھا، جب یہاں سے گزرتا اور اوپر دیکھتا تو وہ اپنے چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھے، حسبِ معمول اپنے اردگرد کتابوں کے انبار میں کام کر رہے ہوتے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ جہاں بھی ہیں، ایسی ہی کسی کھڑکی میں، اُسی عالمانہ سج دھج کے ساتھ بیٹھے، اپنے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

پروفیسر محمد اقبال مجددی

خلیل الرحمٰن داؤدی بحیثیت کتاب شناس

مرحوم خلیل الرحمٰن داؤدی صحیح معنوں میں کتاب شناس تھے، کتاب شناس کا صحیح متبادل فرنچ لفظ Bibliophile ہے، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مرحوم کتابی کیڑا یا فنا فی الکتاب تھے، موصوف کی زندگی سنجیدگی کے ساتھ ساتھ حیاتِ مفرح تھی، وہ مشکل سے مشکل حالات میں خوش رہنے کے خوگر ہو گئے تھے۔ میں نے اُنھیں ہمیشہ مالی تنگدستی کے ساتھ گزر بسر کرتے دیکھا، لیکن ان کی عملی زندگی پر اس کے گہرے اثرات کبھی نہ پڑے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دوست احباب آئے ہوں اور ان کی تواضع ان کے من پسند مشروبات سے نہ کی ہو۔

موصوف کی زندگی کے بہت سے پہلو ایسے تھے، جن پر بھرپور طریقے سے لکھا جا سکتا ہے، میں صرف ان کے کتاب شناسی کے فن پر چند نکات بیان کر رہا ہوں۔

میں ابھی ہائی سکول کا ایک طالب علم تھا کہ لاہور کے معروف تاجر کتب نادرہ مولوی شمسُ الدین کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ مرحوم کے مرکزِ کتاب فروشی میں بہت سے اصحاب آتے اور گھنٹوں علمی موضوعات پر بحث کرتے تھے، وہاں احقر کی جن بزرگوں سے ملاقات ہوئی ان میں ایک نہایت مرنجان مرنج شخصیت خلیل الرحمٰن داؤدی کی تھی، سکول سے کالج تک — تعلیمی سفر کے دوران مرحوم کو کئی بار دیکھا لیکن مرحوم کے دولت خانہ پر حاضر ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں اسلامیہ کالج سول

لائنز لاہور میں زیرِ تعلیم تھا کہ مخطوطات سے دلچسپی کا آغاز ہوا، میرا موضوع طالب علمی شروع ہی سے تاریخ، تذکرہ اور کتبِ تصوف کی جستجو تھا، یہی ذوق داؤدی صاحب مرحوم کے ہاں لے گیا۔ مرحوم اس وقت کم و بیش پچپن سال کے ہوں گے اور میں تیز طرار اخلاقی تقاضوں سے آزاد اور لاابالی کا شکار ایک جواں سال بی۔اے کا متعلم تھا۔ میں حاضر خدمت ہوا۔ فوراً پہچان لیا اور اُٹھ کر بڑے ہی احترام سے ملے، مجھے بہت حیرت ہوئی کیونکہ مجھے کسی کے اس قدر احترام سے ملنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ میرا تعلق ایسی نوجوان نسل سے تھا جو انسانیت کے ادب و احترام سے کوسوں دور بھٹک چکی تھی، مجھے آدمیت کے اسباق مرحوم ہی سے ملے اور آج تک انہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعی کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ توفیق دے، آمین!

اس طالب علمی کے زمانے میں جب میری تیسری کتاب ''احوال و آثار عبداللہ خویشگی قصوریؒ'' کی تالیف کا عمل جاری تھا، میں مرحوم کے آستانے پر حاضر ہوا کہ اس قصوری مصنف کا کوئی مخطوطہ مرحوم کے ذخیرے میں تو نہیں ہے۔ جو مخطوطات ان کے ہاں پہلی مرتبہ دیکھے ان میں ایک اہم تذکرہ جواہرِ مودودی(۱) کا تھا۔ اس میں سلسلۂ چشتیہ کے موسس و بزرگ خواجہ مودود چشتی کے حالات و مناقب تفصیل سے بیان کیے گئے تھے۔ میں اسے چند منٹ دیکھتا رہا اور اس سوچ میں گم تھا کہ اس سے استفادہ کیسے کروں؟ داؤدی صاحب معلوم نہیں مجھے کسی کمرے میں بٹھا کر اس سے نقل و اقتباس کا موقع دیں یا نہ دیں۔ موصوف نے میرا اضطراب دیکھ کر خود ہی فرمایا کہ تم یہ مخطوطہ لے جاؤ اور چند دن کے بعد واپس دے دینا۔ میں بہت ہی خوش ہوا اور حیران بھی کہ مرحوم سے کوئی ایسی شناسائی نہیں ہے، پھر بھی اتنا اعتماد کیوں کر اور کیسے کر لیا؟

میں حسبِ وعدہ چند دن کے بعد بحفاظتِ تمام یہ مخطوطہ لے کر ان کی خدمت میں واپس آیا۔ پھر اسی طرح بڑے تپاک سے ملے اور اعتماد کی یہ فضا ایسی قائم ہوئی کہ

تی سے قیمتی مخطوطہ بھی تاحیات مجھے مستعار دیتے رہے اور کبھی پس و پیش تو دُور کی بات ہے، مخطوطات دے کر یاد دہانی بھی نہیں کروائی اور نہ کبھی دیتے وقت ان کے نام لکھے اور نہ گن کر ہی دیئے۔ یہ مرحوم کی فراخ دلی کی ایسی مثال ہے، جو قرونِ وسطیٰ میں بھی بہ تلاشِ بسیار نہ مل سکے۔

مرحوم کی ساری زندگی مخطوطات خریدنے، اُنھیں پرکھنے اور ان کی اہمیت پر غور و فکر کرنے میں صرف ہوئی۔ مجھے اس سلسلے میں کئی مخطوطہ شناس اصحاب سے ملنے اور انھیں مخطوطات پر کام کرتے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ ان میں مشہور ایرانی فضلا اور مخطوطہ شناس محمد تقی دانش پژوہ، ایرج افشار اور نجیب مائل ہروی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اگر یہ اصحاب داؤدی صاحب مرحوم سے ملتے ہوتے اور ان کے ذخیرۂ مخطوطات سے استفادہ کرتے تو ان کے نتائج تحقیق مختلف ہوتے۔ ان میں نجیب مائل ہروی کی بیش بہا کتاب ''کتاب آرائی در تمدنِ اسلامی'' اور ''نقد و تصحیح متون'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں موخر الذکر کتب کے مولف کو اگر مرحوم داؤدی کی صحبت میسر آ جاتی اور ان کے ذخیرۂ علمیہ سے استفادے کا موقع مل جاتا تو ان کی ان کتابوں کی شان جداگانہ ہوتی۔

داؤدی مرحوم مخطوطہ ہاتھ میں لیتے ہی اس کا ترقیمہ دیکھے بغیر بتا سکتے تھے کہ یہ کس زمانے کا مکتوب ہے، رسم الخط کس خطے کا ہے؟ اور کاغذ و روشنائی کہاں کی ہے؟ بارہا ایسا ہوا کہ مخطوطہ بغیر ترقیمہ کے ملا لیکن فوراً کہا کہ یہ فلاں عہد کا نوشتہ اور اس علاقے کی ساخت و پرداخت معلوم ہوتی ہے۔ مرحوم کو جعلی خطی نسخوں کی شناخت کا بڑا تجربہ تھا۔ مخطوطہ فروش دام بڑھانے کی غرض سے بعض اوقات ترقیمے میں موجود سنین میں تصرف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن مرحوم فوراً پہچان لیتے اور اس کا اصل سنہ اپنے ماہرانہ انداز میں ایسا بتاتے کہ اس سے اختلاف کرنا دشوار ہو جاتا۔

مرحوم کو مخطوطہ شناسی میں کمال درجے کا درک تھا، ہمیشہ مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطی نسخوں کی جستجو میں رہتے اگر مخطوطہ مؤلف کا خود نوشت نہ ہوتا تو کاتب سے مولف کے قریبی تعلق کو جاننے کی سعی فرماتے۔ کئی بار بڑی مسرت سے فرمایا کہ آج تین ایسے خطی نسخے ہاتھ آئے ہیں جن کے کاتب ان مولفین کے شاگرد تھے۔ تیسرے درجے میں مرحوم ایسے مخطوطات کو ترجیح دیتے تھے جو مؤلف کی حینِ حیات لکھے گئے ہوں۔ متعدد ایسے قلمی نسخے مجھے دکھائے تھے جن کی مولفین نے خود تصحیح کی تھی، فرماتے تھے کہ صحتِ متن کے اعتبار سے وہ خطی نسخے اقدم و قابلِ ترجیح ہوتے ہیں جن کو اہلِ علم اپنی تحقیقات کی غرض سے دیگر نسخوں سے تقابل کے بعد تصحیح کر لیتے تھے۔ مرحوم اکثر فرماتے تھے کہ وہ خطی نسخے نہایت درجہ قابلِ اعتنا ہیں جو محققین علماء کے کتب خانوں کی زینت رہے ہوں اور ان پر ان حضرات نے تصحیح و تقابل کا کام کیا ہو، چنانچہ ایسے متعدد نسخے مجھے ان کے ہاں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

ایک بار میری موجودگی میں ایک افغان کابل سے کچھ خطی نسخے بغرضِ فروخت ان کے پاس لایا، ان میں ایک نہایت نادر الوجود خطی نسخہ ''حیات القلوب فی زیارت المحبوب (صلی اللہ علیہ وسلم)'' کا بھی تھا۔ اتفاق سے تاجر نے اس کی قیمت دیگر نسخوں کے مقابلے میں کم طلب کی۔ لیکن یہی نسخہ ان میں ہیروں اور جواہرات میں تول کر لیا جاتا تو بھی ارزاں تھا۔ دیکھتے ہی اس کا ہدیہ پوچھا، اس نے کہا، دس ہزار روپے سے کم نہیں لوں گا۔ مرحوم نے سارے گھر سے تلاش کر کے صرف چار ہزار روپے برآمد کیے جو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ رقم پیشگی لے جایئے باقی کل دے دیں گے۔

دراصل یہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کا خود نوشت خطی نسخہ تھا، جس پر مولف کی تملیکی مہریں ثبت تھیں۔ ایک اور مہر مولف کے پوتے مخدوم محمد ابراہیم ٹھٹھوی کی تھی۔ تیسری ملکیت شاہ عبدالباقی بن شاہ صفی اللہ معصوی مجددی کی تھی۔ ایک اور تحریر ان کے

فرزند غلام صدیق(۲) کی تھی۔ یہی بزرگ کابل میں خانقاہِ مجددیہ کے موسس تھے۔ یہ خانقاہ سابقہ انقلابِ افغانستان کے دوران مسمار کر دی گئی، جس میں اس کا نادر کتاب خانہ بھی برباد ہو گیا۔ یہ انمول مخطوطہ اسی خانقاہ کے کتب خانہ کی زینت رہ چکا تھا۔ غرض ایسے بیسیوں مخطوطات مرحوم کی عنایت سے دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

عرصہٗ دراز سے میرا موضوعِ تحقیق سلسلۂ نقشبندیہ کی تاریخ ہے، مرحوم کی زندگی کے آخری پندرہ سالوں میں اس نوعیت کے جتنے بھی مخطوطات ان کے پاس آئے، مجھے بلا کر خصوصیت سے دِکھائے اور بڑی شفقت سے مستعار دیئے اور میرے پاس مہینوں پڑے رہے اور میں ان سے نقل و اقتباس کا کام کرتا رہا۔

۱۹۸۵ء کو داؤدی صاحب مرحوم کے پاس مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کی ایک اور بہت ہی بیش قیمت کتاب ''اتحاف الاکابر بمرویات الشیخ عبدالقادر'' آئی تو مجھے بلا کر بڑے شوق سے دِکھائی اور میں نے چند دن کے استفادے کے بعد واپس کر دی۔ میں نے سندھی حضرات سے سن رکھا تھا کہ مخدوم ہاشم پانچ سو کتابوں کے مصنف تھے۔ میں اسے ان کا مبالغہ سمجھتا تھا۔ لیکن جب یہ کتابیں دیکھیں تو یقین ہو گیا، کیوں کہ مولف نے اس کتاب کے آخر میں اپنے خود نوشت حالات کے ضمن میں اپنی ۱۱۵ تالیفات کے نام تحریر کیے ہیں اور اس کتاب کی تالیف کے بعد وہ تقریباً اڑتیس سال بقیدِ حیات رہے۔(۳)

اتحاف الاکابر دراصل مخدوم محمد ہاشم کی معجم الشیوخ ہے جس میں اُنھوں نے اپنے اساتذہ سے جو کتب پڑھیں اُن کی اسناد جمع کی ہیں، اس میں اتنی کتابوں اور مصنفین کا تذکرہ ہے کہ آج اس کو ایڈٹ کرنا خاصا دشوار کام ہے کیوں کہ وہ مآخذ و مراجع ہمارے ملک میں موجود ہی نہیں ہیں جن کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے۔ ۱۹۹۲ء

میں داؤدی صاحب مرحوم نے علومِ مشرقیہ کے مشہور استاد ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے فارسی مخطوطات افغان مہاجرین کے ذریعے خریدے تو ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ مرحوم محمد شفیع اپنا ذخیرۂ علمیہ بہت کم کسی کو دِکھاتے تھے۔ ان کا بیٹا احمد ربانی دوسرے مزاج کا شخص تھا۔ اس نے اپنے والد کے کتاب خانے کی حفاظت کا خوب انتظام کیا تھا لیکن اس سے کتابیں دیکھنا ناممکن تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تقریباً پچیس برس کے انتظار کے بعد اس بیش بہا کتابخانے کے چند نوادر دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا اور یہ محض داؤدی صاحب مرحوم کی فراخ دلی کے باعث ممکن ہوا۔

۱۹۷۷ء سے آج تک افغانستان میں ہونے والی خانہ جنگی کے باعث وہاں کی علمی میراث تباہ و برباد ہوگئی۔ یہ وہ افغانستان ہے جو مسلمانوں کے دورِ وسطیٰ میں دینی علوم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور اپنے اہلِ علم وفن اور بکثرت علمی مراکز کے باعث بجاطور پر اسے مسلمانوں کی ولایت کہا جاتا تھا۔ کوئی ہندوستانی طالب علم افغانستان سے فارغ التحصیل ہوکر آتا تو یہاں کے اہلِ علم اس کی بڑی قدر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ولایت سے پڑھ کر آیا ہے۔ لیکن آج ولایت تو یورپ کو کہا جاتا ہے اور اسی مہذب دُنیا نے اس کی رہی سہی ساکھ بھی گذشتہ سال حملے کر کے خاک میں ملا دی۔

۱۹۷۶ء میں مجھے افغانستان جا کر وہاں کے قابلِ رشک کتاب خانوں سے استفادے کا موقع ملا تھا۔ لیکن اگلے ہی سال وہاں خانہ جنگی اور تباہی کے آثار آنے لگے اور وہ مخطوطات جن سے میں نے اپنے سفر کے دوران نقل و اقتباس کیا تھا اور ان پر یادگار کے طور پر چند سطور لکھ کر اپنے دستخط ثبت کر دیئے تھے، وہی مخطوطات بعد میں کوئٹہ اور پشاور کے افغان مہاجرین کے پاس بغرضِ فروخت آ چکے تھے۔ ان مخطوطات کو بازارِ کتاب فروش میں دیکھ کر ایک طالب علم کا جو حال ہوا ہوگا، اس کا اندازہ صرف وہی اصحاب کر سکتے ہیں، جو ان منازل سے گزرے ہوں۔ اپنے قیامِ افغانستان کے

[دو]ران وہاں کا شاہی کتاب خانہ دیکھنے کی انتہائی کوشش کی، لیکن بری طرح ناکام رہا۔ افسوس کہ اس خانہ جنگی کے دوران وہ شاہی کتاب خانہ لٹ گیا اور اس کے انتہائی قیمتی مخطوطات بکتے بکاتے یورپ پہنچ گئے اور ان میں سے صرف چند ایک پاکستان بھی آئے اور ان مہربان مہاجرین کے ذریعے ان کی زیارت بھی کی۔ پاکستان میں ان مخطوطات کے سب سے بڑے خریدار خوش قسمتی سے خلیل الرحمٰن داؤدی تھے، لیکن افسوس کہ ان تک پہنچنے سے پہلے ہی سرمایہ دار حضرات قیمتی نسخے منہ مانگی قیمت دے کر خرید لیتے تھے، باقی ماندہ قلمی نسخے داؤدی صاحب کے پاس آتے تھے۔ وہ بھی اپنی علمی اہمیت کے اعتبار سے کم درجے کے نہیں تھے۔

مرحوم کی مرتبہ فہارس مخطوطات کی اشاعت کی ضرورت ہے۔ داؤدی صاحب مخطوطات کی مکمل فہرست نہایت عرق ریزی بلکہ دیدہ ریزی سے بناتے تھے اور خوش قسمتی سے ان فہارس کی نقول بہت حد تک ان کے ذخیرۂ علمیہ میں محفوظ ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ فہارس کتابی صورت میں شائع کر دی جائیں یا پاکستانی رسائل میں قسط وار چھاپ دی جائیں جس سے علمی دُنیا میں پاکستان کی نمائندگی بھی ہو گی۔

مرحوم نے آخری لاٹ خاص نقطۂ نظر سے خریدی تھی، بڑے اہتمام سے عربی کے صرف وہ مخطوطات خریدے گئے جو بروکلمان کی مرتبہ عربی ببلوگرافی میں موجود نہیں تھے اور یہ تمام مخطوطات افغانستان کے مختلف خطوں سے آئے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بروکلمان اور اس طرح کے ببلوفیل ان علاقوں کی علمی تاریخ اور وہاں کے مصنفین سے واقف ہی نہیں تھے۔(۴) اگر عربی زبان و ادب کی پھر سے ببلوگرافی بنائی جائے تو داؤدی صاحب مرحوم کے جمع کردہ عربی مخطوطات اضافہ کے طور پر شمار کیے جائیں گے۔

میں نے مرحوم سے تقریباً پانچ سو خطی نسخے وقتاً فوقتاً مستعار لیے اور ان سے

استفادہ کیا اور یادداشتیں مرتب کیں، جو بہت کم کسی دوسرے طالب علم کے نصیب میں آئے ہوں گے۔

آخر میں یہ دُعا ہے کہ مرحوم کو ربِ کریم جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین!

حوالے اور حواشی:

(۱) ''جواہر مودودی'' مولفہ محمد اکرام براسوی، اس کے مولف ایک اور اہم تذکرۂ صوفیہ اقتباس الانوار کے مولف بھی ہیں۔

(۲) شیخ غلام صدیق کے فرزند شیخ غلام قیوم (ف ۱۳۳۰ھ) تھے۔ حضرت نور المشائخ فضل عمر مجددی ملقب بہ ملاشور بازار کابلی انھی کے نامور خلف تھے، جن کے صاحب زادے ضیاء المشائخ محمد ابراہیم مجددی کو حالیہ انقلابِ افغانستان کے دوران روسیوں نے شہید کر ڈالا اور خانقاہِ مجددیہ قلعہ جواد کابل مسمار کر دی۔ یہ مخطوطہ اسی خانقاہ کے کتاب خانے کی زینت تھا۔

(۳) مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی کا سالِ انتقال ۱۱۷۴ھ (مقالات الشعرا ۸۴۳) ہے اور اُنھوں نے کتاب اتحاف الاکابر ۱۱۳۶ھ میں تالیف کی۔ گویا موصوف ۳۸ (۱۱۷۴ھ-۱۱۳۶ھ) سال مزید بقیدِ حیات رہ کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔

(۴) دراصل اُن حضرات کا جنھوں نے عربی و فارسی زبان و ادب کے حوالے سے اسلامی علوم کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، تمام تر انحصار مخطوطات کی شائع شدہ فہارس پر تھا۔ اس اعتبار سے افغانستان نہایت ہی محروم القسمت خطہ ہے، وہاں فہرست سازی کا کام ہی نہیں ہوا۔ زیادہ سے زیادہ بورکوے (Beaurecueil) کی مرتبہ فہرست ہے جو ۱۹۶۴ء میں فرانس سے شائع ہوئی تھی اور اس سے قبل مخطوطات پر چند مضامین وہاں کے رسائل میں چھپے تھے۔ اور بس۔

[مجلّہ سخن، اورینٹل کالج، لاہور، ۲۰۰۲ء]

ڈاکٹر تحسین فراقی

بیادِ خلیل الرحمٰن داؤدی

جان ڈن نے موت سے خطاب کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"اے موت تجھے بہت سوں نے قوی اور ڈراؤنی قرار دیا ہے
مگر تو مغرور نہ ہو کیونکہ تو ایسی نہیں
اپنے زعم میں تو نے جن جن کو پچھاڑ دیا ہے
وہ مرے نہیں...
اے موت مجھے تجھ پر ترس آتا ہے
تو مجھے مار نہیں سکے گی
اے موت! موت تیرا مقدر ہے؟"

موت سے مردانہ لہجے میں تخاطب صرف اسی شخص کا ہو سکتا ہے جو زندگی کی ابدیت اور دوام کی حقیقت سے واقف ہو اور جسے اقبال کی طرح معلوم ہو کہ موت تجدیدِ مذاقِ زندگی سے عبارت ہے اور ظاہر کا یہ خواب اصلاً پیغام ہے بیداری اور تسلسل کا۔

اُردو کے خاموش، گوشہ نشین، محقق عالم خلیل الرحمٰن داؤدی قریباً اناسی برس کی عمر پا کر ۲۶ رجنوری ۲۰۰۲ء کو ہم سے اچانک رخصت ہو گئے۔ زندگی کے آخری سانس اُنھوں نے شیخ زاید ہسپتال میں لیے، اور مضمون یہ تھا:

آنکھیں مند جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوئے

شاید صبح کے تارے اور ان کا غروب ایک ساتھ ہوا۔ مگر طلوع وغروب کی یہ کہانی نہ پہلے کبھی ختم ہوئی نہ آیندہ ہو گی اور داؤدی جیسے صاحبانِ قلب ونظر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے رہیں گے:

''اے موت مجھے تجھ پہ ترس آتا ہے

تو مجھے مار نہیں سکے گی

اے موت! موت تیرا مقدر ہے!''

ضلع میرٹھ کے ایک قریے لاوڑ میں ۲/ مارچ ۱۹۲۳ء کو جنم لینے والے اس مردِ قلندر نے بنیادی تعلیم سائنس میں حاصل کی۔ علی گڑھ سے بی۔ ایس۔ سی کیا، حساب میں غیر معمولی مہارت تھی، کئی امتیازی تمغے حاصل کیے۔ مگر سائنس کے دوش بدوش علومِ شرقیہ کے امتحان بھی پاس کیے۔ جہاں ایک طرف سائنسی علوم کی گہری تحصیل نے ان میں سائنسی نقطۂ نظر کو پروان چڑھایا، وہیں دوسری طرف علومِ شرقیہ کی تحصیل نے ان کے سامنے کلاسیکی ادب کے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور داؤدی صاحب نے اُردو اور بعد ازاں عربی ادبیات اور مخطوطہ شناسی کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ حق یہ ہے کہ پورے برعظیم میں وہ مخطوطہ شناسی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ عمر کے آخری تیس برس مخطوطات کی جمع آوری اور ان کی تفہیم وترسیل میں گزری۔ زندگی کی آخری سانس تک علم سے باندھے ہوئے پیمان کو نبھایا۔ عمر بھر اپنے نام کی لاج رکھی۔ بت شکنی کو پیشہ بنائے رکھا:

آزر کا پیشہ خارا تراشی

کارِ خلیلاں خارا گدازی

داؤدی صاحب سے میری نیازمندی بائیس پچیس سال سے تھی۔ اولین

ملاقاتیں ٹیگور پارک میں ان کی اقامت گاہ پر ہوتی رہیں۔ میں اس زمانے میں مولانا دریابادی پر پی ایچ۔ڈی کر رہا تھا۔ داؤدی صاحب نے کمال فیاضی سے مجھے ''صدق'' کے بہت سے پرچے عنایت کیے۔ ان کی عنایات کا سلسلہ تا دمِ مرگ جاری رہا۔ اور یہ حسنِ سلوک میرے ساتھ ہی نہیں ہر اس لکھنے والے کے ساتھ تھا، جو کسی مخصوص ادبی و علمی موضوع پر تحقیق کر رہا ہوتا تھا۔ میری علمی دلچسپیوں کے پیشِ نظر مجھے متعدد قلمی نسخے عنایت کیے۔ وفات سے ایک ڈیڑھ ماہ پہلے قدرت اللہ بلیغؔ کے چھے فارسی دواوین اور ایک اُردو دیوان پر مشتمل ایک نادر اور منحصر بفرد قلمی نسخہ مجھے عنایت کیا۔ قدرت اللہ بلیغؔ ان کے نامور اجداد میں سے تھے اور میر و سودا کے عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے بلیغؔ کا کلام ابھی جستہ جستہ دیکھا ہے۔ میری دانست میں ان کا فارسی کلام ان کے اُردو کلام سے کہیں فائق اور ان کی قدرتِ کلام کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

داؤدی صاحب کو قدرت نے بیدار ذہنی، فیاضی، ایثار، بے خوفی، برہنہ گوئی، تعقل پسندی اور روایت دوستی کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ اپنے دوستوں اور نیازمندوں سے کمال اخلاص سے پیش آتے تھے۔ میں اور جعفر بلوچ جب بھی ان سے ملنے جاتے ان کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھتا۔ پھر گھنٹوں شعر و سخن اور روایت اور درایت کی محفل گرم رہتی۔ ان کا کلاسیکی ادب و شعر کا مطالعہ بہت عمدہ تھا۔ اساتذہ کے سیکڑوں شعر نوکِ زبان تھے، کیا اُردو کیا فارسی۔ بس صورت یہ تھی کہ

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

شعر بڑے جذبے اور جوش سے پڑھا کرتے تھے۔ بیاںؔ یزدانی میرٹھی کا یہ شعر کئی بار ان کی زبانی سنا۔ کہا کرتے تھے کہ رشک کے مضمون بہت سوں نے باندھے، لیکن بیان کا مضمون بہت انوکھا ہے:

مہر تم، سوختہ میں، شیشۂ آتش ہے رقیب
اُس پہ ڈالو گے تجلّی تو میں جل جاؤں گا!

میں نے ایک دفعہ ان کے سامنے خسؔرو کا یہ مصرعہ پڑھا جس میں ہندو عورت
کے ستی ہو جانے کو سراہا گیا تھا اور کمال شاعرانہ دلیل کے ساتھ، یعنی:

سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

جواباً خسؔرو کا ہی ایک شعر سنایا:

خسؔروا در عشق بازی کم زہند و زن مباش
اُو برائے مردہ سوزد زندہ جان خویش را

ایک اور شعر بھی ان کی زبانی کئی دفعہ سنا۔ شاید خسؔرو ہی کا تھا:

سیاہ چوڑی بدست آں نگارے
بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے!

متحدہ المعانی اشعار کا ایک کثیر ذخیرہ اُن کے حافظے میں محفوظ تھا۔ کلاسیکی
شعراء مثلاً نظیر اکبر آبادی کے کلام کے اوّلین ایڈیشن بھی ان کی لائبریری میں محفوظ
رہے تھے، جن میں وہ تمام اشعار بھی موجود تھے، جو بعد میں کاتبوں اور ناشروں کے
نقطوں کی نذر ہو گئے۔ ایسے بہت سے اشعار ان کی بیاض میں اور کچھ ان کے حافظے
میں محفوظ تھے جنھیں کبھی کبھی لہر میں ہوتے تو سناتے جاتے!

ایک دفعہ ایسے ہی ان کا دریائے شعر خوانی موج میں تھا۔ جب یہ شعر سنائے
تو لگتا تھا، ان کا پورا وجود مسکرا رہا ہے:

وہ پیر طریقت تو ہیں اعمال ندارد
جس مال کے تاجر ہیں وہی مال ندارد

تحقیقؔ جو کی ان کے نسب کی تو کھلا یہ
کچھ یونہی سی ننھیال ہے ددھیال ندارد!

داؤدی صاحب کی شخصیت کا جو کمال حیرت میں ڈالتا ہے، ان کا غیر معمولی حافظہ تھا۔ حقائق و واقعات کا ایسا غیر معمولی استحضار واقعتہً حیران کن تھا۔ انساب پر بڑی گہری نظر تھی۔ فارسی، عربی، اُردو کی کلاسیکی تصانیف کے فلاں فلاں قلمی نسخے پہلی دفعہ کب اور کہاں لکھے گئے اور کن ہاتھوں نے لکھے، ان کی انگلیوں کی پوروں پر تھے۔ قلمی نسخے کی قدامت کا فوراً اندازہ کر لیتے تھے۔ ان کے کتب خانے میں نادر، نایاب اور ...ں صورتوں میں متعدد ایسے منحصر بفرد نسخے دیکھنے کا موقع ملا، جو خطاطی اور تذہیب کے ...ثل نمونے تھے۔ ان کی مطلّا اور مذہّب لوحیں اور روشنائی کی کرشمہ کاریاں اب بھی ...ن میں جگمگ جگمگ کرتی ہیں۔ قرآن کے نادر نسخوں کے روشن طلائی شمسے اَلشَّمْسُ اَلْقَمَرُ بِحُسْبَان کی تفسیر بنے اب بھی حافظے کی لوح پر جگمگاتے اور لو دیتے ہیں اور ...رے اس ایقان کو اور پختہ کرتے ہیں کہ مسلم فنون میں خطاطی کا فن پوری دُنیا میں اپنا ...انی نہیں رکھتا کہ یہ فن بنیادی طور پر الکتاب سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے شعلے سے ...ھوٹا ہے!

داؤدی صاحب کی شخصیت میں قدیم و کہنہ کا عنصر جدید کی نسبت زیادہ جڑ پکڑے ہوئے تھا۔ مسلم مورّخین، محدثین، خطاطوں اور تذکرہ نگاروں کی جملہ تفصیلات ...ور جزئیات ان کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ ۱۹۶۱ء میں جب تاج صاحب مجلس ترقیٔ ...دب سے وابستہ ہوئے تو ان کے ایما پر داؤدی صاحب نے اُردو کے کلاسیکی ادب کی تدوین پر توجہ کی۔ ان کے یہ تدوینی کارنامے بڑے متنوع ہیں۔ شعری متن، تذکرے، سوانح و تنقید اور متعدد داستانی متن ان کی مساعی کے نتیجے میں صحت کے ساتھ مدون ہو کر اہلِ علم کے سامنے آئے۔ ان تمام تدوینی کاموں میں داؤدی صاحب کی وسعتِ

مطالعہ، غیر معمولی تجزیاتی صلاحیت، ذہنی مرعوبیت سے ماورا بے لاگ تبصرے اور کم و بیش تمام مآخذ سے استفادے کی صورتیں دِکھائی دیتی ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں جب تاج صاحب کا انتقال ہوا، داؤدی صاحب نے اُردو تحقیق کا کوچہ چھوڑا اور عربی مخطوطات کی چھان پھٹک کو اپنی آیندہ زندگی کا منشور بنایا، جس طرح ایک رند بلانوش کے لیے شرابِ کہنہ ناگزیر بن جاتی ہے، داؤدی صاحب کے لیے قلمی مخطوطات سانس کی طرح ناگزیر ہو گئے۔ یہی قدیم و کہنہ مخطوطات ان کے لیے حیات و حرارت کا باعث تھے اور صورتِ حال یہ تھی:

شرابِ کہنہ کہ روشن گر روان من است
مصاحبِ من و پیرِ من و جوانِ من است!

داؤدی صاحب سے جب کبھی ان کے اُردو کے تدوینی کارناموں کا ذکر آیا، اُنھوں نے اُنھیں کوئی خاص اہمیت نہ دی حال آنکہ اہلِ علم کی نگاہ میں یہ تدوینی کام آج بھی بہت حد تک قابلِ توجہ ہیں۔ کہا کرتے تھے میرے اصل علمی کام تو میرے وہ ہزاروں نوٹ ہیں جو میں نے پچھلے تیس بتیس برس میں عربی فارسی مخطوطات پر لکھے ہیں۔ اگر یہ نوٹ مدوّن ہو کر شائع ہو جائیں تو علم و تحقیق کی متعدد نئی راہیں کھلیں گی۔ میں سوچتا ہوں کہ اس ملک میں عربی (اور فارسی) زبان و ادب کو جس تیزی سے زوال آیا ہے اور یہ زبانِ مبین جس تیزی سے طاقِ نسیاں پر رکھی گئی ہے، اس کے پیشِ نظر یہ اُمید کہاں ہو سکتی ہے کہ کوئی روشن ضمیر علم دوست ان قیمتی شذرات کو محفوظ و مدوّن کرنے کا اہتمام کرے گا۔

داؤدی صاحب نے اپنی حینِ حیات پاکستان کی لائبریریوں کو مناسب داموں پر لاتعداد اُردو، فارسی اور عربی قلمی نسخے اور مطبوعہ کتب فراہم کیں۔ خدا کرے کہ افراتفری اور سامراجی تگ و تاز کے اس تاریک لمحے میں یہ بے مثال علمی اور قلمی

سرمایہ محفوظ رہ سکے اور آنے والی نسلیں اپنے اس تہذیبی سرمایے سے فیض یاب ہو سکیں۔

داؤدی صاحب کی زندگی کے ابتدائی پچاس برس انتہائی ہنگامہ خیز گزرے۔ اس زمانے میں اُنھوں نے فری لانس صحافی کے طور پر متعدد اخبارات میں مقالات و مضامین شایع کیے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء تک ریڈیو پاکستان لاہور سے فیچر نگاروں اور مقرروں کے پینل پر بھی رہے۔ سیکڑوں تقریریں کیں اور مضامین لکھے۔ اخبارات میں لکھے گئے مضامین ان کے علاوہ ہیں۔ ان مضامین میں غیر معمولی تنوع ہے۔ یہی تنوع ان کی تدوین کا جواز ہے۔ خدا کرے کوئی نوجوان محقق ان عمدہ علمی مضامین کو مرتب کر کے شایع کردے۔ اس باب میں عزیزی رفاقت علی شاہد سے بڑی اُمیدیں ہیں۔

اُردو کے حوالے سے ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ''دیوانِ غالب، نسخۂ لاہور'' کے ضمن میں ان کا وہ محاکمہ ہے، جس میں اُنھوں نے کمالِ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے، ایک نام نہاد غالب شناس کی استعدادِ علمی کا پردہ چاک کیا تھا اور میرے موقف کی بھرپور تائید کی تھی۔ پاکستان کے بزرگ محققین میں وہ واحد شخص تھے جنھوں نے اس معرکے میں اپنی بے لاگ رائے کا کھل کر اظہار کیا تھا۔

داؤدی صاحب ہماری بزرگ نسل کے وہ فردِ فرید تھے جو نام ونمود سے بالکل بے نیاز تھے۔ میں نے نو دس برس پہلے اُن سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنی حیات اور ادبی خدمات پر ایم اے اُردو کا تحقیقی مقالہ لکھنے کی اجازت دیں۔ وہ میری اس خواہش کو ہر سال نظرانداز کرتے اور طرح دے جاتے تا آنکہ ۱۹۹۹ء میں اُنھیں ہار ماننتے ہی بنی اور ایک اچھا تحقیقی مقالہ رابعہ رضوی کی مساعی سے ظہور میں آیا۔ داؤدی صاحب کی بے نیازی اپنی جگہ مگر رسائل و جرائد کے مدیروں اور اکادمی ادبیات جیسے اداروں نے اُنھیں مسلسل نظرانداز کر کے ان کا نہیں، علمی روایات کا بڑا نقصان کیا۔ خدا

بھلا کرے تسلیم احمد تصور کا کہ انھوں نے مسلسل مطالبے کر کر کے بالآخر اپنے پرچے کے لیے ان کا ایک مفصل انٹرویو کیا اور اسے شایع کیا۔ جنوری ۲۰۰۱ء میں ان کا شائع ہونے والا یہ انٹرویو ان کی زندگی کا آخری مصاحبہ تھا جو ان کی شخصیت اور ان کے زاویۂ نگاہ کی نہایت خوبی سے وضاحت کرتا ہے۔ کاش حکومتِ پاکستان ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے لیے بعد از مرگ پرائیڈ آف پرفارمنس کا اعلان کرے۔ یہ حکومت کے لیے ایک اعزاز ہوگا اور پرائیڈ آف پرفارمنس پر سچے ادیبوں کے اعتماد کی بحالی کا موجب ہوگا۔

داوٗدی صاحب رخصت ہو گئے اور اپنے احباب کے دلوں میں ایک بے مہر خلا چھوڑ گئے۔ وہ زندہ تھے تو اپنے اطاقِ مخطوطات میں پلنگ پر ٹیک لگائے اپنے کام میں مگن اور اپنے گنے چنے احباب کے لیے چشم براہ رہتے تھے۔ پلنگ پر سے تیزی سے اترتے۔ باہر نکل کر مہمانوں کا خیر مقدم کرتے۔ اس وقت خوشی اور مسرت سے ان کی کیفیت شبلی کے اس شعر کے مصداق ہوتی تھی:

سینہ کہتا تھا کہ خلوت گہِ دل حاضر ہے
آنکھیں کہتی تھیں کہ دو اَور بھی تیار ہیں گھر!

ان کی ناگہانی موت کی خبر سن کر ان کے گھر پہنچا۔ ان کی دہلیز پر قدم رکھا تو وہ پذیرائی کے لیے موجود نہ تھے، ان کا اطاقِ مخطوطات مقفل تھا۔ کان ان کی آواز پر لگے تھے، مگر وہ تو ایک دوسری اقلیم میں قدم رکھے خود گوش برآواز تھے اور ندائے غیب ان لفظوں میں ڈھل رہی تھی:

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

انٹرویو: تسلیم احمد تصور

جناب خلیل الرحمٰن داؤدی

سے مکالمہ

ممتاز ماہرِ غالبیات خلیل الرحمٰن داؤدی کی زندگی مایۂ ناز ادبی کارناموں سے عبارت ہے، انہیں برصغیر میں مخطوطہ شناسی کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ گزشتہ دِنوں ایک خصوصی ملاقات میں اُنہوں نے اپنے بعض معاصرین اور معاصر ادب کی صورتِ حال پر اظہارِ خیال کیا۔ داؤدی صاحب کے تأثرات بلا کم و کاست نذرِ قارئین ہیں۔

سوال: آپ کی بنیادی تعلیم سائنس کی تھی۔ آپ نے علی گڑھ سے بی ایس سی کیا، لیکن اس کے بعد آپ نے علومِ شرقیہ کے امتحان پاس کیے۔ اس تبدیلی کے اسباب کیا تھے اور اس سے آپ کی شخصیت میں کیا اساسی تبدیلیاں رونما ہوئیں؟

جواب: فی الاصل میں ہائی سکول کی جماعتوں سے گریجویشن تک سائنس کا طالب علم رہا۔ اسی زمانے میں ملک تقسیم ہو گیا اور میں پاکستان چلا آیا۔ حالات کی ستم ظریفی کہ میں سائنس داں بنتے بنتے اُردو کا ادیب بن گیا۔ لیکن سائنس کی بنیادی تعلیم سے

میرے مزاج میں عقل پسندی، توازن، استدلال اور استخراجِ نتائج میں سائنٹیفک اندازِ نظر پیدا ہو گیا، جس نے ادبیات کے سلسلے میں میری تحقیقی کاوشوں کو جلا بخشی۔

سوال: ایک زمانے میں آپ صحافت سے بھی وابستہ رہے اور بڑے عہد ساز اخبارات میں لکھتے رہے۔ چراغ حسن حسرت اور متعدد ممتاز صحافیوں سے آپ کا ربط ضبط رہا۔ اس زمانے کی صحافت اور آج کی صحافت میں آپ کو کیا بنیادی فرق نظر آتا ہے۔

جواب: بے شک میں ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیانی عرصے میں فری لانس صحافی بھی رہا لیکن میرا تعلق ادبیات سے تھا۔ اس زمانے میں جو صحافی تھے وہ بنیادی طور پر ادیب تھے یعنی ادب کے زینے سے صحافت میں داخل ہوئے تھے اس لئے ادیب زیادہ اور صحافی کم تھے لیکن رفتہ رفتہ صحافت سے ادب کم ہوتا گیا اور صحافت نے ادب کی جگہ لے لی اور ہر صحافی ادیب ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس زمانے میں روزناموں کے جو ہفتہ وار ادبی ایڈیشن نکلتے تھے وہ تشنگانِ ادب کو مکمل طور پر سیراب کر دیا کرتے تھے لیکن آج کل روزناموں کے ادبی ایڈیشنوں میں تمام تر صحافت چھائی ہوئی ہے اور تحریروں میں وہ گہرائی اور گیرائی باقی نہیں رہی۔ شاید اس کی وجہ صحافیوں کا علمی پس منظر بھی ہے۔ جدید صحافت بے شک تکنیکی طور پر مستحکم ہوئی ہے لیکن صحافی کو وہ احساسِ تفاخر نہیں ہوتا جو اس زمانے میں سول سروس کو لات مار کر ایک معمولی مشاہرہ کا صحافی بننے پر ہوتا تھا۔ اب یار لوگ صحافت کی ڈگریاں لے کر سرکاری محکموں میں افسر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ناکامی کے بعد اخباری دفاتر کا رُخ کرتے ہیں۔

سوال: آپ ریڈیو پاکستان سے بھی بحیثیت ایک مقرر اور فیچر نگار وابستہ رہے اور یہ سلسلہ کئی برسوں تک چلا۔ یہ کوچہ کیوں چھوڑ دیا؟

جواب: میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء تک ریڈیو پاکستان لاہور سے مقررین اور فیچر نگاران

کے پینل پر رہا اور باقاعدگی سے فری لانس صحافی کے ساتھ ساتھ یہ خدمت بھی انجام دیتا رہا، لیکن جب ایوب خاں کی بنیادی جمہوریتوں کا نظام آیا تو آغا بشیر صاحب اسٹیشن ڈائریکٹر لاہور کی طرف سے مجھے پیغام ملا کہ اربابِ اختیار کی خواہش ہے کہ میں بنیادی جمہوریتوں کے نظام کی برکات اور فوائد کے سلسلے میں ریڈیو اسٹیشن سے چند تقاریر کا ایک سلسلہ شروع کروں۔ میں چونکہ اس نظام کو قومی نقطۂ نظر سے مفید نہیں سمجھتا تھا، اس لیے میں نے صاف کہہ دیا کہ میں کسی مذاکرے میں اس کے خلاف تو بول سکتا ہوں، لیکن اس کے حق میں دلائل نہیں دے سکتا۔ اس پر بریگیڈیئر ایف آر خاں صاحب ناراض ہو گئے، نتیجہ میں میرا ریڈیو پاکستان لاہور سے رابطہ منقطع ہو گیا اور ایوب خانی دور میں یہ منقطع ہی رہا۔ اس کے بعد میں نے کبھی اس طرف کا رُخ نہیں کیا۔

سوال: ۱۹۶۱ء میں آپ نے مجلس ترقیٔ ادب لاہور کے لیے تدوینِ کتب کا سلسلہ شروع کیا۔ تاج صاحب کے بعد مجلس ترقی ادب، ادب کی ترویج اور شعری و نثری متون کی اشاعت کے ضمن میں اتنی فعال نہیں رہی، جتنی تاج صاحب کے زمانے میں تھی۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس کے اسباب؟

جواب: جنرل ایوب خاں نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء نافذ کر کے ملک کا نظام و نسق سنبھال لیا اور دوسرے اقدامات کے علاوہ میاں افتخار الدین کے ادارے پروگریسو پیپر لمیٹڈ (PPL) کے اخبارات پاکستان ٹائمز، امروز، لیل و نہار وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ فیض احمد فیض ایڈیٹر پاکستان ٹائمز بھی فارغ کر دیئے گئے تھے۔ ان کے دوستوں میں سے جسٹس ایس اے رحمٰن اور ایس ایم شریف فیڈرل ایجوکیشن سیکرٹری نے سیّد امتیاز علی تاج صاحب آنریری سیکرٹری پاکستان آرٹس کونسل سے کہا کہ وہ اگر اس اعزازی جگہ کو چھوڑ دیں تو اس جگہ کو تنخواہ دار بنا کر اس پر فیض صاحب کو فائز کر دیں

گے۔ اس کے ساتھ تاج صاحب سے کہا گیا کہ وہ مجلس ترقیٔ ادب کو سنبھال لیں، جس پر اس زمانے میں ایک بیمار اور معطل الاعضاء صاحب کریم احمد خاں صرف اس لیے بیٹھے ہوئے تھے، بلکہ لیٹے ہوئے تھے کہ ان کا لڑکا نسیم احمد فنانس ڈیپارٹمنٹ میں تھا، جہاں سے مجلس ترقیٔ ادب، کو گرانٹ ملتی تھی۔ تاج صاحب اس پر آمادہ ہو گئے۔ پاکستان آرٹس کونسل کے تنخواہ دار سیکرٹری فیض احمد فیض بن گئے اور مجلس ترقیٔ ادب کی نظامت ۱۳ر جنوری ۱۹۶۰ء کو تاج صاحب نے سنبھال لی۔ اسی روز سے میں مجلس کے کاموں میں تاج صاحب کا ہاتھ بٹانے لگا۔ رفتہ رفتہ ہم نے اس ادارے کو علمی و تحقیقی موضوعات پر نادر کتابوں کی اشاعت کا ایک مرکز بنا دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تمام نامور اہلِ قلم سے کام کرایا اور شائع کیا۔ مجلس کے مجلّہ صحیفہ کی ادارت سیّد عابد علی عابد سے لے کر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے سپرد کی گئی جس کی وجہ سے صحیفہ نے جلد ہی دانشوروں کے حوالے کی کتابوں والے شیلف میں جگہ حاصل کر لی اور صحیفہ برصغیر کے گنتی کے چند مجلّات میں شمار ہونے لگا۔ مجلس کے مستقل ملازم اسکالرز کے لیے کلب علی خاں فائق رام پوری اور گوہر نوشاہی صاحب کو رکھ لیا، جن کی مرتبہ و مولفہ کتابیں مجلس کی آبرو ہیں۔ میں نے بھی مجلس کے لیے ۳۰ کتابیں مرتب کیں، جن میں سے ۱۶ کتابیں تو سیّد امتیاز علی تاج صاحب ناظمِ مجلس کی حیات میں شائع ہو گئیں۔ ۴ کتابیں تاج صاحب کے انتقال کے وقت طبع ہونے سے رہ گئی تھیں جو موجودہ ناظم مجلس ترقیٔ ادب کے دور میں ۲۸ سال تک زیورِ طبع سے محروم رہی ہیں۔ میری مرتبہ کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مذھبِ عشق، مطبوعہ ۱۹۶۱ء

(۲) دیوانِ درد، مطبوعہ فروری ۱۹۶۲ء

(۳) قواعدِ زبانِ اُردو، مطبوعہ دسمبر ۱۹۶۲ء

(۴) نورتن، مطبوعہ دسمبر ۱۹۶۲ء

(۵) بہارِ دانش، مطبوعہ ستمبر ۱۹۶۳ء

(۶) سروشِ سخن، مطبوعہ ستمبر ۱۹۶۳ء

(۷) یادگارِ غالب، مطبوعہ دسمبر ۱۹۶۳ء

(۸) تذکرہ بہارستانِ ناز، مطبوعہ مارچ ۱۹۶۵ء

(۹) تذکرہ گلستانِ سخن، جلد اوّل، مطبوعہ جون ۱۹۶۶ء

(۱۰) تذکرہ گلستانِ سخن، جلد دوم، مطبوعہ جنوری ۱۹۶۷ء

(۱۱) قصہ اگر گل، مطبوعہ جنوری ۱۹۶۷ء

(۱۲) اُردو کی قدیم منظوم داستانیں، مطبوعہ جون ۱۹۶۷ء

(۱۳) مجموعہ نثرِ غالب اُردو، مطبوعہ نومبر ۱۹۶۷ء

(۱۴) کلیاتِ انشاء، جلد اوّل، مطبوعہ جولائی ۱۹۶۹ء

(۱۵) رسومِ ہند، مطبوعہ ۱۹۶۱ء

(۱۶) قصصِ ہند، مطبوعہ ۱۹۶۱ء

ان کے علاوہ مرقومۃ الذیل ۴ کتابیں تاج صاحب کے انتقال کے بعد ۲۸ سال تک مجلس کے دفتر میں پڑی رہیں اور موجودہ ناظمِ مجلس نے انہیں شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

(۱۷) کلیاتِ انشاء، جلد دوم، مرتبہ ۱۹۶۹ء

(۱۸) قصہ گل وصنوبر، نیم چند کھتری، مرتبہ جنوری ۱۹۶۶ء

(۱۹) طلسمِ حیرت مصنفہ جعفر علی شیون لکھنوی، مرتبہ ۱۹۶۶ء

(۲۰) فسانۂ عجائب مصنفہ رجب علی بیگ سرور، لکھنوی، مرتبہ ۱۹۶۶ء

میرا طریقۂ کار ہمیشہ یہ رہا ہے کہ میں جس موضوع پر لکھنا چاہتا ہوں، کوشش

کرتا ہوں کہ اس موضوع پر اس وقت تک دُنیا بھر میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے، وہ میرے مطالعہ سے گزر جائے اور میں اس سے گزر کر اس موضوع پر مزید کچھ اضافے کر سکوں۔ ترتیبِ متن کے سلسلے میں کوشش کرتا رہا ہوں کہ جو کچھ مصنف نے لکھا ہے، وہی دریافت کر کے پیش کر دیا جائے۔ جس کتاب کا متن ترتیب دیتا ہوں، کوشش کرتا ہوں کہ اسی کتاب کے تمام ممکن الحصول نسخوں تک رسائی ہو جائے تاکہ مصنف کا اپنا تصنیف کیا ہوا متن دریافت ہو جائے۔ ساتھ ہی مختلف نسخوں کے اختلافِ متن کو بھی واضح کر دیا جائے۔ میں نے کسی موضوع پر لکھتے ہوئے آخری وقت تک اگر اس موضوع پر دنیا بھر میں کہیں سے بھی کچھ ملا ہے، تو اس سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً مری مرتبہ اگر گل، چھپ کر پریس سے آ گئی تھی۔ میں اس کے مقدمہ میں یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ یہ عاصی کی تصنیف ہے یا ناصر کی۔ مقدمہ لکھتے وقت تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا مصنفہ سعادت خاں ناصر مجھے نہیں ملا تھا۔ جب اگر گل چھپ کر آئی تو تاج صاحب نے بتایا کہ مشفق خواجہ صاحب کا مرتبہ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا آ گیا ہے۔ میں نے دیکھا تو اس کے مؤلف سعادت خاں ناصر نے لکھا تھا کہ اگر گل، اس کی تصنیف ہے۔ میرا مسئلہ حل ہو گیا اور میں نے فوراً پسِ طباعت کے عنوان سے ایک چٹ چھپوا کر مقدمے کے آخر میں لگوا دی کہ کتاب کے چھپ جانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سعادت خاں ناصر کی تصنیف ہے۔ اسی طرح سے میں نے کوشش کی ہے کہ جس موضوع پر میں قلم اُٹھا رہا ہوں، اس پر اُس وقت تک لکھا ہوا تمام مواد استعمال کر لیا جائے اور موضوع آگے بڑھایا جائے۔ اگر آپ کسی موضوع پر معلومہ مواد میں اضافہ نہیں کر سکتے تو پھر آپ کو اس موضوع پر قلم اُٹھانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔ آپ سے پہلے اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے، آپ اس کی کوتاہیوں، لغزشوں، فروگذاشتوں اور تسامحات کی نشاندہی کر کے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں، ورنہ آپ کو خواہ مخواہ خامہ فرسائی کی کوئی

ضرورت نہیں ہے۔ میری تمام تحریریں اسی ضابطۂ کار کے تحت معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ کسی مصنف کی کسی تحریر کو مطالعہ کرتے وقت مطالعہ کنندہ کو یہ ضرور ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کہ وہ کب ضبطِ تحریر میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد بھی تحقیق کے دروازے کھلے ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ توفیقِ ایزدی نصیب ہو جائے۔ اس لیے کسی پرانی تحریر کو آج کی تحقیقات سے فیض یافتہ دور میں نہیں پرکھا جا سکتا۔ اسے اسی دور میں جا کر دیکھنا ہو گا۔ مثلاً مجلس ترقی ادب نے میری یہ کتابیں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیانی عشرے میں شائع کی ہیں، جنہیں ۲۵ سے تیس پینتیس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ ان تیس پینتیس سال میں علمی تحقیقات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے، لیکن پھر بھی مجھے یقینِ کامل ہے کہ میں نے جن موضوعات پر اپنا حاصلِ مطالعہ قلمبند کیا ہے، اس میں کوئی معتد بہ اضافہ نہیں ہوا ہوگا۔ اور میری وہ تحریریں آج بھی اسی طرح تازہ ہیں، جس طرح پینتیس چالیس سال قبل تھیں۔ یہی کیفیت میرے ادارتی مضامین اور ریڈیو کی نشریات کی بھی ہے جو چالیس پچاس سال قبل حلیہ نشر و اشاعت سے متحلّی ہوئے ہیں۔

میرا اُردو نگاری کا تقریباً ۲۰ سال کا دور ۱۹۷۲ء میں حادثاتی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ مجلس ترقیٔ ادب کا زریں دور بھی ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۱ء ۱۰ سالہ عرصہ کو محتوی ہے۔ ان دس سالوں میں اس ادارے نے معیار اور تعداد کے اعتبار سے اتنا عظیم الشان ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، جس کی نظیر پورے برصغیر میں ملنی محال ہے۔ مجلس نے اس کے مقابلے میں بعد کے تقریباً ۳۰ سالوں میں اس کا عشرِ عشیر کام بھی نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجلس ترقیٔ ادب کا وہی ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیانی عرصے کا کیا ہوا کام ہی مجلس کی آبرو ہے۔

سوال: آپ نے مجلس ترقیٔ ادب کے لیے مذہبِ عشق، بہارِ دانش، نورتن، سروشِ سخن، قصۂ اگرگل اور قدیم منظوم داستانیں مرتب کیں۔ آج جب اکیسویں صدی ہمارے دروازے پر دستک دے رہی ہے، داستانی ادب کا کوئی جواز باقی ہے؟

جواب: جی ہاں ہے، تمام زندہ قومیں اپنے کلاسیکی سرمایہ کو محفوظ رکھتی ہیں۔ داستانی ادب ہمارا کلاسیکی سرمایہ ہے۔ اُردو ہماری قومی زبان ہے۔ اُردو کی پیدائش کا زمانہ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو سال کا ہے۔ اس کی ابتداء شاعری اور داستان نویسی سے ہوئی۔ ہماری زبان کے اوّلین نثری نقوش داستانوں کی شکل میں ہی تھے جو کسی ترقی یافتہ قوم کے کلاسیکی ادب سے کسی صورت کمتر نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے ان بزرگوں کے کارناموں کو محفوظ کرنا ضروری ہے۔

سوال: اُردو ادب کا ایک نمایاں شعبہ غالبیات ہے۔ آپ نے اس ضمن میں حالی کی ''یادگارِ غالبؔ'' مرتب کی۔ غالب کے سوانح اور فن کے حوالے سے آپ نے یادگارِ غالب کو ایک ناکام کتاب قرار دیا تھا۔ کیا اب بھی آپ کا یہی خیال ہے؟

جواب: جی ہاں! یادگارِ غالب کے مؤلف سے ہمیں یہ توقع تھی کہ وہ مرزا کی زندگی کے ان گوشوں پر روشنی ڈالیں گے جو عام نظروں سے اوجھل ہیں اور حالی ان توقعات پر پورے نہیں اترے۔ حالی نے ۱۸۵۷ء سے قبل بھی کچھ عرصہ غالب کی صحبت میں گزارا اور ۱۸۵۷ء کے بعد جب وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کے اتالیق بن کر برسوں شیفتہ کے ہاں رہے تو وہ مرزا غالب کی صحبت سے بھی مستفید ہوتے رہے۔ ثانیاً یہ کہ وہ مرزا غالب کے تمام عزیزوں کو جانتے تھے۔ مرزا غالب کے برادرِ نسبتی جو مرزا کے قریب ترین سمجھے جاتے تھے، یعنی نواب ضیاء الدین خاں نیرو رخشان کی حالی سے دوستی تھی۔ لوہارو خاندان تک جو مرزا غالب کی سسرال تھا، حالی کی رسائی تھی۔ مرزا غالب[۱۳]

سال کی عمر سے دہلی میں آ گئے تھے یعنی شادی کے بعد اُنہوں نے اکبر آباد چھوڑ دیا تھا اور دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ غالب دوستوں میں مفتی صدر الدین آزردہ، امام بخش صہبائی، فضل حق خیر آبادی، عبداللہ علوی، حکیم مومن خاں مومن دہلوی، حکیم احسن اللہ خاں تھے۔ حالی اگر چاہتے اور کاوش کرتے تو مرزا غالب کے حالاتِ زندگی زیادہ مکمل صورت میں ہم تک پہنچا سکتے تھے۔

حالی کے زمانے میں مرزا کے اکبر آباد کے بچپن کے ساتھی بھی حیات تھے، جن سے غالب کے بچپن کے ۱۳ سال تک کے واقعات بہ آسانی حاصل ہو سکتے تھے، لیکن حالی نے اس کی کوشش ہی نہیں کی۔ یادگارِ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا، جس کے ۴۰۰ صفحات میں سے صرف ۹۷ صفحات پر سوانح حیات ہیں اور ۳۰۳ صفحات پر اُن کی شاعری کا جائزہ۔ سوانح کے ۹۷ صفحات میں بھی لطائف و مضحکات زیادہ ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ مرزا غالب پر کتاب لکھتے وقت حالی نے مرزا کی تصانیف کا مطالعہ تک نہیں کیا۔ حالی نے سوانحی حصہ میں بہت سی ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو مرزا کی اپنی تحریروں سے متصادم ہیں۔ اتنی سہل انگاری تو عام ادیب بھی نہیں کرتا کہ جس شخص پر کتاب لکھی جائے، اس کی تصانیف تک کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ یادگارِ غالب میں سوانحی حصہ بہت کمزور ہے۔ ۳۰۳ صفحات پر مرزا کی شاعری کا عرفی سے خاقانی سے اور دوسرے شعرائے فارسی سے موازنہ کیا گیا ہے۔ یہ کام بعد میں آنے والے لوگوں پر بھی چھوڑا جا سکتا تھا۔ البتہ سوانحی حصے کو بھرپور ہونا چاہیے تھا۔ حالی کو جتنے وسیع وسائل حاصل تھے، انہیں استعمال کر کے زندگی کا ہر گوشہ سامنے لایا جا سکتا تھا، جس میں حالی ناکام رہے۔

سوال: پاکستان میں غالب شناسی کے باب میں ہونے والے کام سے آپ کہاں تک

مطمئن ہیں؟

جواب: جو کچھ ہو رہا ہے، وہ بہت غنیمت ہے۔ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن کے مرتبہ دیوانِ غالب، نسخۂ لاہور کے سلسلے میں ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب نے جس بحث کا آغاز کیا، اس تسلسل میں جن معتبر شخصیتوں کی کاوشیں منظرِ عام پر آئیں، وہ سرمایۂ غالبیات میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ جناب لطیف الزماں خاں صاحب، ڈاکٹر عارف ثاقب صاحب، سیّد قدرت نقوی صاحب وغیرہ نے اپنی نگارشات سے اس بحث میں حصہ لے کر بڑا اطمینان بخش مواد پیش کیا ہے۔ پاکستان سے درجۂ اوّل کے کم از کم تین غالب شناس ایسے پیدا ہوئے جن کی نظیر، وہ خود ہیں۔ وہ غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام ور مالک رام ہیں۔ وہ تینوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نئی نسل کے لکھنے والوں میں بھی بڑی صلاحیتیں موجود ہیں، جو سامنے آ رہی ہیں، بالخصوص ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنی پہلی کوشش میں ہی غالب شناسی کا لوہا منوا لیا ہے اور اُنہوں نے برسوں میں حاصل ہونے والی منزل کو ایک زقند میں ہی پا لیا ہے جس کے لیے ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن لائقِ تحسین و تبریک ہیں کہ اگر ان کا دیوانِ غالب نسخۂ لاہور منظرعام پر نہ آتا تو ڈاکٹر تحسین فراقی کو بھی غالب شناسی کے سلسلے میں اپنے جوہر دِکھانے کا موقع نہ ملتا۔(۱)

سوال: ان دِنوں پاکستان میں دیوانِ غالب کے نسخۂ لاہور کے حوالے سے بحث مباحثے کی فضا گرم ہے۔ اسی ضمن میں آپ اپنے موقف سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ مرتبہ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن کے سلسلے میں میری رائے کا اظہار ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ--- اصل حقائق'' میں کر چکے ہیں، جس کے جواب میں ایک کتابچہ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن بعنوان ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ--- صحیح صورتِ حال'' شائع فرما چکے ہیں، لیکن سیّد صاحب موصوف نے فراقی

...ب کے بے شمار وزنی اعتراضات میں سے کسی ایک اعتراض کا جواب بھی نہیں دیا
ہے بلکہ

جوابِ خط پہ وہ غور مسلسل
لکیریں سی بنا کر رہ گئے ہیں

البتہ ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کے اعتراضات کی کلیتہً تائید کے علاوہ مزید اعتراضات وارد کرتے ہوئے ملک کے مقتدر اربابِ فضل و کمال نے اعلائے کلمۃ الحق کے ضمن میں غالب شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مثلاً لطیف الزماں خاں صاحب، ڈاکٹر عارف ثاقب، سیّد قدرت نقوی صاحب وغیرہ کی نگارشات لائقِ داد ہیں۔

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن نے ان میں سے کسی کا جواب نہیں دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے اعتراضات اس درجہ مدلل، مثبت اور مسکت ہیں کہ سیّد صاحب کے پاس ان کا کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ علمی دنیا کے بڑے بڑے جغادری محققین سے ہمدردی ہے جنھوں نے نسخۂ خواجہ کی کاوش و ترتیب و تدوین کو داد دیتے ہوئے مُعین صاحب کی شان میں جو قصائد لکھے تھے۔ مُعین صاحب نے ایسے ۷۰، ۷۵ ممتاز اہلِ قلم کی آراء کو جمع کر کے ''نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحسین'' کے عنوان سے اپنی مستقل تصنیفات و تالیفات میں شامل کر لیا ہے۔ مُعین صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اتنے سنگین، خوفناک، اندوہناک، کربناک، افسوسناک اور شرمناک اعتراضات کی دھول جلد ہی بیٹھ جائے گی۔ لوگ بھول جائیں گے اور میری کتاب ''نسخۂ خواجہ --- تحسین و تجزیہ'' باقی رہے گی اور آئندہ نسلوں کو یہی ملے گا۔ نسخۂ خواجہ کے سلسلے میں اپنی رائے کے اظہار کے لیے میں ''السابق الاول'' ہوں جس نے سب سے پہلے یہ انکشاف کیا تھا کہ سیّد مُعین الرحمٰن صاحب نے جو نسخہ مرتب کیا ہے، وہ پنجاب یونیورسٹی والا وہی نسخہ ہے جس پر سیّد عبداللہ نے ماہِ نو میں مضمون لکھا تھا۔ سیّد مُعین الرحمٰن نے یہ نسخہ کسی کباڑی سے

خریدنے کی جو کہانی گھڑی ہے وہ کذب بیانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کہانی میں دیوانِ غالب کے متنازعہ مخطوطے کے علاوہ تین مطبوعہ اور دو دوسرے مخطوطات بھی مذکور تھے۔ حالانکہ ان پانچوں کتابوں کا دیوانِ غالب سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ نسخۂ خواجہ کی ترتیب و تدوین میں ان میں سے کسی کتاب کو بطور ماخذ استعمال کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سیّد مُعین الرحمٰن صاحب نے ان پانچوں کتابوں کو بھی نسخۂ خواجہ کے آخر میں اپنے ماخذات میں شامل کیا ہے۔ غالباً سیّد صاحب ''ماخذ'' کے معنی نہیں سمجھتے ہیں۔ مطلقاً غیر متعلق کتابوں کو ماخذات کی فہرست میں صرف وہی شخص شامل کر سکتا ہے جو اصولِ ترتیبِ متن کی مبادیات سے بھی بے بہرہ ہوگا۔ لطف کی بات ہے کہ سیّد صاحب موصوف نے ان غیر متعلق ۵ کتابوں میں سے ایک مخطوطہ معارج النبوۃ کی نسبت تحریر فرمایا ہے:

''۴۔ فارسی مخطوطہ، معارج النبوۃ (قلمی ۱۴۸۶ء) ملا مُعین الدین واعظ کاشفی (وفات ۱۵۰۱ء)''

سیّد مُعین الرحمٰن صاحب نے ''معارج النبوۃ'' کے سلسلے میں صرف یہی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سیّد مُعین الرحمٰن صاحب مخطوطات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ معلوم نہیں اُنھوں نے معارج النبوۃ کے مخطوطے کو اتنا نادر کیوں سمجھا ہے۔ وجۂ ندرت تو کوئی بتائی نہیں۔ انہیں غالباً علم نہیں کہ معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ متعدد بار شائع ہو چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی بکثرت دستیاب ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کا کوئی قلمی نسخہ اس وقت اہم و نادر ہوتا ہے جب کوئی وجۂ ندرت ہو۔ مثلاً بخطِ مصنف ہو، کسی نامور عالم یا ممتاز خطاط کے قلم کا شاہکار ہو یا قدیم الکتابت ہو وغیرہ وغیرہ۔ معارج النبوۃ کے سلسلے میں سیّد صاحب نے ایسی کسی ندرت کی نشان دہی نہیں فرمائی ہے۔ حد یہ ہے کہ مؤلف کا نام بھی غلط لکھا ہے۔ اس سلسلے میں دو مختلف شخصیتوں کے

ںوں کو خلط کر دیا ہے۔ معارج النبوۃ کے مؤلف کا نام مُعین الدین محمد المشتہر بہ مُعین مسکین فراہی متوفّٰی ۹۰۷ھ یا ۹۱۰ھ باختلاف اقوال ہے۔ مُعین الرحمٰن صاحب نے مؤلف مُعین الدین کے نام کے ساتھ ''واعظ کاشفی'' لکھا ہے یعنی آدھا نام صحیح ہے اور آدھا غلط جو ایک دوسری معاصر شخصیت ملا حسین واعظ الکاشفی متوفّٰی ۹۱۰ھ مؤلفِ تفسیرِ حسینی کا ہے۔ اس کے نام سے واعظ الکاشفی، نکال کر مُعین الدین کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔ مُعین الدین صاحب معارج النبوۃ فراہی تھے، ہروی تھے لیکن کاشفی ہرگز نہیں تھے۔ کاشفی تو ملا حسین واعظ ہی ہیں۔ مُعین الدین نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ معارج النبوۃ کے سامنے بریکٹ میں ''قلمی ۱۴۸۶ء'' لکھا ہے۔ اس زمانے میں سنہِ کتابت عیسوی نہیں بلکہ ہجری، مروج و مستعمل تھا اور ہجری سنہ ہی لکھا جاتا تھا۔ بے شک ۱۴۸۶ء کے مطابق ۸۹۱ھ ہے جو معارج النبوۃ کا سالِ تصنیف ہے، نہ کہ سنہِ کتابت۔ معارج النبوۃ کا دنیا بھر میں کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے جو ۱۴۸۶ء مطابق ۸۹۱ھ میں کتابت کیا گیا ہو۔ سیّد مُعین الرحمٰن صاحب نے سنہِ تصنیف ۸۹۱ھ کو جنتری کی مدد سے یا کسی کتاب سے ۱۴۸۶ء بنا کر ''قلمی ۱۴۸۶ء'' لکھ دیا۔ اسی طرح سیّد صاحب نے ملا مُعین الدین کے سامنے بریکٹ میں (وفات ۱۵۰۱ء) لکھ دیا ہے۔ وہی اعتراض یہاں بھی ہے کہ مؤلف کی وفات ۹۰۷ھ لکھنے کے بجائے ۱۵۰۱ء لکھ دیا ہے۔ مؤلف کی وفات ۱۵۰۰ء/ ۹۰۷ھ یا ۱۵۰۴ء/ ۹۱۰ھ باختلاف اقوال ہے۔ حاصل یہ کہ سیّد مُعین الرحمٰن صاحب نے معارج النبوۃ کے مخطوطے کے سلسلے میں اس کی کوئی وجہِ ندرت و اہمیت بیان نہیں کی ہے اور جو معلومات مہیا کی ہیں، وہ غلط ہیں۔ دراصل سیّد صاحب کسی مخطوطے کو سمجھنے اور اسے مرتب کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں، اسی لیے اُن کے مرتبہ نسخہ خواجہ میں لغزشوں کی بھرمار ہے جن کی نشاندہی متعدد اہلِ قلم کر چکے ہیں۔

سوال: پچھلے تیس برسوں میں اُردو ادبی تحقیق سے آپ کی دلچسپی میں کمی واقع ہوئی ہے اور آپ نے عربی و فارسی مخطوطات کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنا لیا ہے۔ کیا آپ اس ضمن میں قارئینِ سورج کو اس تبدیلی کے اسباب سے آگاہ فرمائیں گے؟

جواب: جیسا کہ میں واضح کر چکا ہوں کہ سیّد امتیاز علی تاج صاحب مرحوم کے بعد تھوڑے عرصے کے لیے حمید احمد خاں (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی) مجلس ترقیٔ ادب کے ناظم مقرر ہوئے، لیکن وہ بھی جلد اللہ کو پیارے ہو گئے اور جناب احمد ندیم قاسمی صاحب سرخیلِ دانشورانِ ترقی پسند ۳ سال کے لیے ناظم مجلس ترقیٔ ادب مقرر ہوئے لیکن وہ گزشتہ ۳۸ سال سے علی الاتصال اس پیرانہ سالی (عمر ۸۴ سال) کے باوجود ناظم چلے آ رہے ہیں۔ قاسمی صاحب کے مجلس سنبھالنے کے بعد میرا مجلس سے تعلق مطلقاً ختم ہو گیا بلکہ یوں کہیے کہ اُردو سے ہی تعلق ختم ہو گیا۔ میں اپنی پاکستانی زندگی کے اوّلین ۲۵ سال اُردو کا خدمت گزار رہا ہوں۔ مجھے یہ احساس تفاخر ہے کہ میں ان ۲۵ سالوں میں ملک کی ممتاز ترین علمی شخصیتوں کے ساتھ شبانہ روز کی ملاقاتوں اور صحبتوں کی سعادت سے بہرہ مند ہوا ہوں جن میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مولانا صلاح الدین احمد، سیّد عابد علی عابد، حمید احمد خاں، سیّد امتیاز علی تاج، مولوی محمد شفیع، شیخ محمد اکرام اور ممتاز حسن احسن وغیرہ ایسے نابغہ روزگار نفوس شامل ہیں، جن کی ہم نشینی سے مجھے اکتسابِ فیض کے بھرپور مواقع میسر آئے ہیں۔ مجلس ترقیٔ ادب سے سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد میں نے خود کو خالصتاً عربی و فارسی مخطوطات کی تحقیق کے لیے وقف کر دیا۔ اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا ہے، اس کے پیشِ نظر میں یہ کہہ سکتا ہوں:

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

چونکہ طبیعت شروع سے ہی مائل بہ جستجوئے حقائق رہی ہے، اس لیے اس میدان میں آنے کے بعد توسنِ تحقیق کی جولانیاں سرمایۂ تحقیق میں گراں قدر و بیش بہا اضافوں کی موجب ثابت ہوئیں۔ فی الاصل میری علمی کاوشوں کا حامل میرا فارسی و عربی مخطوطات کے سلسلے میں وہ تحقیقی کام ہے جس کی اہمیت کا جائزہ کوئی عربی و فارسی کے میدان کا مرد ہی لے سکتا ہے۔ میں نے اس عرصے میں ہزاروں مخطوطات پر تحقیقی کام کیا ہے۔ کسی مخطوطے پر تحقیق کرتے ہوئے میں نے دنیا بھر کے ذخیرہ ہائے مخطوطات میں محفوظ خطی نسخوں کی توضیحی فہرستوں اور کتبِ حوالہ کو استعمال کیا ہے۔ ایسے بے شمار غیر مطبوعہ اور منحصر بفرد (Unique) خطی نسخوں کو متعارف کرایا ہے، جن سے اہلِ علم ابھی تک بے خبر تھے۔ بہت سے عالموں نے اپنی پوری پوری زندگیوں کا حاصلِ مطالعہ صرف ایک کتاب کی صورت میں چھوڑا، جن میں سے بیشتر امتدادِ زمانہ اور مرورِ ایام کے ہاتھوں مفقود ہو چکی تھیں اور جو باقی تھیں وہ ابھی تک گوشۂ خمول و گمنامی میں پڑی ہوئی تھیں، میں نے اپنی تحقیق سے انہیں منظرِ عام پر لا کر ورثہ علومِ اسلامیہ میں معتد بہ اور گراں بہا اضافے کیے ہیں۔ مخطوطات پر اس قسم کی تحقیق بڑی جاں کاہی اور محنت پژوہی چاہتی ہے۔ ایسا کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ''ستائش کی تمنا'' اور ''صلے کی پروا'' نہ رکھتا ہو۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ بعض اوقات کسی غیر مطبوعہ اور نادر مخطوطے اور اس کے مصنف کے سلسلے میں کئی کئی سو کتابوں کو کھنگالنے کے بعد صرف ڈیڑھ انچ کا یہ جملہ لکھا جاتا ہے کہ تمام کتبِ حوالہ و تذکرہ میں اس کتاب یا اس کے مصنف کا ذکر نہیں ملا ہے۔ اسی طرح غیر معروف مصنف کے حالات کے لیے بے شمار کتابوں کے مطالعہ کے بعد صرف چند سطریں ملتی ہیں۔ اگر کسی مخطوطے کا متن شائع ہو چکا ہے تو مطبوعہ کتابوں کی فہارس دیکھنے کے بعد ان فہارس کی طباعت کے بعد اب تک مختلف ممالک میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان سے گزر جانے کے بعد ہی یہ لکھا

جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ کسی مخطوطہ کو منحصر بفرد (Unique) لکھنے کے لیے صرف مخطوطات کی فہرستوں کے مطالعہ پر ہی اکتفا نہیں کرنا پڑتا کہ دنیا بھر کے قلمی کتابوں کے جن ذخائر کی فہرستیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں یہ کتاب موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ جن ذخائر کی فہرستیں ابھی تک مرتب ہو کر شائع نہیں ہوئی ہیں، انہیں بھی دیکھا جائے کیونکہ ابھی تک بے شمار ذخائر ایسے موجود ہیں، جن کی فہرستیں مرتب ہی نہیں ہوئی ہیں، شائع ہونا تو بعد کی بات ہے۔ اس کے بعد یہ لکھا جا سکتا ہے کہ زیرِ نظر مخطوطہ منحصر بفرد (Unique) ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جو محققین ایسے کام کرتے ہیں، اس کی دشواری کا انہیں ہی اندازہ ہو سکتا ہے۔ یوں تو میں عربی و فارسی مخطوطات پر تحقیقی کام گزشتہ پچاس سال سے زائد عرصے سے کر رہا ہوں، لیکن مجلس ترقیٔ ادب سے تعلق ختم ہو جانے کے بعد تقریباً ۲۸ سال قبل میں نے اُردو کے بجائے عربی و فارسی مخطوطات پر تحقیق کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اس طویل عرصے میں میں نے اتنا کام کیا ہے جو متعدد جلدوں میں مرتب ہو سکتا ہے۔ اگر کسی وقت وہ مرتب ہو کر شائع ہو گیا تو دنیائے اسلام کے اربابِ تحقیق کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔ آج دنیا کے مختلف کتاب خانوں کی فہارسِ مخطوطات دیکھ کر بہت مایوسی ہوتی ہے۔ سہل انگار فہرست نگار محنت بالکل نہیں کرتے۔ کسی مخطوطہ کا حال صرف چند مخصوص خانوں میں تقسیم کر کے خانہ پری کر دیتے ہیں۔ خانے یہ ہوتے ہیں:

''عنوانِ کتاب، مصنف کا نام اور اگر مل سکا تو سنہِ وفات، موضوعِ کتاب، آغاز کی ایک سطر، اختتام کی ایک سطر، کاتب کا نام، سنہِ کتابت، کتاب کا سائز، ہر صفحہ پر سطور کی تعداد اور تعدادِ صفحات۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ ایک کتاب سے متعلق اس خانہ پری میں ۴ یا ۵ منٹ لگتے ہیں۔ اسی طرح سے ۲۰۰ کتابوں کی فہرست نگاری میں زیادہ سے زیادہ ۲ دن لگیں گے۔ لیجیے صرف دو دن میں ۲۰۰ مخطوطات کی توضیحی فہرست تیار ہو گئی اور بڑی

شان سے اسے ایک علمی کارنامہ کے طور پر شائع کرا دیتے ہیں۔ آج کل مخطوطات کے مختلف ذخائر کی اسی نوعیت کی مرتبہ توضیحی فہرستیں شائع ہو رہی ہیں۔ ان سے صرف اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں مخطوطہ فلاں کتاب خانہ میں موجود ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ نہ کتاب کے متعلق کچھ معلوم ہوتا ہے اور نہ مصنف کے سلسلے میں۔ جب کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ کتاب کے مطالب سے بھی قارئین کو روشناس کراؤں اور مصنف کے پایہ اور مقام کا تعارف کراؤں اور اس نکتہ پر بھی روشنی ڈالوں کہ زیرِ نظر مخطوطہ کس اعتبار سے مابہ الامتیاز ہے۔

سوال: اُردو ادب کی معاصر صورت حال کیا ہے اور آج کل آپ کن موضوعات پر کام کر رہے ہیں۔

جواب: یہ امر اطمینان بخش ہے کہ انفرادی طور پر بھی اور جامعات کی سطح پر بالخصوص اُردو ادب پر قابلِ قدر کام ہو رہا ہے۔ رہا یہ سوال، تو میں واضح کر چکا ہوں کہ گزشتہ ۳۰ سال سے میں نے خود کو مخطوطاتِ عربی و فارسی کی تحقیق کے لیے وقف کر دیا ہے۔ میری عمر ۷۸ سال ہو گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی عمر کے باقی لمحات اس مفید کام پر لگاؤں اور زیادہ سے زیادہ مخطوطات پر تحقیقی کام کر کے آئندہ نسلوں کے حوالے کر دوں۔ یہ کام ہر آدمی کے بس کا نہیں ہے۔ اُردو ادب کے خدمت گزاروں کی کمی نہیں ہے، لیکن محققین مخطوطات خال خال ہیں اور جو ہیں وہ بہت غنیمت ہیں۔

بشکریہ ماہنامہ سورج، لاہور، جنوری ۲۰۰۱ء

---

(۱) قبل ازیں غالب کی شعری و نثری کاوشوں، خصوصاً غالب کے فارسی آثار پر ڈاکٹر تحسین فراقی ''غالب فکر و فرہنگ'' کے زیر عنوان اپنے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ شائع کر چکے تھے۔ [جعفر بلوچ]

شقائق النعمان داوٗدی

والدِ مرحوم کی یاد میں

میرے پیارے ابو خلیل الرحمٰن داوٗدی صاحب کو ہم سے رخصت ہوئے آج ایک سال ہورہا ہے۔ وہ جو ہمیشہ میرے ساتھ رہتے تھے، خاص طور پر ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۲ء، ان کی وفات تک، کا بارہ سال کا جو عرصہ اکٹھے گزرا، وہ ایک سہانے اور حسین خواب کی طرح میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔ ۱۹۹۱ء میں جب میری والدۂ محترمہ کا انتقال ہوا تو والد نے ہمیشہ کوشش کی کہ ہم تینوں بہن بھائی کو ماں کی کمی محسوس نہ ہو۔ ماں کے مرنے کا دکھ درد کسی حد تک ابو کی موجودگی کی وجہ سے کم ہوگیا۔ بچپن ہی سے جہاں ہم تینوں بہن بھائی، یعنی میری بڑی بہن گلِ داوٗدی، چھوٹی بہن شمائلہ داوٗدی اور مجھے: ہماری والدۂ محترمہ نے دینی و ابتدائی تعلیم سے نوازا اور ادب و آداب اور اخلاق کے زیور سے آراستہ کیا، وہاں ہمارے والدِ محترم نے ہمیں دنیاوی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ خود آگاہی کا درس دیا اور دیانت داری، عہد کی پاس داری، امانت داری اور حسنِ سلوک جیسی دولت سے نوازا۔

میرے ابو کی زندگی کا اصول دیانت داری و صداقت شعاری رہا۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ انھوں نے ہماری تربیت بھی اسی زاویۂ نگاہ سے کی۔ اسی وجہ سے کرپشن سے ہمارے ذہن کبھی آلودہ نہیں ہوئے۔ میری بڑی بہن گلِ داوٗدی، جو مقابلے کا امتحان میں کامیاب ہوکر اسسٹنٹ کلکٹر کسٹم بنی

تھیں، اب فلکٹر کستم ہونے والی ہیں؛ وہ اس عہدے سے کم از کم کروڑ پتی بن سکتی تھیں، مگر یہ ابو ہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے چارج کے دوران آج تک کسی سے چائے کی ایک پیالی بھی قبول نہیں کی اور ذہنی طور پر کرپٹ افراد سے دور ہی رہیں۔ میری چھوٹی بہن شمائلہ کے شوہر، جو پاکستان آرمی میں بریگیڈئر ہیں اور آج کل ڈیفنس اتاشی کی حیثیت سے تہران (ایران) میں پاکستانی سفارت خانے میں تعینات ہیں، وہ بھی انتہائی دیانت دار، فرض شناس اور صداقت شعار شخص ہیں۔ ابو اپنی دونوں بیٹیوں اور داماد بریگیڈئر زاہد مبشر شیخ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میری بہن اور مبشر بھائی جب ان سے ملنے آتے تھے تو وہ محبت اور عقیدت سے دل ان کے لیے فرشِ راہ کر دیتے تھے۔ میری چھوٹی بہن شمائلہ مبشر شیخ کے تینوں بچوں سعد (لڑکا)، عائشہ (بیٹی) اور زینب (بیٹی) کے ساتھ بے حد پیار کرتے تھے اور اکثر ٹیلی فون پر ان بچوں سے بات کرتے۔ وہ تینوں بھی ان کو بہت یاد کرتے تھے۔ اسی طرح گھر میں اپنی بہو یعنی میری بیوی راحیلہ فرح نعمان؛ کو اپنی بیٹیوں کی طرح پیار دیا۔ وہ اکثر لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ میری بہو نہیں، میری بیٹی ہے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے کسی بات پر ناراض ہوکر غصے میں اپنی بیوی کو ڈانٹ دیا تو فوراً میری طلبی ہو جاتی اور مجھے ڈانٹ پڑتی تھی کہ اسے جھڑکا نہ کرو؛ پھر ساتھ ہی فرماتے تھے کہ یہ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آئی ہے، اب یہی ہمیشہ کے لیے اس کا گھر ہے، اور پھر یہ میری بیٹی ہے؛ اسے کچھ کہتے ہو تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ میرے تینوں بیٹوں حقائق الایقان داوٗدی (عمر دس سال)، عدنان نعمان داوٗدی (عمر سات سال) اور اشجع الشبان داوٗدی (عمر پانچ سال) سے بے حد پیار کرتے تھے۔ مجھ سے زیادہ، یہ تینوں، اپنے دادا جان سے مانوس تھے۔ دو بڑے بیٹے جب صبح اسکول جاتے تو اپنے دادا جان سے مل کر جاتے، اور وہ دونوں کو پانچ پانچ روپے دیتے تھے۔ گھر کے سامنے دکان پر ان بچوں کے لئے ایک کاپی (ماہانہ ادائی کی

بنیاد پر) کھلوائی ہوئی تھی کہ ان کے پوتے جس وقت چاہیں، اپنی پسند کی کھانے کی چیز خرید سکیں۔ ان کے ساتھ کھیلتے ہوئے بڑی مسرت محسوس کرتے تھے۔ میرے تینوں بیٹے چوں کہ ہر وقت اپنے دادا جان کو کتابیں پڑھتے اور لکھتے دیکھتے تھے، اس لیے شروع ہی سے مطالعہ اور لکھنا ان کا شوق بن گیا۔ میرا سب سے چھوٹا بیٹا اشجع الشبان، جو حال ہی میں اسکول میں داخل ہوا ہے اور ابھی جبکہ وہ لکھنے اور پڑھنے سے نابلد ہے؛ بالکل اپنے دادا کے انداز میں کتابیں کھول کر دیکھتا ہے اور کبھی کسی وقت کسی کاپی پر ترچھی، ٹیڑھی لکیریں کھینچ کر لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ تینوں بھی اپنے دادا کی طرح محنت کر کے میرا اور ان کا نام روشن کریں۔ آمین!

گھر میں ملازموں کے ساتھ ہمیشہ صلۂ رحمی، نرمی اور پیار کے ساتھ پیش آتے تھے۔ گھر میں جب بھی کوئی نیا ملازم آتا تو بہت عرصے تک ان کے اعلیٰ اخلاق، بہترین سلوک کی وجہ سے ملازمت کرتا رہتا تھا، پھر جب کسی کو نوکری سے فارغ کرتے تھے تو اس کو کسی سرکاری ادارے میں ملازم رکھوا دیتے تھے۔ میں نے اپنے بچپن سے اب تک متعدد ایسے ملازم دیکھے، جو اب بھی مختلف سرکاری محکموں میں نوکری کر رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیں نوکروں کے ساتھ حسنِ سلوک، ان کی تمام ضروریات کا خیال رکھنے اور ان سے پیار کرنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اگر بلاوجہ ہم سے نوکر کو ڈانٹ پڑتی تو وہ سیدھا ابو کے کمرے میں چلا جاتا اور ہماری شکایت کرتا۔ بس پھر ہماری شامت ہی آ جاتی۔ آخری دور میں گھر کا ملازم جمیل نام کا لڑکا تھا۔ والد صاحب کی کتابوں کی صفائی اور دیکھ بھال کے لیے ادریس نام کا لڑکا تھا۔ یہ پچھلے دس سال سے ابو کی خدمت گزاری کر رہا تھا۔ وفات سے ایک دن قبل، جب کہ ابو فیصل کلینک فیصل ٹاؤن میں داخل تھے۔ ملازم ادریس میرے ساتھ ابو کے قریب تھا۔ اس نے مجھ سے دو گھنٹے کی رخصت چاہی تو میں نے انکار کر دیا، کیوں کہ اسپتال میں اس وقت

میرے پاس کوئی دوسرا موجود نہیں تھا۔ جب ابو کو معلوم ہوا تو انھوں نے مجھے سرزنش کی اور کہا کہ ہمیشہ نوکروں کے ساتھ نرمی اور اچھے برتاؤ سے پیش آؤ، چناں چہ اس کو چھٹی دینا پڑی۔ نوکروں کے ساتھ جو ان کا مثالی و مشفقانہ رویہ تھا، یہ واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ گھر میں ہدایت تھی کہ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو ملازمین کی تنخواہیں ادا کردی جائیں۔ وہ کہتے تھے کہ ان لوگوں کا گزارا نہایت مشکل سے ہوتا ہے اور مہینے کی آخری دنوں میں یہ لوگ پہلی تاریخ کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں، اس لیے یکم تاریخ ہی کو ان سب کو ان کا محنتانہ دے دینا چاہیے۔

زندگی بھر حلال کی محدود روزی پر ہی گزارا کیا۔ ان کی زندگی کا وصف دیانت داری و صداقت شعاری رہا۔ حلال و حرام، جائز و ناجائز کی تمیز ہمیشہ پیشِ نظر رہی۔ یہی وجہ تھی کہ کرپشن جیسی لعنت سے ان کی اولاد کے ذہن بھی کبھی آلودہ نہیں ہوئے۔ ساری زندگی دوسروں کو بھی جائز و ناجائز میں امتیاز کرنے اور یوم الحساب پر گہرا ایمان رکھنے پر زور دیتے رہے۔ وہ ہر مخلص دوست کے لیے یہ خواہش رکھتے تھے کہ وہ کرپشن سے محفوظ رہے۔

قناعت پسندی ان کی طبیعت میں شامل تھی۔ مالِ حرام اور اس کے نتیجے میں شاہ خرچی اور فضول خرچی کے سخت خلاف تھے، کیوں کہ بقول ان کے: ''ایسے پیسے میں برکت نہیں ہوتی اور جس طرح آتا ہے اسی طرح خرچ بھی ہوجاتا ہے، پتا بھی نہیں چلتا۔'' ان کے بقول: البتہ اگر وسائل ہوں تو بے شک فراخ دلی سے خرچ کرنا چاہیے۔ جائز وسائل زیادہ نہ ہونے کے باوجود جو لوگ اپنے اخراجات اپنی آمدنی سے زائد رکھتے ہیں، ان کو اپنے ضروریات پوری کرنے کے لیے دیگر ناجائز وسائل اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قناعت پسند لوگ اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اپنے تمام ملنے والوں کے ساتھ تعلقات کا بے حد احترام کرتے تھے۔

پاکستان میں اولین ۲۵ سال مولانا غلام رسول مہرؔ، مولانا عبدالمجید سالکؔ، خلیفہ عبدالحکیم، مولانا صلاح الدین احمد، سیّد امتیاز علی تاجؔ، چراغ حسن حسرتؔ، مولوی محمد شفیع، ممتاز حسن اور شیخ محمد اکرام وغیرہ جیسے بزرگوں کی شبانہ روز صحبت میں گزرے اور ان کے کردار سے بے حد متاثر ہوئے۔ اپنے زندگی کے آخری تیس برسوں میں ان دوستوں کی رفاقت کو بہت یاد کرتے تھے اور ان عظیم الشان ہستیوں سے جو علمی، اخلاقی و روحانی فیض اُن کو حاصل ہوا تھا، اپنی زندگی کے آخری سانس تک، بعد کے دوستوں میں بانٹتے رہے۔ اُن کے نزدیک کسی شخص سے اچھے تعلقات، اخلاص کی بنیاد پر قائم رہتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تعلقات برسوں کی محنت اور بے حد قربانیوں کے بعد استوار ہوتے ہیں، ان کی قدر کرنی چاہیے۔ وہ معمولی سے جھٹکے میں ٹوٹ جاتے ہیں، اس لیے تعلقات میں مروت، لحاظ، حیا، شائستگی اور رواداری کا خیال رکھنا چاہیے۔ وہ ہر شخص سے نہایت عاجزی، انکسار اور محبت سے پیش آتے تھے اور ہر شخص سے ملنا پسند کرتے تھے، کبھی بھی کسی کو اپنی ملاقات سے مایوس نہیں کیا۔ جو شخص بھی ملنے آتا، اسے اپنے بستر سے کھڑے ہو کر ملتے اور جب وہ ان کے پاس بیٹھتا تو نہایت مروت و شائستگی کے ساتھ اس کی خواہش معلوم کرتے اور چائے، شربت یا کسی بھی چیز سے اُس کی تواضع فرماتے۔ اس ضمن میں اپنے بیٹھنے کی جگہ کے ساتھ ہی ایک بزر لگایا ہوا تھا جس کے بجانے سے نوکر فوراً حاضر ہو جاتا اور وہ، مہمان کی خاطر تواضع کے لیے اس کو ہدایات فرماتے۔ اگر مہمان کے لیے مشروب یا دیگر متعلقات کے آنے میں تھوڑی دیر ہو جاتی تو ڈانٹتے کہ مہمان کو انتظار کرنا پڑا۔ رخصت کے وقت مہمان کو گھر کے دروازے تک چھوڑنے جاتے۔ آنے والا شخص خواہ کسی بھی عمر کا ہو، کیسے ہی منصب پر کیوں نہ فائز ہو؛ اسے گھر کے دروازے تک چھوڑ کر آتے تھے۔ صبح سے رات تک لوگ اُن سے ملاقات کے لیے آتے۔ بیش تر لوگ کسی نہ کسی کام کے لیے آتے تھے۔

وہ ہر ممکن اور بہترین طریقے سے ان لوگوں کے کام آتے تھے۔ کبھی کسی کو ٹالا نہیں۔ اگر کوئی کام ناممکن ہوتا تو معذرت کے ساتھ صاف انکار کر دیا کرتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جھوٹی آن بان بنانے کے لیے کسی سے ایسا وعدہ نہ کرو، جسے پورا نہ کر سکو، اور اس سلسلے میں بھی جھوٹ مت بولو، کیوں کہ ایک جھوٹ چھپانے کے لیے کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اپنے لیے کسی دوست کو کم ہی زحمت دی، البتہ کسی دوسرے ضرورت مند شخص کے کام کے لیے کسی دوست کو، جو صاحبِ اختیار ہو؛ ضرور کہہ دیا کرتے تھے۔ بہت سے صاحبِ اختیار و اقتدار لوگوں سے شناسائی رہی، جو عہدے و مرتبے کے لحاظ سے بہت بلند تھے؛ ان سے ہمیشہ دوسروں کے کام کرائے۔ ان کے نزدیک دنیاوی منصب و حشمت و جاہ و جلال، وجہ افتخار و عزت و باعثِ عز و وقار نہیں، بلکہ تقویٰ و خدا خوفی شرفِ انسانی کی معراج ہے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی صاحبِ اختیار شخص انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو وہ خائن اور قابلِ مواخذہ ہے۔ اس کی اس حرکت سے اگر کسی کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہوتا ہے تو مظلوم و متاثر شخص اگرچہ اس دنیا میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، مگر یوم الحساب میں اس کا گریبان ضرور پکڑے گا۔ اُن کے نزدیک آج کل نہ تو خود احتسابی رہی اور نہ خوفِ خدا۔ احساسِ فرض شناسی و دیانت داری و امانت، لغت کے بے معنی الفاظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی بیٹی (میری بڑی بہن) گلِ داؤدی (جو آج کل اقوامِ متحدہ کے تحت کوسوو، یوگوسلاویہ میں خدمات انجام دے رہی ہیں)، ہمارے ابو کے ایمان دارنہ خیالات کا عکس ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ملازمت کے دوران مظلوم و ضرورت مند افراد کے مسائل فوری طور پر حل کیے اور انصاف، سچائی، دیانت داری اور حق کی پاس داری کی۔ ان کا پاکستان کے چند ایمان دار، محنتی و سفید پوش افسران میں شمار ہوتا ہے۔ ہمارے ابو اپنے سے متعلق ہر مخلص شخص کو ایک ''صالح'' شخص کی صورت میں دیکھنے کے آرزومند تھے۔ ان لوگوں پر

انھیں سخت افسوس ہوتا جو کرپٹ، خود غرض، بے ضمیر اور سیاہ قلب ہیں، جو ہر قیمت پر جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز کے بغیر پیسہ بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ایسے لوگ اپنا نامۂ اعمال سیاہ کر رہے ہیں، اُنھوں نے تمام اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا ہے۔

انھوں نے کبھی کسی شخص کی تذلیل نہیں کی، بدخواہی نہیں کی۔ کہا کرتے تھے کہ تمام علوم کا سرچشمہ اخلاقیات ہے، جس کی بنیاد زبان پر ہے۔ اس کی مثال میں اکثر وہ حضرت علیؓ کا شعر سناتے تھے جس کا ترجمہ ہے کہ: سنان کا زخم بھر جاتا ہے، لیکن زبان کا زخم نہیں بھرتا۔ وہ کہتے تھے کہ ہر انسان کی عزتِ نفس ہوتی ہے اور کسی کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا، اخلاقیات میں سب سے بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے، ملنے والے سے بے انتہا محبت و عزت کا برتاؤ کرتے تھے؛ یہی وجہ ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم سے جدا ہوئے انھیں ایک سال بیت گیا ہے، مگر لوگوں کی اُن کی یاد میں تڑپ ویسی ہی ہے، جو پہلے دن تھی۔ وہ کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرتے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ جہاں وہ اس قول پر عمل پیرا تھے کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے، وہاں اُنھوں نے ہمیشہ یہ خیال رکھا کہ کسی کو دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو خبر تک نہ ہو۔ وہ کہتے تھے کہ کسی پر احساس کر کے جتاؤ مت، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان معاملہ ہے، اس کا اجر اللہ تعالیٰ ہی دے گا۔

وہ اکثر کہتے تھے کہ کسی کا کام، اس شخص سے کام کے صلے کی توقع میں نہ کرو، بلکہ بے غرض کرو۔ وہ دورِ حاضرہ کے ڈیپریشن کی سب سے بڑی وجہ یہ بتاتے تھے کہ لوگ ایک دوسرے سے توقعات وابستہ کر لیتے ہیں اور توقعات پوری نہیں ہوتیں تو دماغی و جسمانی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ کسی کا کام کر کے، کسی پر نیکی کر کے، اسے بھول جانا چاہیے؛ اگر دوسرے سے بھی صلے کے عوض توقع رکھو گے اور وہ پوری نہ

رکی تو اس سے مایوسی و افسردگی پیدا ہوگی، جو بیماریوں کا سبب بن جاتی ہے۔ اُن کے
ول ہم ایثار، صلۂ رحمی کے جذبے کے ساتھ دوسروں سے نیک برتاؤ رکھیں اور احسان
نے کے بعد اس سے صلے کی توقع نہ رکھیں اور حقوق العباد کا خیال رکھیں تو
عاشرے میں کبھی بدامنی و بے چینی پیدا نہیں ہوگی، بلکہ صحت مند معاشرہ تشکیل پائے
گا۔ وہ حقوق العباد پر اکثر زور دیا کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ دو قسم کے معاملات ہیں:
حقوق اللہ اور حقوقِ العباد۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان معاملات پر اللہ تعالیٰ
رعایت یا معاف کر دے گا، مگر حقوق العباد کے معاملے میں کسی ناانصافی، بے ایمانی یا
کسی غلطی کو وہ کبھی معاف نہیں کرے گا اور یوم الحساب وہ اس معاملے پر سخت گرفت
کرے گا۔ خاص طور پر وراثت کے حقوق کے سلسلے میں اکثر تلقین فرماتے تھے کہ اللہ کی
طرف سے وراثت کے حقوق کا جو تعین کیا گیا ہے، اس پر ہر مسلمان شخص کو عمل پیرا ہونا
چاہیے۔ اگر کوئی شخص وراثت میں کچھ بھی چھوڑ کر مرتا ہے تو اس کے بعد وہ مال کسی کا
نہیں، بلکہ شرعی و قانونی وارثان میں تقسیم ہونا چاہیے۔ کسی شخص نے اُن سے ایک دفعہ
ذکر کیا کہ اُس نے باپ کے مرنے کے بعد جائیداد میں سے اپنی بہنوں کو حصہ اس لیے
نہیں دیا کہ ان کی شادیوں پر جو اخراجات کیے، اس کے بعد اس کی ضرورت نہیں تھی۔
اس بات پر ابو نے سخت برا منایا اور کہا کہ اس شخص کے والد کے مرنے کے بعد میت کا
قرضہ ادا ہونے کے بعد جائیداد میں سے شرعی و قانونی لحاظ سے اس کی بہنوں کا حصہ ادا
ہونا چاہیے تھا اور اس سلسلے میں قرآنِ کریم میں بہت تفصیل سے وضاحت موجود ہے۔

عمر کے آخری حصے میں بھی اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے براہِ راست
رابطہ رکھتے تھے۔ ہفتے میں ایک دن اپنے دوستوں اور احباب سے ملاقات کے لیے
مخصوص رکھا ہوا تھا۔ کسی کی شادی کا دعوت نامہ آتا تو بڑے اہتمام سے شریک ہوتے۔
کسی جاننے والے کی وفات کا سن کر فوراً اس کے گھر پہنچتے تھے اور جنازے میں شریک

ہوتے تھے۔ پابندیٔ وقت کو ساری زندگی اپنا شعار بنائے رکھا۔ اکثر اپنے احباب سے ملاقات کا جو وقت مقرر ہوتا تھا، اس سے کچھ وقت قبل ہی پہنچ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ شادی کارڈز پر بارات کی آمد کا جو وقت لکھا ہوتا تھا، اس سے کچھ دیر قبل ہی پہنچ جاتے تھے۔ وہ اکثر یہ گلہ کرتے تھے کہ شادی کارڈ یا دوسری تقریبات پر لوگ جو ٹائم لکھتے ہیں، اس کی پابندی نہیں کرتے ہیں۔ ان کے بقول ہمارے زوال کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم لوگ وقت کی قدر اور پابندی نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ شادی بیاہ کی تقریبات میں جو ہندووانہ رسومات شامل ہوگئی ہیں، ان کے سخت خلاف تھے۔

میرے والد صاحب اور دوسرے اہلِ علم کے درمیان مطالعے کے لیے کتابوں کا لین دین جاری رہتا تھا۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ میں ہر کتاب پر اُس شخص کا حق سمجھتا ہوں، جس کی اسے ضرورت ہو۔ وہ اپنے کتاب خانے سے ہر ضرورت مند کو ہر وقت کتاب دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اُن کے نزدیک کتابیں الماری کی زینت بننے کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ کتابیں اُن کے لیے ہوتی ہیں جو ان کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اکثر لوگ میری کتابیں واپس کر دیتے ہیں اور کچھ انھیں اپنی کتابوں میں شامل کر کے اپنے خزینۂ کتب میں اضافہ فرما لیتے ہیں۔

اُن کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر خواہش مند ان کے کتب خانے سے استفادہ کر سکے۔ بعض اوقات اپنے کسی جاننے والے کو بہت قیمتی کتاب تحفے میں دے دیا کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ انھیں اپنی فیاضی پر نقصان اُٹھانا پڑا۔ ایک مرتبہ ایک بہت ہی قدیم و خوبصورت قلمی نسخہ، ان کے ایک دوست یہ کہہ کر ان سے لے گئے کہ وہ کسی کو دِکھانا چاہتے ہیں اور واپس کر دیں گے۔ کچھ عرصے تک وہ صاحب اس نسخے کی واپسی میں ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔ پھر معلوم ہوا کہ اُن صاحب نے وہ نسخہ کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے، اس کے بعد سے وہ صاحب آج تک غائب ہیں۔

شروع ہی سے کتابوں و اخبارات کی دیکھ بھال کے لیے کسی نہ کسی معاون کو ساتھ رکھا۔ ان سب نے داؤدی صاحب سے بہت کچھ سیکھا اور اب عملی میدان میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آخری دور میں یہ خدمت جناب رفاقت علی شاہد بجا لاتے رہے۔ اگرچہ کتابوں کی جلد سازی کے سلسلے میں انبالہ بک بائنڈنگ سے بہت سی کتابیں جلد کرائی تھیں، مگر عمر کے آخری عشرے میں اُن کا یہ کام اندرون لوہاری کے فخر الاسلام خان صاحب نے بھی نہایت تن دہی اور خوب صورتی سے کیا۔ اکثر میرے ساتھ کار میں کتابوں کے بنڈل لے کر اندرون لوہاری جاتے تھے۔ ایک تنگ سی گلی کے باہر گاڑی کھڑی کر کے میں اور ابو؛ فخر الاسلام خان صاحب کے گھر جاتے اور ان کے دروازے پر کھڑے ہو کر ابو اپنے مخصوص انداز میں زور سے پکارتے ''خان صاحب!''۔ خان صاحب دوسری منزل پر واقع اپنے گھر کی کھڑکی سے چِک اُٹھا کر نیچے جھانکتے اور پھر ابو کے استقبال کے لیے نیچے آتے۔ ان کے دیگر ملنے والوں میں مختار صاحب، محمد الیاس صاحب اور احتشام الحق رضوی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اکثر ہوتا تھا کہ ملاقات کے لیے میرے ساتھ جامعہ رضویہ میں جناب مولانا عبدالحکیم شرف قادری سے ملاقات کے لیے جاتے تھے اور ساتھ عربی کے مخطوطات ایک تھیلے میں بھر کر لے جاتے تھے، اور کئی کئی گھنٹوں تک مولانا سے ان کتابوں پر تبادلۂ خیالات فرماتے تھے، جس سے آس پاس بیٹھنے والے دوسرے اصحاب بھی فیض یاب ہوتے۔

لاہور میں ممتاز حسن صاحب مرحوم کے بھائی سرفراز حسن صاحب سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ اس کے علاوہ سیّد جمیل احمد زیدی صاحب، محمد جمیل صاحب (واپڈا)، مرتاض خیر آبادی صاحب (فرزند ریاض خیر آبادی)، اختر علی شاہ صاحب (بہت پرانے دوست جو کہ محکمۂ پولیس سے ریٹائر ہوئے)، لطیف حسن صاحب اور دیگر دوسرے

پرانے دوستوں سے تعلقات عروج پر رہے۔

اکثر شام کو جناب ڈاکٹر تحسین فراقی، جناب پروفیسر جعفر بلوچ، جناب پروفیسر اقبال مجددی، جناب عبدالجبار شاکر اور جناب رفاقت علی شاہد سے اپنے کمرے میں رات گئے تک ملاقاتیں رہتیں۔ ڈاکٹر انجم رحمانی صاحب اور سہیل عمر صاحب سے بھی اکثر ملاقات اور کبھی ٹیلی فون پر گفتگو رہتی تھی۔ روزانہ صبح سے رات تک ٹیلی فون پر بہت سے دوستوں، جن میں زیادہ تر محققین ہوتے تھے؛ رابطہ رہتا تھا۔

والد صاحب اور دوسرے نام ور عالم و محقق افراد کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ باقاعدگی سے ہر شخص کے خط کا جواب دیتے تھے۔ بقول ان کے اگر دن میں کسی کا خط موصول ہوتا ہے اور جواب نہیں جاتا ہے، تو شب میں سونے سے قبل خود احتسابی کے تحت اپنی اس کوتاہی پر افسوس کناں ہوتا ہوں۔ تحقیق کے سلسلے میں ان کی خط و کتابت مشفق خواجہ، محمد ادریس سندھی، قاسم لائبریری کنڈیارو سندھ، ڈاکٹر عارف نوشاہی، لطیف الزمان خان وغیرہ سے رہتی تھی۔

وہ قیامِ پاکستان کے وقت لاہور آ گئے۔ ہندستان میں قصبہ لاوڑ، ضلع میرٹھ، جہاں میرے دادا کی زمینیں اور باغات تھے؛ میرے دادا شیخ عطا السمیع اور اپنی ایک ہی بہن اُم حبیبہ خاتون سے جدا ہو کر پاکستان آئے۔ پھر ہندوستان جا کر اپنی بہن ام حبیبہ خاتون کی شادی نہایت ہی شریف النفس، اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص حامد علی برنی سے کرائی۔ حالاں کہ میرے دادا جان میری پھوپھی کی شادی اپنے ایک قریبی عزیز سے کرنا چاہتے تھے، جو بالکل ان پڑھ تھا؛ مگر میرے والد کی یہ شروع ہی سے خواہش تھی کہ ان کی اکلوتی بہن کی شادی کسی پڑھے لکھے شخص سے ہو۔ چناں چہ انھوں نے زور لگا کر اپنے والد کو منا ہی لیا اور حامد علی برنی سے، جو بلند شہر سے تعلق رکھتے تھے اور میونسپل کارپوریشن دہلی میں ملازم تھے؛ اپنی بہن کی شادی کرا دی۔ ان سے تین بیٹیاں اور دو

بیٹے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد سے ۱۹۷۰ء، یعنی میرے دادا جان کی وفات تک؛ ابو اکثر ہندستان جاتے رہے۔ میری پھوپھی جان بھی متعدد مرتبہ لاہور آئی تھیں۔ اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل میرے دادا جان لاہور تشریف لائے تو ابو نے میرے ختمِ قرآن مجید کی تقریب کا اہتمام کیا۔ میرے ابو، اپنے والد کی بہت عزت کرتے تھے۔ اپنی بہن سے ساری عمر اتنا پیار کیا، جس کی مثال اس زمانے میں کم ہے۔ ہندستان میں اپنے والد کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے کچھ نہ لیا اور وہاں سب کچھ اپنی اکلوتی بہن کے حق میں کر دیا۔ ۱۹۸۶ء میں میری پھوپھی، شمائلہ کی شادی میں پاکستان آئی تھیں۔ ۱۸ر ستمبر ۱۹۹۵ء کو میری پھوپھی جان کے انتقال کے بعد والد دہلی گئے، جب کہ ان دِنوں وہ خود بھی شدید بیمار تھے اور ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے اُن کی زبان پر اثر تھا، جس کی وجہ سے بات کرتے ہوئے تھوڑی سی دشواری ہوتی تھی۔ وہ اپنی اکلوتی بہن کی وفات پر بڑے ملول تھے۔ میری پھوپھی جان کے دونوں بیٹوں: شعیب حامد برنی اور سہیل حامد برنی سے بہت پیار کرتے تھے اور اکثر اُن کو ٹیلی فون کرتے تھے۔ وفات سے بارہ روز قبل، یعنی ۱۴ر جنوری ۲۰۰۲ء کو؛ آخری مرتبہ ان کی اپنے بھانجے شعیب حامد برنی سے ٹیلی فون پر طویل گفتگو ہوئی، مگر ہمیشہ کی طرح ٹیلی فون پر ابو کی آواز اتنی جان دار اور جوشیلی تھی کہ ذرا بھی اندازہ نہ ہوسکتا تھا کہ بارہ دن بعد ہم ہمیشہ کے لیے اس لحنِ داؤدی کو سننے کے لیے ترس جائیں گے۔ ہندستان میں الاوڑ، دہلی، میرٹھ میں ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کرائی جاتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کے دلوں میں بھی اپنی یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے ہیں۔

اپنی زندگی میں سعودی عرب، دوبئی اور ملائشیا وغیرہ بہت سے ممالک میں گئے، جہاں بڑے بڑے علمی و تحقیقی اداروں میں ان کی تحقیق و قابلیت کو سراہا گیا۔

سعودی عرب میں مکہ معظمہ میں مدرسۃ صولتیہ کے مہتمم اعلیٰ مولانا مسعود شمیم صاحب مرحوم ان کے دیرینہ و خاص دوستوں میں تھے، اور آپس میں سگے بھائیوں جیسا رشتہ تھا۔ سعودی عرب میں ان کا قیام مولانا مسعود شمیم کے گھر ذاتی مہمان کی حیثیت سے رہتا تھا۔ مولانا مسعود شمیم کی وفات کے بعد بھی جب سعودی عرب گئے، اُن کے صاحب زادوں نے اُن کی ہمیشہ اتنی ہی عزت کی، جیسی اُن کے والدِ مرحوم اُن کے ساتھ کرتے تھے۔

کراچی میں طارق روڈ پر پچھلے پینتیس سال سے دو کمروں کا ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔ جب بھی کراچی جانا ہوتا، اسی فلیٹ میں قیام فرماتے۔ راول پنڈی میں اکثر اپنے دوست محمد یوسف بھٹی کے ہاں، جو اسٹیٹ لائف آف پاکستان میں ملازم ہیں؛ قیام فرماتے تھے۔

میں نے اپنے بچپن میں ممتاز حسن، سیّد امتیاز علی تاج، مولانا غلام رسول مہرؔ کو اچھی طرح دیکھا ہے۔ ممتاز حسن صاحب جب بھی لاہور آتے تو اسی شام ہمارے گھر، ابو سے ملنے آتے، اور رات گئے تک ان کی ابو سے ملاقات رہتی تھی۔ وہ اکثر سیّد امتیاز علی تاج صاحب سے ملنے ایبٹ روڈ ان کی رہائش گاہ پر جاتے تو مجھے اور میری بڑی بہن کو بھی ساتھ لے جاتے تھے، جہاں پر علمی و ادبی شخصیات کے علاوہ فلم اور اسٹیج کے نام ور اداکاروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ اسی طرح ابو کے ساتھ بہت سی نام ور شخصیات، مثلاً جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، محمد طفیل (نقوش)، امداد صابری، ڈاکٹر محمد باقر، پروفیسر حمید احمد خاں، حجاب امتیاز علی وغیرہ کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بعد ازاں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب مشفق خواجہ، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر عارف نوشاہی، پروفیسر اقبال مجددی، ڈاکٹر انجم رحمانی، جناب عبدالجبار شاکر، پروفیسر جعفر بلوچ، سیّد اویس سہروردی، جناب سہیل عمر، ڈاکٹر گوہر

نوشاہی، ڈاکٹر معز الدین، جناب سیّد علی اکبر سلیم، جناب عارف الرحمٰن چغتائی اور ڈاکٹر اکرام چغتائی جیسے اہل علم کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

میرے دوستوں سے بہت شفقت و عزت سے پیش آتے تھے۔ میرے بچپن کے ساتھیوں سیّد وقار سلیم، میاں آفتاب احمد جوئیہ، محمد نواز خان، عزیز احمد، ڈاکٹر احمد، اسلام الحق بخاری، محمد افضل خان اور دلشاد صدیقی وغیرہ سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ جب یہ مجھ سے ملنے آتے تھے اور میں گھر پہ نہیں ہوتا تھا تو ان کو اپنے پاس بٹھا لیتے تھے اور ان کی خاطر تواضع کرتے تھے۔

میرے بہنوئی بریگیڈیئر زاہد مبشر سے اُن کو وہی محبت تھی جو ان کو میرے ساتھ تھی۔ مبشر بھائی نے بھی اُن کو بیٹے سے بڑھ کر پیار و احترام دیا۔ مبشر بھائی کے بھائیوں: شاہد مبشر، کرنل اطہر جاوید، جاوید عظمت شیخ، امجد شیخ اور ان کے بہنوئی افضال صاحب سے بے حد پیار کرتے تھے۔ اسی طرح میری بیوی کے بھائیوں: عامر خان، قیصر خان نیازی، شاہد خان، طاہر خان اور ان کی بہنوں، میرے برادرانِ نسبتی: خالد جاوید اور محمد سعید مرزا سے بھی بہت پیار و احترام سے پیش آتے تھے۔ اپنے دوستوں، مثلاً سیّد شفیع احمد، آلِ نبی جعفری، مطلوب احمد خان، معراج حسین، ڈاکٹر معز الدین، سیّد منصور عالم عاقل، شیخ بدر الدین، امتیاز احمد لاری، ملیح الدین اور بہت سے دوستوں سے ملاقاتوں اور محبت میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ عیدالفطر سے دو روز قبل اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو مبارک باد کا ٹیلی گرام باقاعدگی سے بھیجا کرتے تھے۔ عید کی نماز کے بعد ان دوستوں کو ٹیلی فون بھی کرتے تھے۔ عید سے اگلے روز وہ میرے ساتھ گلبرگ میں اپنے دوست شیخ بدر الدین صاحب، آلِ نبی جعفری صاحب، سیّد شفیع احمد صاحب اور پھر میرے ماموں فضلِ کریم صاحب کے گھر عید کیک لے کر ملنے جاتے تھے۔

میرے ماموں فضلِ کریم صاحب، ان کے میرٹھ کالج کے زمانے کے دوست بھی تھے (م: ۲۵؍جنوری ۲۰۰۳ء)۔ ابو ان کے بیٹوں: سہیل بھائی اور ناصر بھائی سے بے حد پیار کرتے تھے۔ جون ۲۰۰۱ء میں سہیل بھائی کی اچانک موت کا بے حد صدمہ لیا۔ میری ماموں زاد بہن انجم آراء، ان کے شوہر اصغر علی اور ان کے بچوں سے اس محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے، جیسے اپنے بچوں سے۔ آخری وقت میں انجم باجی کا بیٹا عامر ان کے پاس ہی تھا۔ ماموں فضل کریم کی قریبی عزیزہ پھوپھی اسجدی صاحبہ اور اُن کے صاحبزدگان اشتیاق رسول صاحب، الطاف رسول صاحب، ارتضا رسول صاحب وغیرہ سے ہمیشہ بے حد پیار و محبت سے ملتے رہے۔

میری والدۂ مرحومہ سے شادی کے بعد سے ہمارے گھر میں ہر عید کو شیر خرما بنتا تھا۔ یہ روایت ابو نے زندگی کی آخری عید تک برقرار رکھی۔ یہ شیر خرما بڑی دیگ میں، بڑے اہتمام سے، عید کی صبح تک تیار کیا جاتا، پھر عید کی نماز کے بعد گھر کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے اور ہر گزرنے والے کو بلا کر شیر خرما کھلاتے، پھر تمام محلے میں، ہر گھر میں اس کا ایک بڑا پیالہ بھجواتے، اور پھر رشتے داروں کو۔ مجھے، میری بیوی اور میرے بچوں کو عیدی دیتے، پھر میری بہنوں، داماد اور ان کے بچوں کو عیدی دیتے۔ سال میں دو مرتبہ، یعنی عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کو نماز سے قبل علی گڑھ شیروانی و پاجامہ پہنتے تھے، جو ان کو دورِ علی گڑھ کی یاد دلاتا تھا۔

رمضان المبارک کے روزے ہر سال باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ رمضان المبارک کا مقدس مہینا ہر شخص کو اپنے اعمال و کردار کی خود احتسابی کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ہر شام افطاری کا خاص اہتمام ہوتا تھا اور اکثر افطاری پر ان کے دوست یا رشتہ دار اُن کے ساتھ ہوتے تھے۔ روزانہ باقاعدگی سے نماز کے علاوہ جمعے کی نماز بہت اہتمام سے پڑھنے جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مسلمان کے

لیے جمعہ عید کا دن ہوتا ہے۔

میرے والد خلیل الرحمٰن داؤدی اُردو سے شغف رکھنے والے کسی شخص کے لیے غیر متعارف نہیں۔ وہ گذشتہ بتیس سال سے عربی و فارسی مخطوطات پر تحقیق کر رہے تھے، مگر اس سے قبل اُردو میں اہم تحقیقی موضوعات پر بھی اُنھوں نے قلم اُٹھایا۔ مجلسِ ترقی ادب نے ۱۹۷۰ء سے قبل ان کی اٹھارہ کتابیں شائع کیں۔ اپنے ایک عزیز کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''میں نے اُردو کے افسانوی ادب و شعری سرمایہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا، جس کے لیے کسی علمی پس منظر اور مطالعہ کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ طبّاعی اور اختراعِ ذہن درکار ہے، کہ قلم اُٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا۔

ع آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

میں نے شروع سے ہی اس وادی پرخار میں قدم رکھا جہاں برسوں کی محنت اور صدہا کتابوں کے مطالعہ کے بعد، حاصلِ مطالعہ چند صفحات میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا۔ بے شک اُردو فکشن کی تصنیف و شعرگوئی اختیار کرتا تو عامۃ الناس میں بھی مقبول ہو جاتا اور صاحبِ ثروت بھی ہوتا، لیکن ۲۸ سال پہلے اُردو کا میدان چھوڑا اور عربی و فارسی مخطوطات کی تحقیق پر کمر ہمت باندھی، جس میں نہ ڈراما نگاروں اور شاعروں والی شہرت مل سکتی تھی اور نہ جان وتن کا رشتہ برقرار رکھنے کا سامان، لیکن اب آیندہ نسلیں تو مایوس نہیں ہوں گی کہ ہم نے ۵۰ سالہ قومی زندگی کے اس خلا میں ان کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔

ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اگر اُردو کا ادیب ہی رہتا تو ان اٹھائیس سالوں میں پہلی اٹھارہ کتابوں میں اضافہ کر کے تعداد کو پچاس تک پہنچا دیتا، لیکن اپنی اُس کارکردگی پہ وہ احساس تفاخر تو نہ ہوتا، جو

آ ج ہے۔"

یقیناً میرے والد کی طبیعت میں جدت کا ایک تخلیقی جوہر پنہاں تھا اور ان کی تمام زندگی ان کی تخلیقی کارفرمائیوں کا ایک دل آویز مرقع ہے۔ ان کے قلم سے جو لفظ نکلتا تھا، وہ ان کے شدتِ خلوص کا آئینہ دار ہوتا تھا۔

اُنھوں نے عربی و فارسی کے قدیم الکتابت، غیر مطبوعہ و نادر الوجود مخطوطات پاکستان کے قومی اداروں کو مہیا کیے اور ہمیشہ دیانت دارانہ طریقے سے مناسب قیمت وصول کی۔ متعدد طالب علموں نے ان کے پاس موجودہ مخطوطات کی مدد سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اُنھوں نے مخطوطات پر جو تحقیق کی اور ان پر اپنے تحقیقی نوٹ لکھے، وہ ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

قومی کتب خانوں کو داؤدی صاحب کی طرف سے مہیا کی ہوئی ہر کتاب کسی نہ کسی وجہ سے اہم ہے، جن میں بے متعدد نادر و غیر مطبوعہ ہیں۔ نیشنل میوزیم آف پاکستان، کراچی میں قائم ہوا تو اس میوزیم میں، جس کی سرپرستی ممتاز حسن، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مولانا عبدالعزیز میمن، حسام الدین راشدی جیسے نابغۂ روزگار ہستیاں کر رہی تھیں؛ داؤدی صاحب مرحوم نے شبانہ روز مساعی جمیلہ سے بہت سی نادر کتابیں محفوظ کرائیں جو ہمارا قومی، ثقافتی و علمی ورثہ ہیں۔ یقیناً اُن کے اس قومی، یادگار کارنامے کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس عظیم المرتبت اور نادرۂ روزگار ہستی کے بچھڑ جانے سے تحقیق کے میدان میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ مشکل سے پورا ہو سکے گا۔ اقبال کے مصرعے میں دُعا گو ہوں کہ:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

پروفیسر جعفر بلوچ
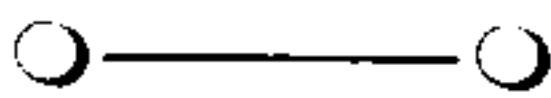
تو زندہ ہے

(خلیل الرحمٰن داؤدی مرحوم کی نذر)

لوحِ ادب پر لکھا ہے، تو زندہ ہے
جب تک حرف چمکتا ہے تو زندہ ہے
جب تک تحقیق و تنقید و انشا کا
بول جہاں میں بالا ہے تو زندہ ہے
خطّی نسخوں کی اسرار شناسی میں
تیرا سکہ چلتا ہے تو زندہ ہے
علم و ادب کی دُنیا میں کردار ترا
حاتم طائی کا سا ہے، تو زندہ ہے
تو نے ادب کے چوروں کی سرکوبی کی
تو فن کا رکھوالا ہے، تو زندہ ہے
غالب کے دیواں کا لاہوری نسخہ
تجھ کو دُعائیں دیتا ہے، تو زندہ ہے

میرے تختِ تصور پر یہ تُو جونہیں
بیٹھا کون چہکتا ہے؟ تو زندہ ہے

پڑھتا ہے اب وقت بہ لحنِ داوُدی
داوُدی تو زندہ ہے، تو زندہ ہے
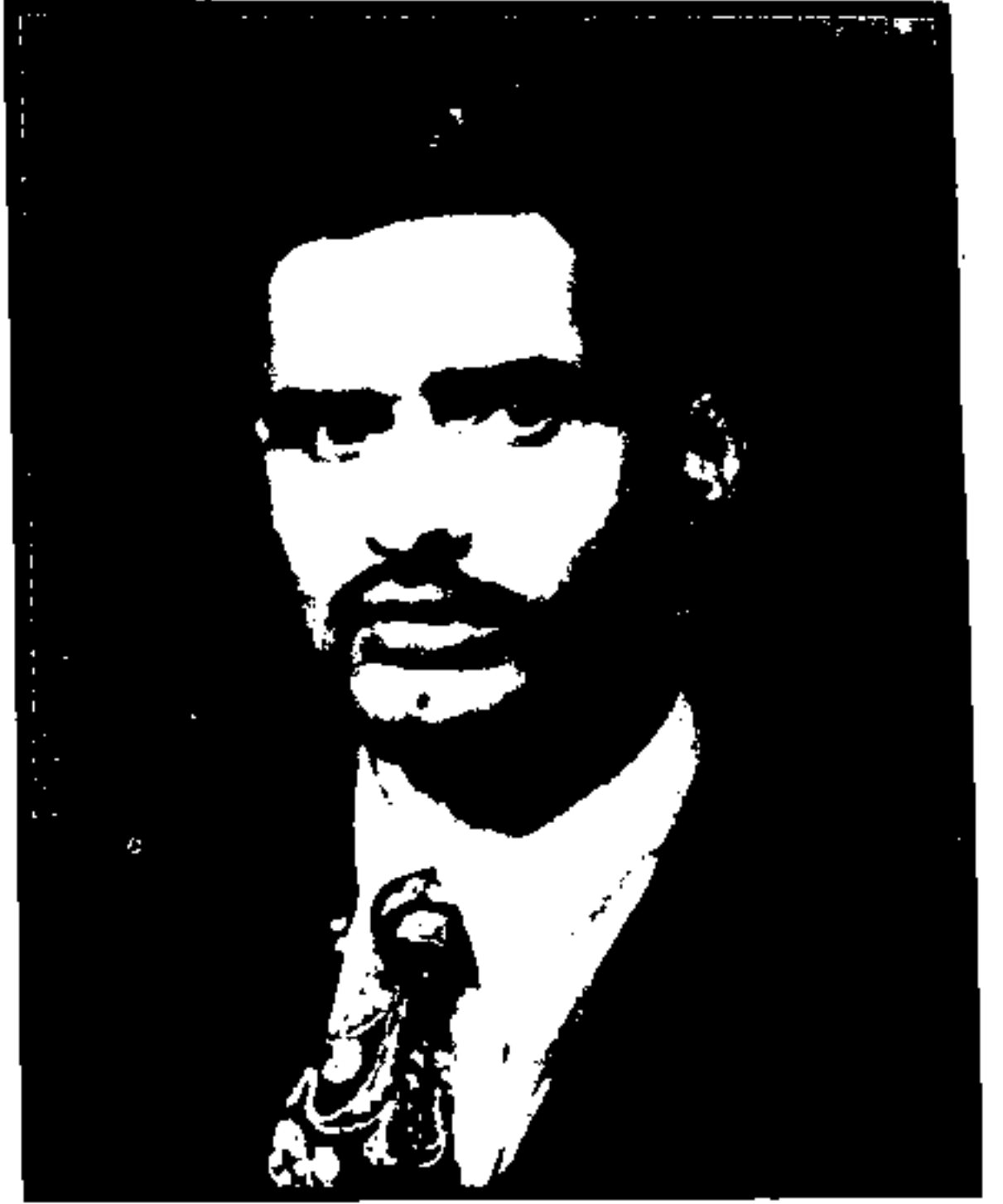
جناب خلیل الرحمن داؤدی (عہد جوانی)

جناب خلیل الرحمن داؤدی (۱۹۷۰ء)

جناب خلیل الرحمن داؤدی (۱۹۷۸ء)
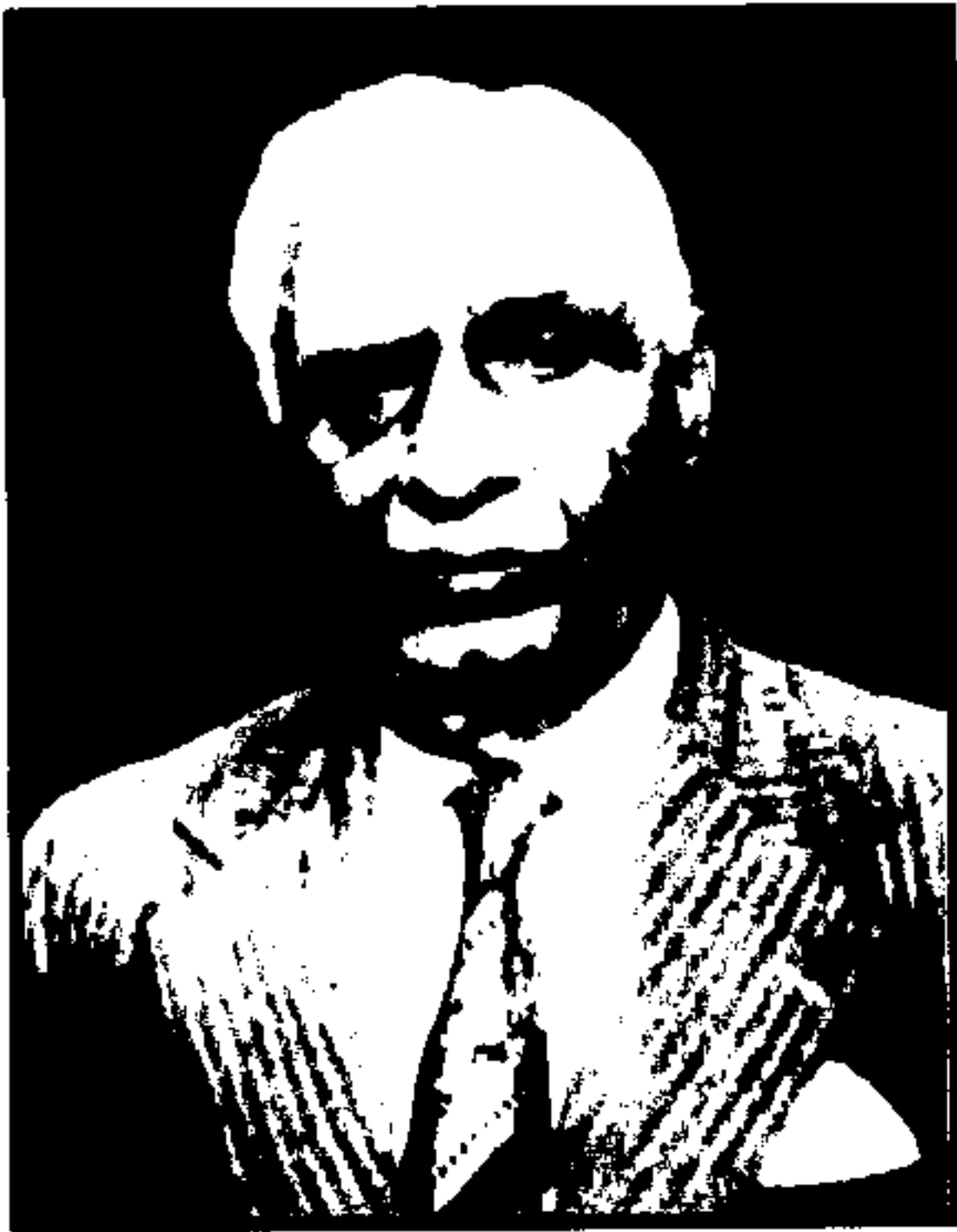
جناب خلیل الرحمن داؤدی (۲۰۰۰ء)

خلیل الرحمن داؤدی، شقائق النعمان داؤدی گل داؤدی اور بہو راحیلہ فرح نعمان (گود میں پہلے بیٹے حقائق الایقان داؤدی کو لئے ہوئے) (۱۹۹۳ء)

خلیل الرحمن داؤدی اپنی بہو راحیلہ فرح نعمان اور اپنے تینوں پوتوں،
حقائق الایقان داؤدی، مدنان نعمان داؤدی اور شیخ الشبان داؤدی کے ساتھ (۱۹۹۹ء)

(دائیں سے بائیں) جناب افتخار عارف، جناب خلیل الرحمٰن داؤدی مئی ۲۰۰۰ء

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر ممتاز حسن، علامہ عبدالعزیز میمن، خلیل الرحمٰن داؤدی، نامعلوم

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر عارف نوشاہی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، پروفیسر فتح محمد ملک،
جناب خلیل الرحمن داؤدی (مہمان خصوصی)، ڈاکٹر محمد سلیم اختر، ڈاکٹر صدیق شبلی، جناب افتخار عارف
مقتدرہ کے دفتر میں۔ اسلام آباد۔ مئی ۲۰۰۰ء

دائیں سے بائیں پروفیسر فتح محمد ملک، جناب خلیل الرحمن داؤدی مقتدرہ کے دفتر میں۔ اسلام آباد۔ مئی ۲۰۰۰ء

خلیل الرحمٰن داؤدی، شیخ محمد عطاء السمیع (والد)، اویس جعفری (۱۰ جنوری ۱۹۶۰ء)

میاں عبدالعزیز مالواڈہ بیرسٹر ایٹ لا، پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی،
مولوی ظفر اقبال، جناب ممتاز حسن مینجنگ ڈائریکٹر نیشنل بینک آف پاکستان، خلیل الرحمٰن داؤدی اپریل ۱۹۶۰ء

منتخباتِ داؤدی

خلیل الرحمٰن داؤدی

مقدمہ "طلسمِ حیرت"

۱۔ مصنف کے متعلق

۲۔ سببِ تصنیف "طلسمِ حیرت"

۳۔ زمانۂ تصنیف "طلسمِ حیرت"

۴۔ قصے کے اجزاءِ ترکیبی

۵۔ ترتیبِ کتاب

۶۔ تبصرہ:

(الف) محاسن

(ب) معائب

۷۔ طباعت و اشاعت

۸۔ تصحیحِ متن

مصنف کے متعلق:

قصۂ "طلسمِ حیرت" کے مصنف محمد جعفر علی ہیں، جو شیون تخلص کرتے تھے۔ کاکوری کے باشندے تھے، لیکن لکھنؤ میں رہتے تھے۔ اس نسبت سے کاکوروی بھی

کہلاتے ہیں اور لکھنوی بھی۔

نہایت افسوس ہے کہ مصنف کے حالات بالکل پردۂ خفا میں ہیں۔ اگر "طلسمِ حیرت" ان سے یادگار نہ ہوتا تو شاید آج وہ بالکل بے نام و نشان ہوتے۔ تعجب ہے کہ معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی شیون کا ذکر نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ خم خانۂ جاوید میں ضرور شیون کا ذکر ملے گا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لالہ سری رام کو ان کا کلام پسند نہیں آیا، حالانکہ اُن کے بچپن کے زمانے میں شیون زندہ تھے اور لالہ صاحب نے بہت سے ایسے گمنام اور غیر معروف حضرات کا کلام بھی درج کر دیا ہے جن کے صرف چند اشعار ہی ملے تھے۔ شیون تو بہر حال ایک ذی علم، ایک عظیم تصنیف کے مالک اور اپنے عہد کے شعراء میں اچھے خاصے مشہور تھے۔ بہر حال اس کا افسوس ہے کہ مصنف کے متعلق کسی تذکرے میں چند فقرے بھی نظر نہیں آئے اور نہ ہی "طلسمِ حیرت" میں مصنف نے اپنے متعلق کچھ لکھا۔

طلسمِ حیرت کے دیباچے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جعفر علی شیون کے دو استاد تھے۔ ایک نثر میں اور دوسرے نظم میں۔ شیون نثر میں مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی شاگردِ نوازش حسین خاں نوازش کے شاگرد تھے اور نظم میں محمد محی الدین خاں ذوق کاکوروی شاگردِ نوازش حسین خاں نوازش کے شاگرد تھے۔ محی الدین خاں ذوقؔ کے متعلق شیون فرماتے ہیں: "محمد جعفر متخلص بہ شیون شاگرد نظم ناظم قلمرو سخنوری، ملک الشعرائے مثال سعدی و انوری، عاملِ زمینِ اشعار، آشنائے تقطیع بحار، واقفِ رموزِ شعر گوئی و مضمون بندی، کاشفِ عقودِ سخن فہمی و مشکل پسندی، شعرا کے فوق، مولوی محمد محی الدین خاں صاحب ذوق شاگردِ رشید مخترعِ طرزِ شعرخوانی، آغا نوازش حسین خاں صاحب عرف مرزا خان تخلص نوازش کا ہے..." دوسرے استاد مرزا رجب علی بیگ سرور کے متعلق رقمطراز ہیں: "اور نثر میں یہ عاجز نثارِ سحر گفتار آتش زباں، ناسخ نثر استادانِ

شعورِ نزدیک و دُور، مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور مرحوم و مغفور سے تلمذ رکھتا ہے۔''

نثر کے سلسلے میں جعفر علی شیون کی یادگار یہی قصہ ''طلسمِ حیرت'' ہے اور شعر گوئی کے ثبوت میں شیون کے وہ متعدد اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جو اس قصے میں مختلف مقامات پر بذیل 'مؤلف' آئے ہیں۔ شعر برے نہیں ہیں۔ اُس عہد کے لکھنوی شاعر اسی قسم کی شاعری کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ شیون کی تعلیم و تربیت کا حال معلوم نہیں ہو سکا، لیکن ان کی اس تصنیف سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں فارسی اور عربی زبانوں پر قدرت حاصل تھی اور ان کا مبلغِ علم بہت وسیع، مطالعہ بہت کثیر اور مشاہدہ بہت عمیق تھا۔ یقیناً اُنھوں نے مختلف علوم و فنون کی تکمیل کی تھی۔ وہ اس تصنیف میں ایک جامع الکمالات شخصیت کی حیثیت سے کارفرما ہیں۔

معلوم نہیں شیون کا انتقال کب ہوا، مطبع نولکشور لکھنؤ میں قصہ ''طلسمِ حیرت'' تیسری مرتبہ ۱۸۸۲ء مطابق ۱۲۹۹ھ میں چھپا ہے۔ اس اشاعت کے خاتمۃ الطبع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اُس وقت تک زندہ تھا۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ مصنف کا انتقال انیسویں صدی کے آخر میں ہوا ہے۔

سببِ تصنیف:

۱۸۰۱ء/ ۱۲۱۷ھ میں میر امن دہلوی نے ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں دہلویوں کی زبان دانی کے متعلق یہ چند جملے لکھ دیے: ''اور جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پُشتیں اس شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے عرس چھڑیاں سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا، اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔ یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تلک پہنچا ہے۔''(۱)

باغ و بہار کے ۲۳ برس بعد ۱۸۲۴ء/ ۱۲۴۰ھ میں مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے فسانۂ عجائب لکھا تو میر امن کے ان چند سرسری جملوں کو نشانہ بنایا اور ایک اچھے ادبی قضیے اور علمی معارضے کی بِنا ڈال دی۔ سرور فرماتے ہیں:

''اگر چہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ زبان اُردو زبان پر لائے یا اس افسانے کو بہ نظر شاری کسی کو سنائے۔ اگر شاہجہاں آباد مسکنِ اہلِ زبان کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا، وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا میر امن صاحب نے چار درویش کے قصّے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دہن حصّے میں یہ زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں، محاورے کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں اس سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزا وار ہے۔ کاملوں کو بیہودی گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید' وہی مثل سننے میں آئی کہ اپنے منہ سے دھنا بائی...''(۲)

فسانۂ عجائب کی تصنیف کے ۳۶ سال بعد ۱۸۶۰ء میں سیّد محمد فخر الدین حسین سخن دہلوی نے میر امن کی حمایت کی اور اپنی تصنیف ''سروشِ سخن'' کے دیباچے میں مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی پر بڑی طعن و تعریض کی۔ وہ فرماتے ہیں:

''اور جو اس قصے کو ملاحظہ کرے، وہ یہ نہ سمجھے کہ فسانۂ عجائب کا جواب لکھا ہے، لاجواب لکھا ہے۔ نہیں مرزا صاحب یگانہ ہیں، یکتائے زمانہ ہیں۔ وہ موجد ہیں، ہم مقلد ہیں۔ فرق اس قدر کہ ہم کم سن اور مرزا صاحب پرانے آدمی، ضعیف، پھر کہاں ان کی تالیف اور کہاں ہماری تصنیف۔(۳) ہم نوجوان وہ صد باراں دیدہ، سنجیدہ و فہمیدہ، پیر کہن۔ پھر کہاں فسانۂ عجائب اور کہاں سروشِ سخن۔ مگس کو ہما کے ساتھ کیا ہم سری۔ ذرّے کو سُہا سے کیا برابری۔ جو لف و نشر مرتب سمجھے وہ البتہ ہمارا مطلب سمجھے۔

مگر صاحب موصوف نے جو اپنی تالیف میں بیچارے میر امن دہلوی کو بنایا ہے۔ اپنی زبان کی تیزی سے اس صاف گو کو ایک آدھ کڑا فقرا سنایا ہے تو ہم بھی اب کہتے ہیں کہ سرور نے اٹھارہ مرتبہ فسانۂ عجائب کو درست کیا۔ جو فقرہ سست پایا اسے چست کیا۔ مگر غلطی نظر نہ آئی۔ کئی مرتبہ کتاب چھپی مگر وہ بات نہ چھپی۔ قصہ اپنا از سرنو ملاحظہ فرمائیں۔ ابتداء سے انتہا تک دیکھ جائیں اور سمجھیں کہ کئی جگہ تانیث کو تذکیر لکھا ہے اور تذکیر کو تانیث باندھا ہے۔ اربابِ بینش پر سب آشکارا ہے۔ حاجتِ تصریح نہیں ہے۔ اکثر غلط ہے، بالکل صحیح نہیں، حق تو یہ ہے کہ جو اردوئے معلّٰی کی زبان نہیں جانتا، تذکیر و تانیث کو نہیں پہچانتا۔ جو شاہجہاں آباد میں نہیں رہا ہے، جس نے دربارِ شاہی نہیں دیکھا ہے، وہ فسانہ کیا لکھے۔ اس کا منہ کیا ہے۔ ہاں تو کہنے کو بہت سے داستان گو دہلی اور لکھنؤ میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اگر وہ بھی چاہیں تو فسانہ لکھ ڈالیں، تھوڑا کام کر کے بڑا نام کریں۔ متقدمین کے سخن پر نکتہ چینی کریں۔ ان کے کلام میں کلام کریں۔ جیسے لکھنؤ کے بعض شاعر، ان کے باپ دادا سب سیکھے سِکھائے دِلّی سے آئے۔ یہاں آباد ہوئے اور اب ہر فن کے موجد بنے، سب شاعروں کے استاد ہوئے۔ انصاف کیجیے، تعلّی کی نہ لیجیے۔ مرزا محمد رفیع سودا اور خواجہ میر درد اور خواجہ محمد نصیر اور میر حسن مصنف مثنوی سحر البیان، یہ سب کہاں کے تھے ... اُردو جن کی زبان انھیں پر لعن طعن، ایسا بھی آدمی بے پیر نہ ہو۔ بقول حضرت نسیم دہلوی:

نسیم دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں
کوئی اُردو کو کیا سمجھے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں

ہم نے جو اس قدر صاف صاف لکھا، اب اس پر بھی آزردہ کوئی مغرور ہو تو خیر ہم شر نہیں کرتے۔ راست گفتار ہیں، کج بحثی سے بیزار ہیں۔ اس میں اب کسی کو الم ہو یا سرور ہو ... امیدوار ہوں کہ اگر اس میں کسی طرح کی غلطی ملاحظہ فرمائیں تو اس کو

اپنی وفورِ مہربانی سے چھپائیں اور سمجھیں کہ دہلی کا رہنے والا ہے، محاورے اور روزمرے سے لکھنؤ کے، بھی ناآشنا ہے۔"(۴)

سروشِ سخن کی تصنیف (۱۸۶۰ء مطابق ۱۲۷۶ھ) کے بارہ سال بعد ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ میں فسانۂ عجائب کے مصنف مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی کے ایک شاگرد محمد جعفر علی شیون لکھنوی نے فسانۂ عجائب کی حمایت میں باغ و بہار و سروشِ سخن کے مصنفین پر لعن طعن کرتے ہوئے کتاب 'طلسمِ حیرت' لکھی۔ میر امن بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ اس کے قلم سے لکھے ہوئے چند جملے تقریباً پون صدی تک ایک ادبی معارضے کا موجب بن جائیں گے۔ میر امن کے جملوں کا ذکر کر کے سرور نے جو بات ازراہِ تعلّی کہی تھی، اس کا جواب نہایت مہذب صورت میں سخن دہلوی نے سروشِ سخن میں دے دیا تھا۔ لیکن جعفر علی شیون نے تو غضب ہی کر دیا۔ وہ سخن پر تعریض کرتے ہوئے تہذیب و متانت کی تمام حدود سے گزر گئے ان کے اظہارِ خیال میں ابتذال و سوقیانہ پن پیدا ہو گیا۔ شیونؔ نے نہ صرف سخنؔ کو ہی برا بھلا کہا بلکہ ان کے استاد مرزا غالب دہلوی کو بھی نہیں چھوڑا۔ حالانکہ شیون نے اپنے استاد مرزا رجب علی بیگ سرور کی کتابوں پر غالب کی تقریظ کو سند کی صورت میں پیش کیا ہے۔ شیون کے جستہ جستہ چند جملے پیش کرتا ہوں:

"نکتہ چیں حرف کا متلاشی نہ ہو تو البتہ ایک سخن ساز کا پردۂ راز در پردہ اس قانون سے باز کروں کہ ایک دفعہ کے مطالعے میں دامنِ ملال اربابِ نشاط کا چنگِ شادی سے تار تار ہو جائے۔ دُور بیں کو حرفِ مطلب آئینہ دار نظر آئے۔ بالکل صاف صاف کہہ نہیں سکتا کہ اس میں مدمقابل کی قلعی کھلتی ہے۔ معیوب ہے۔ بند بند لکھنا خوب ہے۔ راقم اسیرِ تشویش ہے۔ دستِ تحیر در ریش ہے کہ جن حضور نے سرور پر طعن و تشنیع میں ذہنِ کند کی تیزی دِکھائی ہے، ان کو کیا سمائی ہے۔ صاحبِ من جب آپ کے

ہم وطن پر اس غضب کا فقرہ جھونکا کہ آپ سے ہوا خواہوں نے جھونکا کھایا، یہ برا دن پیش آیا۔ شیخی برباد کر دی۔ بادیِ ظرافت کی طبیعت شاد کر دی۔ پھر آپ کے مقدمے میں تو کچھ سخن نہیں۔ گو بندہ ان پر طعنہ زن نہیں۔ پر غالب یوں ہے کہ اگر حضرت کے استاد طنز کرتے تو نیر جوہر شمشیر زبان کو اختر تاثیر بناتے۔ گو کہ آپ کے نزدیک برج اسد پر ہے، اپنی حد پر ہے۔ گاوِ زمیں دِکھا دیتا، آہو گیری کا مزہ چکھا دیتا... حضور نے کیا سمجھ کے کلامِ سرور میں شاخ نکالی۔ نکتہ چینی کی نظر سے آنکھ ڈالی۔ چرخِ حقہ باز نے تازہ گل کھلایا۔ کلی ہی وہ تھا آج یہ ماجرا نظر آیا کہ گڑ گڑ ہی رہے، چیلے شکر ہو گئے۔ شاگرد استادی کا دم بھرنے لگے، اپنی تحریر پر مرنے لگے۔ یہ لیاقت اور سرور پر زبانِ طعن دراز، مثل مشہور، یہ منہ اور نواب کا زیر انداز۔ ابھی کچھ کہوں تو پیچ در پیچ ہو کر کڑکیے، جھول جھال چھوڑ کر لکھنؤ سے سٹکیے اور چونکہ آج کل آپ کی طلاقت کا پنجرہ کھلا ہے، لیاقت کا دڑبا کھلا ہے، فقرے کا سقمِ تحریر ٹاپا جائے، قرینہ لڑایا جائے، پر بیضے سے پائے، اپنا سر کھائے۔ اے صاحب! ابھی آپ انڈے کے ملوک ہیں۔ دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ دولت خانے سے قدمِ خاکی فرمائے۔ گلزارِ لکھنؤ کی بلبل دیکھ کر عقل کے طوطے اُڑائے۔ ہم صیفروں کے الحان متروک ہیں۔ یہاں کی زبان میں لمبی چوڑی ہانکنے بے گریز کھائے پر کٹی اُڑانے، کوسر بگریاں پیشانی میانی سے آشنا اپنی دوخانی کھڑکی جھانکی۔ غالباً چندے یہاں اڈا آپ کا اور رہا ہم صیفر بریز بریز بولیں گے۔ آپ ایسا تیز بولیں گے... اپنے منہ آپ کو میاں مٹھو بنانا، بالکل اُلو بننا ہے۔ از راہِ نصیحت کہتا ہوں۔ جرعہ نوشی میں اس جامِ دُرد آلام سے باز رہیے۔ طائرِ قفس سے بصد وا کہیے: اپنی گردن کو کبر کے پھندے سے کہ دام، شیطان جعل ساز دغا باز کا ہے پھنکی رکھے۔ کمند فروتنی میں اٹکی رکھے، جس میں خفت کم پائے۔ دانا ہو تو اس فریب کی ٹٹی کے قریب نہ آئے۔ (۵)

شیون نے اسی طرح سخن دہلوی کا خاکہ اُڑایا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے
کہ ایک روز منشی محمد اکرام علی خاں صاحب المتخلص بہ حسرت (۶) کے ایماء پر کچھ نظم و
نثر لکھ کر اُس 'محبّ ہم نشیں' کی خدمت میں پیش کی۔ جسے حسرت نے بہت پسند کیا اور
اسی وضع پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی، لیکن یہ معاملہ ایک عرصے تک تعویق میں رہا۔
بالآخر ایک روز شیون نمازِ وتر کے بعد جانماز پر ہی سو گئے تو خواب میں ایک بزرگ
نمودار ہوئے اور انھوں نے شیون کو دو کتابیں مطالعے کے لیے دیں۔ شیون صرف ایک
کتاب کا ہی مطالعہ کر پایا تھا کہ صبح ہو گئی اور آنکھ کھل گئی۔ صبح کو شیون نے اپنا یہ خواب
اپنے دوست منشی محمد اکرام علی خاں حسرت کو سنایا۔ حسرت نے تعبیر بیان فرمائی کہ تمھیں
وہ کتاب تصنیف کر کے اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ شیون نے حسرت سے کہا کہ نیا فسانہ
کہاں سے لاؤں۔ حسرت نے کہا کہ تمھارے استاد مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنی
کتاب ''شگوفۂ محبت'' میں آذر شاہ کوکبِ ہند کی داستان مختصر طور پر بیان کی ہے، تم اس
کو تفصیلاً بیان کر دو۔ شیون نے کہا: ''ماشاء اللہ آپ جان بوجھ کے بدنام کرتے ہیں۔
حق دوستی ناحق تمام کرتے ہیں۔ بھلا تصنیف جناب سرور رونقِ انجمن اور تالیف (۷)
فخر الدین محمد سخن کے سامنے کہ یہ بہرہ ور دریا کو کوزے میں بند کرتے ہیں، نکاتِ مشکل
پسند کرتے ہیں، میری تحریر کیا فروغ پائے گی۔ خلقِ خدا مفت بے وقوف بنائے گی۔''
بہر حال شیون اپنے دوست حسرت کے اصرار پر اس داستان کو لکھنے میں مشغول ہو
گئے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد اس کا نام ''طلسمِ حیرت'' رکھا۔ دیباچے کے خاتمے پر
شیون نے اپنے مرشد مولوی محمد تقی علی صاحب کا تذکرہ بڑی عقیدت سے کیا ہے۔

میر امن کی ''باغ و بہار'' (۱۲۱۷ھ) کے ۲۳ سال بعد رجب علی بیگ سرور
نے ''فسانۂ عجائب'' (۱۲۴۰ھ) لکھی۔ اُس وقت میر امن کا انتقال ہو چکا تھا۔ فسانۂ
عجائب کے ۳۶ سال بعد سیّد محمد فخر الدین سخن دہلوی نے سروشِ سخن (۱۲۷۶ھ) پیش کی

تو اس وقت مصنف فسانۂ عجائب مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی زندہ تھے۔ شیون نے سروش سخن کے بارہ تیرہ سال بعد قصۂ طلسمِ حیرت (۱۲۸۹ھ) لکھا تو سروش سخن کے مصنف سخن دہلوی زندہ تھے۔ سیّد محمد فخرالدین سخن دہلوی کا انتقال ۱۳۱۸ھ میں ہوا، لیکن اُنھوں نے قصۂ طلسمِ حیرت کا جواب لکھنا اپنے لیے عار سمجھا۔ اس لیے اُنھوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں فرمائی، اور نہ ان کے کسی حامی کی طرف سے اس کا جواب شائع ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی معارضہ یہاں آ کر ختم ہو گیا۔ ان چار فضلاء (میر امن دہلوی، سرور لکھنوی، سخن دہلوی اور شیون کاکوروی) کی اس سلسلے کی چاروں کتابیں (باغ و بہار، فسانۂ عجائب، سروشِ سخن اور طلسمِ حیرت) اُردو ادب کے غیر فانی شاہکار ہیں اور ان کے وجود میں آنے سے اُردو زبان و ادب کے ذخیرے میں انتہائی گراں قدر اِضافہ ہوا ہے۔ اہلِ علم کی باہمی چشمکوں اور ردّ و قدح سے سرمایۂ ادب مالا مال ہو جاتا ہے۔ فضلاء کی غیر ارادی کوششوں سے وہ مواد بہم پہنچ جاتا ہے جو بڑے بڑے منصوبوں سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔

''باغ و بہار''، ''فسانۂ عجائب''، ''سروشِ سخن'' اور ''طلسمِ حیرت'' بظاہر چار داستانیں ہیں، لیکن یہ چاروں داستانیں اُردو زبان و ادب کی تاریخ کی نہایت اہم کڑیاں ہیں اور پون صدی (۱۸۰۱ء/ ۱۲۱۷ھ تا ۱۸۷۲ء/ ۱۲۸۹ھ) میں زبان کے تدریجی ارتقا، تہذیبی اقدار اور معاشرتی رجحانات کی ایک حسین داستان اور ایک دلآویز مرقع ہیں۔

زمانۂ تصنیف:

جعفر علی شیون نے اس داستان کو ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں مکمل کر لیا تھا۔ چنانچہ اس پر شیون کے استاد مولوی محمد محی الدین خاں ذوق کاکوروی نے تقریظ بھی لکھی

جو مطبوعہ نسخے میں شامل کی گئی ہے۔ اس تقریظ کے خاتمے پر ذوق کاکوروی نے مختلف مادہ ہائے تاریخ تالیف کا استخراج کیا ہے۔ پہلے ایک قطعۂ تاریخ (۷) شعر کا اُردو زبان میں ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے:

لکھ اے ذوق یوں سالِ تصنیف اس کا
جو یہ باغ تو وہ گلِ جعفری ہے

دوسرا قطعہ چار مصرعی ہے، لیکن یہ بڑا عجیب قطعہ ہے۔ اس کے ہر مصرعہ سے ایک مختلف سنہ برآمد ہوتا ہے۔ پہلے مصرعے سے ہجری سنہ ۱۲۸۹ھ، دوسرے سے فصلی سنہ ۱۲۷۹، تیسرے سے بکرمی سمبت ۱۹۲۹ اور چوتھے مصرعے سے عیسوی سنہ ۱۸۷۲ء برآمد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نادر قطعہ کی تصنیف کے سلسلے میں ذوق کاکوروی نے بڑا خونِ جگر کھپایا ہوگیا، وہ قطعہ یہ ہے:

لکھوں میں مدحِ افسانہ کہ اوصاف اس طلاقت کے
۱۲۸۹ھ
کہ یہ رشکِ چمن اور وہ بہارِ طبع موزوں ہے
۱۲۷۹ھ
نہ الحق داستان ہے طاہر دستاں سرا بارے
۱۹۲۹ بکرمی
نہ افسانہ فسوں بہر پری زادان مضموں ہے
۱۸۷۲عیسوی

دو شعر کا ایک اور قطعۂ تاریخ ہے، جس سے ذوق کاکوروی نے سن ۱۲۸۹ھ نکالا ہے۔

ان قطعاتِ تاریخیہ سے یہ واضح ہے کہ یہ قصہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں لکھا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اشاعتِ اوّل (۱۲۹۰ھ) کے وقت مصنف علاّم محمد جعفر علی شیون کاکوروی نے خود بھی ایک قطعۂ تاریخ لکھا جو اس نسخے کے اختتام پر مطبع نولکشور سے شائع ہوا ہے۔ اس قطعہ کا عنوان یہ ہے: ''قطعۂ تاریخ چکیدۂ قلم عطارد رقم ناثرِ بے عدیل ناظم جزیل جناب منشی جعفر علی صاحب کاکوروی مؤلف افسانہ طلسم حیرت۔'' یہ پانچ اشعار کا قطعہ ہے جس میں سے چار شعر فارسی کے اور ایک عربی کا ہے۔ اس سے سنِ ہجری ۱۲۹۰ھ نکالا گیا ہے۔

بہرحال یہ داستان ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں مکمل ہو گئی تھی اور یہی اس کا سنِ تصنیف قرار دیا گیا ہے۔

''طلسمِ حیرت'' کے اجزاءِ ترکیبی:

شیون نے ''طلسمِ حیرت'' کے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ اس کا یہ قصہ اپنے استاد مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی کی داستان ''شگوفۂ محبت'' کی تفصیل ہے۔ سرور نے قصہ ''شگوفۂ محبت'' امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی فرمائش پر لکھا تھا اور مہر چند لکھنوی کے قصہ ملک محمود گیتی افروز موسومہ ''نوآئینِ ہندی'' (تالیف ۱۲۰۹ھ) کو بنیاد بنایا تھا۔ مہر چند کھتری کا قصہ طبع زاد نہیں تھا بلکہ وہ ایک مشہور فارسی قصے ''آذر شاہ وسمن رخ بانو'' کا اُردو ترجمہ تھا۔ بہرحال قصۂ آذر شاہ وسمن رخ بانو کو مہر چند کھتری نے فارسی سے اُردو میں منتقل کیا اور سرور نے اسے سامنے رکھ کر قصہ ''شگوفۂ محبت'' تحریر کیا۔ سرور کے شاگرد محمد جعفر علی شیون کاکوروی نے ''شگوفۂ محبت'' سے ''طلسم حیرت'' پیدا کیا۔

ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے(۸) کہ گو اس قصے کے عناصرِ ترکیبی عام داستانوں کے سے ہیں، لیکن پھر بھی اتنا امتیاز ہے کہ کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جسے ہم کہہ سکیں کہ یہ فلاں قصے سے اُٹھا کر رکھ لیا ہے۔ طلسمِ حیرت میں کچھ ضمنی کہانیاں بھی ہیں،

جن میں سے ''سہ جوان تحیر گزیں و برہمن مسکیں'' ہندی کہانیوں کی وضع پر ہے۔ اکثر کہانیاں جعفر علی شیون کی طبع زاد معلوم ہوتی ہیں۔ وہ کہانی جس میں ایک مکار عورت شہزادے کے کندھے پر سوار ہو کر سولی پر لٹکی ہوئی لاش کھاتی ہے، سنگھاسن بتیسی کی ساتویں کہانی سے ملتی جلتی ہے۔

ترتیبِ کتاب:

قصۂ طلسمِ حیرت کے آغاز میں حمد، نعت، مخمس در معجزات آنحضرت ﷺ ذکرِ معراج شریف، منقبت اصحابِ کرام، عرضِ حاجت بہ شیخ عبدالقادر جیلانی، ذکر راقمِ داستان اور سببِ تصنیف بیان کیا گیا ہے۔ مطبع نولکشور لکھنؤ سے اس داستان کا جو ایڈیشن تیسری بار ۱۸۸۲ء مطابق ۱۲۹۹ھ میں شائع ہوا ہے، اس کے صفحہ ۱۴۱ پر خاتمہ ہے۔ ۱۴۱ صفحات کے اس نسخے کے اوّلین ۲۰ صفحات پر مرقومہ بالا بیانات ہیں اور صفحہ ۲۱ سے داستان شروع ہوتی ہے جو صفحہ ۱۴۱ پر ختم ہوتی ہے۔ اس طرح سے اصل داستان اس نسخے کے ۱۲۱ صفحات (۲۱ تا ۱۴۱) پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس داستان میں علاوہ ایک مسلسل قصے کے ضمنی حکایات بھی ہیں۔ داستان کے خاتمے پر مصنف کا قطعۂ تاریخ تصنیف ہے۔ اس پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ مطبوعہ نسخے کے آغاز میں ''تقریظ طلسمِ حیرت چکیدۂ خامۂ سحر طراز حضرت استادی مولوی محمد محی الدین خاں صاحب ذوق کاکوروی دام اقبالہ ہے جو صفحہ ۲ و ۳ پر ہے۔ صفحہ ۴ سے حمد و نعت وغیرہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۲۰ پر ختم ہوتا ہے۔

مصنف بات کو پھیلا کر کہنے کا عادی ہے۔ ضمنی کہانیاں محض قصے کو طول دینے کے لیے لکھی گئی ہیں، ورنہ وہ اصل قصے سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتیں۔ اگر انھیں اس داستان میں شامل نہ بھی کیا جاتا تو داستان میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی۔ اصل داستان کو

بھی تلازمۂ خیال، رعایتِ لفظی اور ضلع جگت کے سہارے پھیلایا گیا ہے۔

تبصرہ:

کسی کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے اس کو اس کے عہد میں پہنچ کر دیکھنا چاہیے۔ ہر تصنیف پر اس کے عہد کا اثر ہوتا ہے اور اس کا مطالعہ کرتے وقت زمانۂ تصنیف کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ فسانۂ عجائب پر لوگ آج مختلف قسم کے اعتراضات کرتے ہیں، لیکن وہ یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ وہ جس زمانے میں تصنیف ہوئی ہے، اس وقت وہ روش اور طرز کس درجہ مقبول تھا اور اس کی مقبولیت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ ابتدائی چند سالوں میں متعدد بار طبع ہوئی۔ اگر اس کا اسلوبِ نگارش اور روشِ تحریر اس وقت مقبول نہ ہوتا تو وہ اس زمانے میں بار بار کیوں چھپتی۔ ہندوستان کے انتہائی نامور اور مشہور مطبعوں نے اسے چھاپ چھاپ کر اپنا نام پیدا کیا۔ بے شک آج وہ انداز ناپسند ہے، لیکن سرور بیچارے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مستقبل میں ملک اور قوم کا مزاج کیسا ہو جائے گا۔ ''سروشِ سخن'' کا مصنف بھی فسانۂ عجائب کی طرز کو نہ چھوڑ سکا اور اس روش پر اپنی کتاب لکھی۔ یہی کیفیت ''طلسمِ حیرت'' کی ہے۔ طلسمِ حیرت بھی فسانۂ عجائب کی زبان میں ہے۔ اُس زمانے میں یہ طرز عالمانہ سمجھا جاتا تھا۔ ہر شخص کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ اس انداز کی کتابیں تصنیف کر دیتا۔ ایسی کتابیں تصنیف کرنے کے لیے بھی انتہائی وسیع علم اور گہرے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرحال طلسمِ حیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی اُس کے زمانۂ تصنیف کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اُس عہد کی تصانیف میں اس کی حیثیت کیا تھی۔ تہذیبی اقدار بدلتی رہتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی ابنائے روزگار کی پسند و ناپسند بھی۔

طلسمِ حیرت کا مصنف چونکہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی کا شاگرد ہے

اور فسانۂ عجائب کی حمایت میں یہ کتاب لکھ رہا ہے، اس لیے وہ قدرتی طور پر فسانۂ عجائب کے اسلوبِ نگارش سے متاثر ہے۔ چنانچہ شیون نے یہ کتاب بھی فسانۂ عجائب ہی کی روایت پر لکھی۔ بلکہ اس کتاب پر فسانۂ عجائب کا بڑا گہرا اثر ہے۔ میں اس سلسلے میں دونوں کتابوں کے طویل اقتباسات دے کر اپنی عبارت کو طویل نہیں کرنا چاہتا۔ ایک آدھ موقع کی نشان دہی ضروری سمجھتا ہوں:

رات اور صبح کے متعلق ''طلسمِ حیرت'' میں مختلف مقامات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے، مثلاً

۱۔ ''آخر جس وقت لیلائے لیل نے جوڑا گیسوئے مشک بو کھول کر تا کمر چھٹکایا اور قیس داغ بر جگر قمر نجد افق سے نکل کر اسد چرخ کے پلنگ پر آیا۔'' (طلسمِ حیرت، طبع سوم، مطبع نولکشور، ۱۸۸۲ء، ص ۴۳)

۲۔ ''القصہ جب شیریں شب کی زلف تا کمر آئی اور خسرو انجم نے ہم آغوش ہو کے ہوسِ خام پکائی۔'' (طلسمِ حیرت، ص ۶۴)

۳۔ ''ایک روز جس دم حدادِ سحر مانند کاوۂ آہنگر مع آفریدون طیلسانی و درفش کاویانی، علم افرازِ سرِ البرزِ خاور ہوا اور لوہاک شب مثل ضحاک بصد بیم و باک مغاک مغرب میں کلۂ بسر ہوا۔'' (طلسمِ حیرت، ص ۸۳)

کیا فسانۂ عجائب کے مرقومۃ الذیل جملوں کا انداز بھی ایسا ہی نہیں ہے:

۱۔ ''جس وقت زاغِ شب نے بیضہ ہائے انجم آشیانۂ مغرب میں چھپائے اور صیادانِ سحر خیز دام بردوش آئے اور سیمرغِ زریں جناح طلا بال غیرتِ لال قفسِ مشرق سے جلوہ افروز ہوا یعنی شب گزری روز ہوا...''

۲۔ ''جس وقت خسرو خاور آرام گاہِ مشرق سے برآمد ہو کر جلوہ گرِ تخت زرنگار ہوا اور سپہ سالارِ انجم مع سوارانِ سیارہ کوہِ مغرب کی طرف روانہ ہوا...''

۳۔ "جب زلفِ لیلائے شب کمر تک پہنچی..." وغیرہ وغیرہ

طلسمِ حیرت پوری کی پوری کتاب ضلع جگت، ایہام، رعایتِ لفظی اور تلازمۂ خیال سے بھری ہوئی ہے۔ آغاز ملاحظہ فرمائیے:

طلسمِ حیرت افزا نقشِ نقشِ سحرخوانی ہے
پئے تسخیر ہر دل موہنی کی یہ نشانی ہے
عجب شکر فشاں مضموں ہے جس کو کوہ کن شیون
دہانِ گور سے کہتا ہے کیا شیریں کہانی ہے

نثارانِ جادوتحریر و شیریں زبانانِ نبات تقریر نیشکر خامہ کو بہ آبیاری دستِ نادر نگار کہ ہر پور صنعتِ کردگار کا نمونہ ہے، صناعی میں یدِ مانی سے دونا ہے کشت زارِ قرطاس پر اس داستان نورس کی گرہ کشائی میں یوں کشت دیتے ہیں..."

آغاز میں ہی صنعتِ براعت الاستہلال ہے۔ کتاب کا عنوان "طلسمِ حیرت" ہے جس کا اظہار بطورِ صنعت براعت الاستہلال کر دیا گیا ہے۔ یوں تو رعایتِ لفظی اور الفاظ کی صنعت گری لکھنؤ کے مصنفین کا طرۂ امتیاز ہے، لیکن اس کتاب میں ان چیزوں سے کچھ زیادہ ہی کام لیا گیا ہے۔ تراکیب کی دلآویزی اور شوکتِ الفاظ اس درجہ موجود ہے کہ مؤلف کی زبان و بیان پر ایک عدیم المثال دست رس اور قدرت کا پتہ دیتی ہے۔ مختلف النوع بیانات میں الفاظ، مصطلحات اور محاورات کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ اُردو زبان کی کسی دوسری کتاب میں اتنی چیزیں یکجا میسر نہیں آ سکتیں۔ مختلف رسوم کی جزئیات کی تفاصیل، سامانِ آرائش و زیبائش، زیورات، آلات حرب وغیرہ کی تفصیلات مصنف کے کثیر مطالعے اور عمیق مشاہدے کی شاہد ہیں۔ عام طور پر داستانوں میں شروع میں اور طویل بیانات کے موقع پر رنگین بیانی، الفاظ کی صنعت گری اور سجع وغیرہ کا زور باندھا جاتا ہے، لیکن طلسمِ حیرت کے مصنف نے یہ زور شروع سے

آخر تک قائم رکھا ہے۔

طلسمِ حیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے معائب اور محاسن علیحدہ علیحدہ پیش کیے جاتے ہیں، پہلے اس کے معائب ملاحظہ ہوں:

۱۔ طلسمِ حیرت میں یہ ایک نئی بات تھی کہ کہانی ہیروئن کے ملک کے حالات سے شروع ہوئی لیکن ایک تہائی کہانی کے بعد ہیرو سامنے آیا اور ہیروئن غائب ہو گئی۔ بقیہ داستان ہیرو کی مہمات پر مبنی ہو گئی۔ مناسب یہ تھا کہ جب قصہ کی ابتدا ہیروئن سے ہوئی تھی تو تمام قصہ ہیروئن کے ساتھ ساتھ ہی بیان کیا جاتا۔(۹)

۲۔ شہزادے کا ملکہ کے دربار میں گھوڑے پر پہنچنا اور سرِ دربار ناشائستہ ضلع جگت میں گفتگو کرنا آئین و آداب کے خلاف ہے۔

۳۔ جب وزیر زادی کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس سے مخاطب شہزادہ ہے جو شہزادی کا محبوب ہے تو پھر وزیر زادی کا اس شہزادے کو بھینچ بھینچ کر پیار کرنا مناسب نہیں ہے۔

۴۔ جس عورت میں اُڑ کر غائب ہو جانے کی صلاحیت موجود تھی، اسے خواہ مخواہ شہزادے کے کندھے پر سوار کرا کے سولی پر لٹکی ہوئی لاش کا گوشت کھلایا۔ وہ شہزادے کی ممنون کیوں ہوتی۔

۵۔ ٹھگوں کے شہر کو اَمصارِ مصر میں بتایا گیا ہے، لیکن نام، معاشرت اور رسوم سب ہندوستان سے متعلق ہیں، وہ چیزیں بھی مصری ہونی چاہیے تھیں۔ یا اس شہر کو ہندوستان میں واقع بتایا جا سکتا تھا۔ جبکہ اس قصے میں ہندوستان کا ذکر موجود بھی ہے۔

۶۔ ٹھگوں کے چودھری کی لڑکی زبردستی شہزادے کے ساتھ ہو لیتی ہے۔ بالآخر شہزادہ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ پھر دفعتہً مصنف اس کا ذکر چھوڑ دیتے ہیں اور آخر

تک کہیں یہ نہیں بتایا کہ پھر اُس لڑکی کا کیا ہوا۔

۷۔ قصے کا پلاٹ بہت الجھا ہوا ہے۔ مصنف خود اس درجہ انتشار کا شکار ہے کہ اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ وہ پیچھے کیا کہہ آیا ہے۔

۸۔ قصے کے آغاز میں ناہید پری مر جاتی ہے۔ قصے کے اختتام کے قریب ایک مجذوب ٹھوکر مار کر اس کو زندہ کر دیتا ہے۔ ایک مجذوب کی یہ مسیحائی محلِ نظر ہے۔

۹۔ بیانات بہت الجھے ہوئے ہیں، جملوں میں عطف و اضافت درست نہیں ہیں۔ بعض اوقات فقروں اور جملوں سے معانی کا نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عبارت میں روانی اور تسلسل مفقود ہے۔ قدم قدم پر رکاوٹ ہوتی ہے۔ ابہام و رعایتِ لفظی کی وہ بھرمار ہے کہ مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ تشبیہیں اور استعارے بے جا اور کثرت سے ہیں۔

۱۰۔ اس قصے میں کردارنگاری بہت معمولی ہے، بیانات بھی زیادہ عمدہ نہیں۔ ضلع جگت کمال پر ہے۔ اس سے مصنف کی مشاقی اور طلاقت زبان کا تو اندازہ ہو جاتا ہے، لیکن پڑھنے والے کو سخت الجھن ہوتی ہے۔

۱۱۔ مصنف طوالت پسند ہے اور ہر بات ٹیڑھی کر کے پیش کرتا ہے۔

اب کچھ اس کی خصوصیات بھی ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ طلسمِ حیرت لکھنؤ کی معاشرت کا انتہائی عمدہ مرقع ہے۔

۲۔ پوری کتاب ضلع جگت میں ہے، بعض ضلع جگت اتنے عمدہ پیش کیے ہیں کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے، مثلاً

(الف) ''ایک ضیق النفس سے دمادم سر پتھر سے ٹکرانے لگی، ایک زندگی سے دق ہو کر سِل سے سینہ لڑانے لگی۔''

(ب) ''آپ اُلّو ہیں جو باز رہیں۔''

(ج) ''جس کی متاعِ دین و ایمان، نقدِ جان اس ٹھگ نے بھانپی، فوراً دامِ محبت میں گردن پھانسی۔''

(د) ''اس مارکینِ پرور کی جعلی باتوں اور چھیٹوں سے میں نے جان جنجال میں پھنسائی، تجھ سے جامہ زیب کی اس گاڑھے دکھ میں یاد آئی۔ کفِ افسوس مل مل پچھتائی۔ صفحہ خاطر سے امید کو دھو، تر چشم کر، دل پر بارِ غم رکھ کر قبائے تسلیم تن زیب کی...''

۳۔ پوری کتاب اسلوب کے اعتبار سے ہموار ہے اور اندازِ بیان میں یکسانی ہے۔

۴۔ چند واقعات کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ بالخصوص ٹھگوں کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سب صحیح اور واقعات کے مطابق ہے۔ ۱۸۵۷ء (انقلاب) سے قبل پنڈاریوں اور ٹھگوں کا جو زور تھا، اس کی وجہ سے آمدورفت کے راستے پرخطر تھے۔ اس کی کیفیت ملک زادۂ مرات الخیال کی کہانی میں بیان کی گئی ہے۔ ایک چھوٹی سی حکومت کا سرجن سنگھ راجپوت قزاق کی وجہ سے ناک میں دم آ جانا بالکل صحیح ہے۔ اسی سلسلے میں مصنف نے نئی چیزیں بھی پیش کی ہیں، مثلاً ایک گاؤں کا گھر، اس کے قریب شراب کی بھٹی اور بھٹی کے آگے بھڑ بھونجے کا پتے جھونکنا، یہ سب ایک جیتی جاگتی زندگی کی تصویریں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ طلسمِ حیرت میں تمثیل نگاری بھی خوب ہے مثلاً

(الف) شاہ صاحب کے حضور میں شہزادی کی خواہش ایک بڑھیا کی شکل بن جاتی ہے، جہاں غضب دربان ہوتا ہے، رحم مدد دیتا ہے، یاس ورغلاتی ہے، امید بہلاتی ہے۔ وغیرہ

(ب) طلسم ہلیناس میں انتہائی کامیاب طلسم نگاری ہے۔

(ج) کتاب کے خاتمے پر وصل کی کیفیت بیان کرتے ہیں، مصنف کی شگفتہ طبعی بیان میں شعریت و لطافت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی مثالیں اُردو زبان میں بہت کم ملیں گی۔ اس موقع پر شہزادی جس انداز میں فریاد کرتی ہے، اس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''اُردو میں تمثیل کی ہر دور میں کمی رہی ہے۔ ''نیرنگِ خیال'' کے سر مکمل اور خالص تمثیل نگاری کا سہرا ہے، لیکن شیون نے شہزادی کی فریاد کے سلسلے میں جو تمثیل کی بنیاد رکھ دی ہے، وہ آزاد کے سر سے اوّلیت کا سہرا چھین لیتی ہے۔''(۱۰)

۶۔ اس داستان میں محبت کی ابتداء عورت کرتی ہے۔ یعنی تصویر دیکھ کر عشق کی چنگاری پہلے شہزادی کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور کہانی کافی دور تک شہزادی کے حالات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، لیکن جب شہزادہ داستان میں داخل ہوتا ہے اور شہزادی کی تلاش میں نکلتا ہے تو داستان کا رُخ بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد داستان میں بلا کا زور آ جاتا ہے۔ داستان کے اس نصفِ آخر کے متعلق سیّد وقار عظیم صاحب فرماتے ہیں: ''داستان کا یہ نصف حصہ ہر حیثیت سے ابتدائی نصف حصے سے بہتر ہے۔ سختی کی وہ ساری منزلیں جو سدا سے عشق کا مقسوم و مقصود رہی ہیں، اس حصے میں آتی ہیں۔ طلسم و سحر کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے جو تخیل سے بنایا اور بسایا ہے اور اس کے ذکر میں قلم کی پوری جولانی سے کام لیا ہے۔ بیان میں شعریت اور لطافت بھی زیادہ ہے اور ندرت و رنگینی بھی۔ داستان کے ابتدائی حصوں میں مصنف نے نثر کے ساتھ شعر بہت کم استعمال کیے ہیں۔ اس حصے میں جابجا شعر استعمال ہوئے ہیں، لیکن اس طرح کہ بات کو زیادہ مؤثر اور عبارت کو زیادہ پرلطف بناتے ہیں۔ ان کے صرف میں توازن و اعتدال اور

انتخاب میں حسنِ ذوق کا پورا دخل ہے۔"(۱۱)

۷۔ جعفر علی شیون نے اپنے اس قصّے میں اشعار کا بڑا برمحل استعمال کیا ہے۔ علاوہ اپنے اشعار کے مرقومۃ الذیل شعراء کے اشعار بھی نقل کیے ہیں:

قلق، محمد اکرام علی خاں حسرت، خواجہ وزیر، مومن، انشاء، مرزا حاتم علی مہر، میر، بہار لکھنوی، ناسخ، تراب علی، منشی محمد حسن رئیس بھدیوان، گوہر، غالب، اشرف علی، اعجاز، آتش وغیرہ۔

اشعار کے علاوہ کلام کی ترصیع میں آیاتِ قرآن اور عربی فقرات سے بھی کافی کام لیا ہے۔

طلسمِ حیرت اگرچہ قصّے کے اعتبار سے چنداں اہم نہ ہو، کردار نگاری کے اعلیٰ نمونے بھی اس میں موجود نہ ہوں اور بیانات کی عمدگی کے لحاظ سے بھی زیادہ وقیع نہ ہو، لیکن ایک خاص انداز کی نثر کا رتبہ متعین کرنے کے سلسلے میں یہ کتاب اُردو ادب میں ایک غیرفانی یادگار ہے اور اپنے مخصوص اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے۔

طباعت و اشاعت:

طلسمِ حیرت ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء میں لکھی گئی، اس کا خاتمہ ۱۲۹۰ھ میں ہوا۔ اس سال یہ کتاب مطبع نولکشور لکھنؤ سے پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کے بعد دوسری اشاعت کا مجھے علم نہیں۔ البتہ یہ کتاب تیسری مرتبہ مطبع نولکشور لکھنؤ سے ہی اگست ۱۸۸۲ء مطابق رمضان ۱۲۹۹ھ میں شائع ہوئی اور بھی مطبعوں سے شائع ہوئی ہوگی۔ میرے پیشِ نظر اس کی طبع اوّل اور طبع سوم ہی ہے۔ نولکشوری ایڈیشن کا متن صفحہ ۱۴۱ پر ختم ہو جاتا ہے۔ صفحہ ۱۴۲ پر خاتمۃ الطبع ہے۔

تصحیحِ متن:

میں نے "طلسمِ حیرت" کا متن ترتیب دیتے وقت اس کی طبع اوّل مطبوعہ نولکشور ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء اور طبع سوم مطبوعہ ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۲ء کو پیشِ نظر رکھا ہے اور کوشش کی ہے کہ متن کو اسی عہد کی زبان کی صورت میں پیش کیا جا سکے۔

خلیل الرحمٰن داوٗدی

ٹیگور پارک، لاہور

۱۸ر ستمبر ۱۹۶۶ء

حوالے اور حواشی:

(۱) باغ و بہار، ناشر انجمن ترقیٔ اُردو (ہند)، دہلی، ص ۶

(۲) فسانۂ عجائب، مطبوعہ نولکشور، لکھنو، ۱۸۷۹ء، ص ۱۸

(۳) سخن نے اپنی کتاب کو تصنیف اور سرور کی کتاب کو تالیف کہا ہے۔

(۴) سروشِ سخن، ناشر مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۸ تا ۱۰

(۵) "طلسمِ حیرت" مطبوعہ نولکشور، لکھنو، طبع سوم، ۱۸۸۲ء مطابق ۱۲۹۹ھ، ص ۱۵

(۶) ان بزرگ کی بھی شیون نے بہت تعریف کی ہے اور ان کے اشعار بھی اپنے قصّے میں اکثر مقامات پر درج کیے ہیں، لیکن مجھے تو ان کے متعلق بھی کسی تذکرے میں کچھ نہیں ملا۔ حالانکہ خُم خانۂ جاوید، جلد دوم میں حسرت تخلص کے ۱۲ اشخاص کا تذکرہ ہے اور سخن شعراء میں بھی ۴ حسرت موجود ہیں۔

(۷) سخن نے سروشِ سخن کے دیباچے میں اپنی کتاب کو تصنیف اور سرور کی کتاب کو تالیف لکھا تھا، یہ اس فقرے کا جواب ہے۔

(۸) "شمالی ہند میں اُردو کی نثری داستانیں"، ناشر انجمن ترقی اُردو (پاکستان)، کراچی، ۱۹۵۴ء، ص ۱۸۰

(۹) "شمالی ہند میں اُردو کی نثری داستانیں"، از ڈاکٹر گیان چند جین، ناشر انجمن ترقی اُردو

(پاکستان)، کراچی، ۱۹۵۴ء

(۱۰) ''شمالی ہند میں اُردو کی نثری داستانیں''، ناشر انجمن ترقی اُردو (پاکستان)، کراچی، ۱۹۵۴ء، ص ۴۷۵

(۱۱) ''ہماری داستانیں''، ناشر اُردو مرکز، لاہور، طبع دوم، ۱۹۶۴ء، ص ۳۸۳

...ل الرحمٰن داؤدی

گلدستۂ نازنیناں

شعرائے اُردو کا ایک گرانقدر تذکرہ

اولین تذکرہ نگاران شعرائے اُردو میر تقی میر (نکات الشعراء)، میر فتح علی گردیزی (تذکرہ ریختہ گویاں)، قیام الدین قائم (مخزن نکات)، علی ابراہیم خاں (گلزارِ ابراہیم)، شفیق اورنگ آبادی (چمنستان شعراء)، اسد علی خاں تمنا (گلِ عجائب)، میر حسن دہلوی (تذکرہ شعرائے اُردو)، غلام ہمدانی مصحفی (تذکرۂ ہندی گویان و ریاض الفصحاء) وغیرہ کا زمانہ اِٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر یا انیسویں صدی کے آغاز میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد متوسطین کا دور آتا ہے۔ میر قدرت اللہ قاسم کا مجموعۂ نغز اس دور کا نقشِ اوّلین ہے۔ اس کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کسی قدر نئے انداز کی تذکرہ نگاری کی بنا ڈالتے ہیں، لیکن تذکرہ کی زبان اپنے پیشرووں کی طرح فارسی ہی رکھتے ہیں، یعنی شعرائے اُردو کا تذکرہ بزبان فارسی۔ شیفتہ کا تذکرہ ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء میں تمام ہوتا ہے۔ تذکرہ نویسی کے اس دور میں چند ہی تذکرے لکھے گئے۔ ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء میں شیفتہ کے تذکرہ 'گلشن بیخار' کے جواب میں حکیم غلام قطب الدین باطن نے ایک تذکرہ 'گلستان بیخزان المعروف بہ نغمۂ عندلیب' لکھا۔ ۱۸۴۸ء میں مولوی کریم الدین پانی پتی ثم الدہلوی اور مسٹر ایف فیلن نے گارسن دی تاسی کے تذکرۂ شعرائے اردو کو فرانسیسی زبان سے ترجمہ اور اضافہ کر کے ایک مبسوط تذکرہ 'طبقات شعرائے ہند'

ترتیب دیا۔ تذکرہ نویسی کا یہ دوسرا دور انقلاب ۱۸۵۷ء تک ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اُردو و فارسی کے نامور تذکرہ نگار و انشاء پرداز مولوی محمد حسین آزاد دہلوی نے شعرائے اُردو کا شہرہ آفاق تذکرہ 'آبِ حیات' لکھا، جس کی تحریک پر تذکرہ نویسی کا تیسرا دور شروع ہو گیا۔ حکیم عبدالحی کا گلِ رعنا، عبدالسلام ندوی کا شعرالہند، رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادبیاتِ اُردو اور لالہ سریرام کا خمخانۂ جاوید اس تیسرے دور کی تذکرہ نویسی کی یادگار ہیں۔

پہلے دور کے بیشتر تذکرے انجمن ترقیٔ اُردو نے شائع کر کے اُردو زبان و ادب پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ دوسرے دَور کے تذکروں میں مجموعہ نغز 'گلشنِ بے خار'، 'گلستانِ بے خزاں' اور 'طبقات شعرائے ہند' وغیرہ بھی شائع ہو چکے ہیں، جن میں سے قاسم کا تذکرہ جو ماضی قریب میں پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیا، اب بھی عام طور پر مل جاتا ہے، لیکن دوسرے تذکرے کمیاب ہیں۔ اس دور کا سب سے عمدہ تذکرہ 'طبقات شعرائے ہند' خیال کیا جاتا ہے جو گارسن دی تاسی کے تذکرے سے ماخوذ ہے۔ اسے فیلن اور مولوی کریم الدین مدرسین آگرہ کالج نے ترتیب دیا تھا۔ یہ تذکرہ دہلی سے ۱۸۴۸ء میں ۹۶۴ شعرا کے احوال پر ۵۰۴ صفحات میں شائع ہوا تھا۔ آج کل یہ تذکرہ بہت کم یاب ہے۔ مولوی کریم الدین نے اس تذکرے سے پہلے ایک اور تذکرہ ترتیب دیا تھا، جو ۲۷ شاعروں، ۱۰ شاعرات یعنی کل ۳۷ کاملانِ فن کا تذکرہ ہے اور ۳۴۰ صفحات کو محتوی ہے۔ اس تذکرہ کا سائز بھی 'طبقات شعرائے ہند' کے سائز سے بڑا ہے۔ مولوی کریم الدین کے اس اوّلین تذکرہ کا نام 'گلدستۂ نازنیناں' ہے جو ان ۳۷ شاعروں کے لیے طبقات شعرائے ہند سے زیادہ مبسوط ہے کیونکہ طبقات شعرائے ہند کے ۵۰۴ صفحات میں ۹۶۴ شعراء کی کیفیات ہیں اور ''گلدستۂ نازنیاں'' کے ۳۴۰ صفحات پر صرف ۳۷ شعراء کا انتخاب کلام اور حالات ہیں۔ ''گلدستۂ نازنیناں'' صرف

بار مطبع رفاہ عام حوض قاضی دہلی سے ۲۹ر جولائی ۱۸۴۵ء مطابق ۲۳ر رجب ۱۲ھ کو طبع ہو کر شائع ہوا تھا یعنی مولوی کریم الدین کے دوسرے تذکرہ 'طبقات شعرائے ہند' کی اشاعت ۱۸۴۸ء سے تین سال قبل شائع ہو چکا تھا، جس کا تذکرہ مؤلف نے طبقات شعرائے ہند میں ضمناً کیا ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے شاہانِ اُردو کے کتب خانہ کی فہرست تیار کی تھی، جو ۱۸۵۴ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس فہرست میں نمبر ۵۹ پر ''گلدستۂ نازنیناں'' کے عنوان سے یہ کتاب موجود ہے۔ تعجب ہے ڈاکٹر اسپرنگر پر۔ کتاب سامنے تھی، لیکن اسے تفصیل سے دیکھے بغیر لکھ گئے کہ ''ایک مجموعہ اشعار شعرائے ریختہ بغیر سیر شعراء مؤلفہ مولوی کریم الدین دہلوی سے جو کہ اب آگرہ کالج میں ہندوستانی زبان کے مدرس ہیں اور عمر ۳۵ سال کے قریب ہے...'' جیسا کہ میں نے ابھی واضح کیا ہے کہ اس کتاب کے ۳۳۰ صفحات پر صرف ۳۷ اشخاص کا کلام معہ ان کے حالات کے درج ہے۔ اس عہد کا اور کوئی تذکرہ اس درجہ مفصل نہیں۔ تذکرہ نگاروں نے اس سلسلہ میں متقدمین کا تتبع کیا ہے یعنی دو چار سطور شاعر کے احوال میں لکھ کر دو چار شعر نقل کر دیئے۔ لیکن مولوی کریم الدین دہلوی نے اس تذکرہ کو کافی جامع بنایا ہے یعنی شعراء کے حالات و کلام کے سلسلہ میں متقدمین و معاصر تذکرہ نگاروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ التفات برتا ہے۔ کسی شاعر کا کلام بغیر اس کی سیرت کے درج نہیں کیا ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر اسپرنگر نے کس شہادت کی بنا پر یہ لکھ ڈالا کہ یہ مجموعۂ اشعار شعرائے ریختہ بغیر سیر شعراء ہے۔ حالانکہ ''گلدستۂ نازنیناں'' میں خواجہ میر درد کی سیرت بیس سطور میں مرقوم ہے۔ میر تقی میر کے حالات ۱۳ سطروں میں لکھے گئے ہیں۔ مومن خاں کے حالات پر ۲۳، ذوق کے لیے ۱۸، جرأت، انشاء پر ۱۰، ۱۰ غالب پر ۱۴، زین العابدین عارف پر ۳۰، شاہ نصیر پر ۸، احسان پر ۱۲ اور ممنون پر ۹ سطریں لکھی ہیں۔ یہی حال بقیہ شعراء کا ہے۔ کسی شاعر کا کلام بغیر اس کے حالات کے نہیں دیا

ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر پر افسوس ہے کہ اُنھوں نے مولوی کریم الدین کے اس کارنامہ کو تذکرہ کی بجائے مجموعۂ اشعار بنا دیا۔ حالانکہ یہ تذکرہ شعرائے متوسطین کے احوال و کوائف کے سلسلہ میں بہترین معاصرانہ دستاویز ہے۔ گارسن دی تاسی کی شہرہ آفاق کتاب ''اصلی تذکروں سے۔ماخوذ ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات'' کے باب اوّل کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب نے کیا ہے جو انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ ''اُردو'' کی جنوری ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ مضمون ایک بار اور اسی رسالہ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں اُردو شعراء کے تذکروں، گلدستوں اور مجموعوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جہاں جہاں فاضل مترجم یا مدیر کو گارسن دی تاسی سے اختلاف ہوا ہے، ظاہر کر دیا ہے لیکن تعجب ہے ڈاکٹر صاحب موصوف پر اور اس سے زیادہ افسوس ہے مولوی عبدالحق صاحب پر کہ یہ مضمون کافی اغلاط سے پر ہے اور غلطیاں بھی بڑی موٹی موٹی ہیں جو تاریخ ادب اُردو کے ایک معمولی طالب علم کی نظر سے بھی نہیں بچ سکتیں۔ وہ ان صاحبان کونظر کیوں نہیں آئیں؟ چنانچہ گلدستۂ نازنیناں کی نسبت بھی فاضل مضمون نگار غلط فہمی کا شکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے یہ کتاب خود نہیں دیکھی، بلکہ ڈاکٹر اسپرنگر کے بیان کو من و عن نقل کر دیا، ورنہ گارسن دی تاسی کبھی یہ نہ لکھتا کہ یہ تذکرہ چھوٹی تقطیع کے ۳۵۰ صفحات پر ہے۔ یہ تذکرہ تو نایاب ہے۔ گارسن دی تاسی نے تو دوسرے عام تذکروں کی نسبت بھی غلط معلومات فراہم کی ہیں، مثلاً پہلے شیفتہ کے ''گلشنِ بے خار'' کا تذکرہ کرتا ہے اور اس کے فوراً بعد ''گلشنِ بے خزاں'' کے عنوان سے دوسرے تذکرہ کا ذکر ان الفاظ سے شروع کرتا ہے: ''یہ مندرجہ بالا تذکرہ کا اُردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ حکیم سیّد قطب الدین باطن نے کیا۔ یہ آگرہ میں پیدا ہوئے اور اپنے دادا کی طرح طبابت کرتے تھے۔ ۱۸۴۳ء/ ۱۲۵۹ھ میں آگرہ ہی میں انتقال کیا...'' گارسن دی تاسی کی

اس عبارت کو مولوی عبدالحق صاحب نے اسی طرح شائع کر دیا ہے اور اس پر کوئی اختلافی نوٹ بھی نہیں لکھا ہے۔ حالانکہ یہ تمام غلط ہے۔ قطب الدین باطن کے تذکرہ کا نام ''گلستانِ بےخزاں'' ہے جو شیفتہ کے تذکرہ کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کے جواب اور ردّ میں لکھا گیا ہے۔ یہ بات ''گلستانِ بےخزاں'' کے دیباچہ اور متن کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے۔ اس میں شیفتہ کے تذکرہ کی تنقیص کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قطب الدین باطن نے یہ تذکرہ ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء میں مکمل کیا اور مؤلف نے خود اس کی تکمیل کے قطعات تاریخ کہے ہیں جو تذکرہ کے آخر میں موجود ہیں۔ اس سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہی ہے کہ ۱۲۶۵ھ تک باطن زندہ تھے۔ اختتام کے باطن نے ایک دو نہیں چار قطعات کہے ہیں اور ہر ایک قطعہ کافی طویل ہے۔ قطعاتِ تاریخ کا عنوان یہ ہے: ''قطعاتِ تاریخات از مؤلف خوش صفات''۔ ان قطعات میں ۱۲۶۵ھ موجود ہے۔ مؤلف کے علاوہ دوسرے تقریظ نگاران نے بھی مؤلف کی حیات کا ذکر کیا ہے۔ یہی نہیں کہ مؤلف نے قطعاتِ تاریخ اختتام کہے ہیں بلکہ قطعۂ تاریخ آغازِ کتاب بھی کہا ہے جو یہ ہے:

سالِ آغاز اس مرقعے کا
ہے گلستانِ بے خزاں یہ دیکھ

اس قطعۂ تاریخ آغازِ کتاب سے ۱۲۶۱ نکلتے ہیں۔ خود مؤلف کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۶۱ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۶۵ھ میں ختم ہوا۔ میں نہیں سمجھتا کہ گارسن دی تاسی نے کس طرح لکھ دیا کہ باطن کا انتقال ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء میں ہو گیا۔ اور اس کے بیان کو ''اُردو'' میں اسی طرح نقل کر دیا گیا۔ مجھے اس سلسلہ میں مولوی عبدالحق صاحب سے شکایت ہے۔ غرضیکہ اس قسم کی کافی اغلاط سے یہ مضمون پر ہے جو رسالہ ''اُردو'' میں دو بار شائع ہو چکا ہے۔ چنانچہ ''گلدستۂ نازنیناں'' کے متعلق بھی اس

کا بیان لائقِ پذیرائی نہیں ہے۔ رسالہ اُردو کے متعلق ضمناً ایک دو باتیں اور کہتا جاؤں جو زبان و ادب کے طالب علم کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب کا شمار اُن فضلاء میں ہے جو قلمی کتابوں کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد دکن کے عجائب خانہ کی قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست بھی وہی تیار کر رہے ہیں جو ''نوائے ادب'' بمبئی میں بالاقساط شائع ہو رہی ہے۔ یہی نصیر الدین ہاشمی صاحب (مؤلف 'دکن میں اُردو' اور 'یورپ میں دکنی مخطوطات' وغیرہ) رسالہ اُردو کی حالیہ اشاعت مجریہ جولائی ۱۹۵۵ء میں کتب خانہ سالارِ جنگ کی اُردو قلمی کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے، چند نایاب اور گمنام کتابوں کے ذیل میں فرماتے ہیں ''میر حسن سے ان کی مثنوی بدرمنیر کے باعث دنیائے اُردو خوب واقف ہے مگر ان کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ میر حسن کے دیوان کے تین نسخے اس کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔''

ناظرین پر واضح ہو کہ نصیر الدین ہاشمی صاحب نے یہ سب کچھ اس دیوان کے متعلق لکھا ہے جو آج کل بازار میں عام طور پر چھ آنے کا مل جاتا ہے اور مطبع نولکشور سے ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے آگے نایاب اُردو تذکروں کے ذکر میں فرماتے ہیں ''ایک دوسرا تذکرہ بہارستان ناز کے نام سے محفوظ ہے۔'' بہارستان ناز پر فٹ نوٹ لکھتے ہیں، ''غالباً درگا پرشاد نادر کا تذکرہ ہے؟ چھپ چکا ہے۔'' بہارستان ناز کے مصنف کے متعلق نصیر الدین ہاشمی صاحب کو صرف اتنا ہی معلوم ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب نے بھی اس پر کوئی نوٹ نہیں دیا ہے اور اسے جوں کا توں چھاپ دیا ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب اور نصیر الدین ہاشمی صاحب کو یہ کون بتائے کہ بہارستان ناز کے مصنف حکیم فصیح الدین رنج و طبیب میرٹھی ہیں اور درگا پرشاد نادر کے مشہور و معروف تذکرہ کا نام ''تذکرۃ النسائے نادری یا مراۃ خیال'' ہے جو ان کے تذکروں گلشنِ ناز، چمن انداز اور تکملوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۱۸۸۴ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہو

چکا ہے۔ بہارستانِ ناز کا مصنف درگا پرشاد نادر کہہ کر نصیر الدین ہاشمی صاحب نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ نہ صرف بہارستان ناز کے مصنف سے بے خبر ہیں بلکہ ایک اور نامور تذکرہ نگار درگا پرشاد نادر سے بھی بالکل ناواقف ہیں۔ یہ ایسی لغزشیں ہیں جو کسی ماہر کتابیات کو زیبا نہیں۔ اگر ہاشمی صاحب تکلیف فرما کر بہارستانِ ناز کے ابتدائی دو تین اوراق پڑھ لیتے تو انھیں دیباچہ سے ہی مصنف کا نام معلوم ہو جاتا۔ بہارستانِ ناز بڑا مقبول تذکرہ ہے۔ اس کی اوّلین اشاعت ۱۲۸۲ھ میں دوسری ۱۲۸۵ھ میں اور تیسری ۱۲۹۹ھ میں ہوئی تھی۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب تو اُردو کے مضمون نگار ہیں۔ اس کے فاضل مدیر بھی بعض اوقات بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اپریل ۱۸۵۰ء کی اشاعت میں سب سے پہلا مضمون خود مولوی عبدالحق صاحب نے بعنوان ''سرسیّد احمد خاں'' لکھا ہے جو رسالہ کے اوّلین ۸۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مولانائے ممدوح نے اس میں بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں، مثلاً صفحہ ۳۴ پر آپ ایک انتہائی معروف کتاب ''فسانۂ عجائب' کے سلسلہ میں فرماتے ہیں، ''ان کی اصل تصنیف آثار الصنادید فی الواقع ایک علمی تصنیف ہے، ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی۔ اسی زمانہ کے لگ بھگ ۱۸۴۵ء میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب لکھا۔'' حالانکہ اس پر سب متفق ہیں کہ فسانۂ عجائب کا سنِ تصنیف ۱۸۴۵ء نہیں بلکہ سرور اس سے اکیس سال پیشتر ۱۸۲۴ء مطابق ۱۲۴۰ھ میں اسے مکمل کر چکے تھے۔ اس کے بعد مولانا عبدالحق صاحب کا یہ فرمانا کہ آثار الصنادید اور فسانۂ عجائب ایک ہی وقت کی تصانیف ہیں، کس درجہ تحیر انگیز ہے۔ مجھے اپنے اس مختصر مضمون میں مولانا کی جملہ فروگزاشتوں کی نشان دہی مقصود نہیں۔ یہ چند باتیں تو ضمناً کہہ گیا ہوں، اب اپنے اصل موضوع گلدستۂ نازنیناں پر واپس آتا ہوں۔

کتاب کے آغاز میں سبب تالیف بیان کرتے ہوئے، مولوی کریم الدین نے لکھا ہے کہ یہ منتخب دواوین شعرائے ریختہ اپنے ایک دوست کی فرمائش پر ترتیب دیا

تھا اور اس کے ساتھ ایک رسالہ علم عروض کا بھی منسلک کیا تھا۔ وہ رسالہ علیحدہ صورت میں ۱۸۴۵ء میں ہی اس تذکرہ کے ساتھ مطبع رفاہِ عام دہلی سے چھپا تھا۔ وہ اب بھی مل جاتا ہے۔ عجالتہ العلالہ اس کا نام ہے۔ پنجاب پبلک لائبریری اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں۔ لیکن ''گلدستۂ نازنیناں'' کا کوئی نسخہ پنجاب پبلک لائبریری یا یونیورسٹی لائبریری میں موجود نہیں ہے اور کسی کتب خانہ کی فہرست پر بھی یہ نسخہ نظر نہیں آتا۔ یہ بہت کم یاب ہے۔ میرے خیال میں میرے علاوہ شاید ہی اور کسی شخص کے پاس اس کا کوئی نسخہ موجود ہو۔ بہر حال اس مفید تذکرۂ شعراء کی نایابی کے پیشِ نظر میں اس کی کیفیت اصحابِ ذوق پر واضح کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مولوی کریم الدین نے اس تذکرے مَیں ۲۷ شعراء اور ۱۰ شاعرات شامل کی ہیں۔ ۲۷ میں سے ۶ متقدمین میں سے ہیں جن کا زمانہ اٹھارہویں صدی عیسوی پر ختم ہو جاتا ہے۔ بقیہ ۲۱ میں سے کچھ اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوّل تک رہے اور کچھ انیسویں صدی ہی کی یادگار ہیں۔ ان ۲۷ شعراء کے علاوہ دس عورتوں کے حالات اور کلام کو بھی ترتیب دیا ہے۔ متقدمین میں سے ۶ شاعر یہ ہیں، جن کے منتخب اشعار کی تعداد بھی پیش کر رہا ہوں:

ولی (تعداد اشعار ۶۹)، حاتم (۵۰ اشعار)، درد (۳۰۰ اشعار)، میر (۴۲۱ اشعار)، سودا (۶۸۵ اشعار)، ہدایت (۶۹ اشعار)۔ متوسطین کے ۲۱ شاعر یہ ہیں:

نظیر (۱۰۴ اشعار)، نصیر (۱۴۲ اشعار)، قاسم (۳۸ اشعار)، ممنون (۹۸ اشعار)، مصحفی (۶۶ اشعار)، انشاء (۳۷۵ اشعار)، جرأت (۳۹۸ اشعار)، ناسخ (۷۰ اشعار)، آتش (۱۱۴ اشعار)، تسکین (۳۷ اشعار)، عشق (۲۲ اشعار)، احسان (۱۰۱ اشعار)، مومن (۲۸۶ اشعار)، ذوق (۵۴۹ اشعار)، شیفتہ (۶۴ اشعار)، اسد اللہ

غالب (۱۰۶ اشعار)، معروف (۴۲۱ اشعار)، عارف (۴۳۲ اشعار)، نگہت (۳۵ اشعار)، اثیم (۲۷ اشعار)، چرکین (۱۲۲ اشعار)۔

یہ ۲۱ شعراء مؤلف کے معاصر ہیں اور ان کے متعلق مؤلف کو براہِ راست معلومات حاصل ہیں، جو ایک تذکرہ نگار سے قلمبند ہونے کے بعد بڑی گراں قدر ہیں۔ صفِ اوّل کے شعراء کے متعلق تو بہت کچھ مل جاتا ہے، لیکن عارف، معروف اور احسان وغیرہ کے حالات اور اشعار کہاں ملتے ہیں۔ نظیر کے جوگی نامہ کو شریر شاعر شاہجہاں آباد نے خمسہ کیا تھا، وہ بھی اس تذکرہ میں محفوظ ہے۔ عارف کے ۴۳۲ اشعار اس تذکرہ نے دستبردِ زمانہ سے بچا لیے ہیں۔ عام تذکروں میں عارف کے چند اشعار ملتے ہیں۔ عارف کے کلام کا بڑا حصہ اسی تذکرہ نے محفوظ کیا ہے۔ عارف کو بحیثیت شاعر زندہ رکھنے کا یہی تذکرہ ضامن ہے۔ ۳۰ سطروں میں اس کا حال تحریر کیا ہے۔ عارف کے سلسلہ میں جستہ جستہ انتخابِ حالات پیش کرتا ہوں: ''...ایامِ صبا سے شوقِ اکتسابِ فنون و اصنافِ سخن کا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ ہر کلام میں ساحری کرتے ہیں۔ ابتداء میں شعر وسخن کرتے تھے تو اصلاح شاہ نصیر سے لیتے تھے۔ لیکن بعد ایک مدت کے جب نواب اسد اللہ خاں بہادر واردِ شہر ہذا ہوئے، نسبتِ تلمذ بھی ان سے حاصل کی اور طرز وطرح اوّل کو طرح دی... حالت آمدِ مضامین کی یہ ہے کہ کوئی شاذ و نادر غزل ایسی ہوگی جو ۳۲ شعر سے کم ہو، ورنہ ۴۰، ۵۰ شعر سے کم نہیں کہتے...''

حافظ عبدالرحمٰن احسان کے متعلق لکھتے ہیں: ''... یہ صاحب پرانے استادوں میں سے ہیں، مگر جگت استاد ہیں یعنی وقت حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی سے آج تک قلم اصلاح ان کا جاری ہے اور اس شہر میں اکثر بادشاہ زادے اور اکثر صاحبانِ ذوق دمِ شاگردی ان کا بھرتے ہیں... باوجودیکہ عمر ان کی قریب طبعی کے پہنچ چکی ہے، یہ تیزی حواس اور ذہن کی ہے کہ اب تک اصلاح اشعار بھی دیے جاتے ہیں اور بعضوں

کو کتب فارسی بھی پڑھاتے ہیں اور ہر لفظ کی تحقیق خوب کرتے ہیں مگر تجنیس اکثر برتتے ہیں۔ اکثر اشعار سے ان کے واضح ہوتا ہے کہ تجنیس کی جمیع اقسام کو استعمال میں لاتے ہیں۔ دیوان ان کا دیکھنے میں آیا..." حکیم مومن خاں مومن کے حال میں لکھتے ہیں: "...المختصر موصوف بجمیع صفاتِ کمال اور قادر بر تمام فنون حکمتہ۔ نام ان کا حکیم محمد مومن خان سلمہ اللہ تعالیٰ۔ قلم میں یہ طاقت کہاں کہ ایک شمہ شمایل شاعر موصوف کا لکھ سکے۔ ناچار تمام اوصاف اس شاعر بے بدل جامع جمیع کمال فضل ذہن مہتم نارسائی کا کر کے قلم بند کیے جاتے ہیں..."۔ ذوق کے متعلق لکھتے ہیں: "... یہ شاعر فی زمانہ جو ۱۲۶۱ھ ہے بڑے رتبہ کا جلیل الشان شاعر ہے۔ اکثر اشعار اس شاعر بے نظیر کے دیکھنے میں آئے مگر کوئی شعر ایسا نہ تھا کہ اس کا مضمون تازہ اور دلچسپ نہ ہو... اب اس زمانہ میں خصوصاً دہلی میں کوئی ان کے مقابلہ کا نہیں... تیس برس کے عرصہ سے ملازم درگاہ حالت ولیعہدی سے شہنشاہ حال دہلی کے ہیں اور فنِ شعر میں بھی ابتدائے عمر سے مصروف ہیں۔ مگر حالتِ صبا سے آج تک یہ عادت طبیعت متمکن ہوگئی ہے کہ جو شعر کہتے ہیں، کسی کو نہیں دیتے۔ لہٰذا یہ چند اشعار جو ایک بیاض میں لکھے تھے، بطریق یادگار لکھے جاتے ہیں۔" اسد اللہ خاں غالب کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے: "...صاحبِ دیوان و تصانیف ہیں مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اُردو کا ترک کیا، مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جز کے تصانیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا۔ (یہ دیوان غالب اُردو کا پہلا ایڈیشن ہے جو ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۷ء ہوا، اس لیے یہ دوسرا ایڈیشن نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ تذکرہ ۱۸۴۵ء میں لکھا گیا ہے)۔ اسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستۂ ہذا کیے گئے۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالتِ صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص رکھتے ہیں، چنانچہ ایک دیوان ۴۰ جز کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالب

طبع میں آ چکا ہے، اس لیے اب فکر اشعار اُردو کا نہیں کرتے۔'' نگہت کے لیے لکھا ہے:

''میاں نیاز علی بیگ نگہت باشندۂ خاص شاہجہاں آباد کے صاحبِ فکر اور ذہین ہیں۔ شعر خوب اور مرغوب باندھتے ہیں۔ ان دنوں ایک کتاب اُردو مصطلحات کی لکھی ہے۔ حق یہ ہے کہ خوب لکھی اور سند میں اس کی اشعار اساتذہ ڈھونڈ کر لانا بڑا کام۔ لیکن اُنھوں نے اپنے اوپر یہ محنت گوارا کر کے سب اصطلاحوں کی مثالیں لکھیں۔ صاحبِ دیوان ہیں، چند اشعار جو اُنھوں نے انتخاب کر کے دیئے تھے، لکھے گئے۔''

شعراء کے بعد دس شاعرات کے حالات اور کلام کا نمونہ موجود ہے۔ اس زمانہ تک شعراء کے تذکرہ میں شاعرات کا ذکر کم ہوتا تھا۔ لیکن مولوی کریم الدین نے اس تذکرہ میں اس صنف کو معقول جگہ دی اور دس شاعرات کا کلام معہ حالات قلمبند کیا۔ آغاز دلہن بیگم سے ہے، جو زوجۂ خاصہ نواب آصف الدولہ بہادر تھیں۔ مولوی کریم الدین نے ان کے دو شعر لکھے ہیں جن کی شانِ نزول یہ ہے: ''... یہ دو شعر اسی جناب عفت مآب کے ہیں جو اپنے خاوند کے دِو شعر کے جواب میں کہے ہیں، ان کے خاوند کے دو شعر یہ ہیں:

ساقیا مے سے چھکا دے کہ بہکتے جاویں
برق کی طرح جدھر جاویں مہکتے جاویں
جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے
عمارت بناتے چلے جایئے

اس شاعرہ نے یہ دو شعر ان متذکرہ بالا شعروں کے جواب میں کہے:

اتنے کم ظرف نہیں ہم جو بہکتے جاویں
مثل گل جاویں جدھر سے بھی مہکتے جاویں

مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیرِ فلک
خانۂ دل جو گرا ہو اسے تعمیر کرو

اس کے بعد جینا بیگم محل خاص شاہزادہ مرزا جہاں دار شاہ اور ان کے بعد بیگم جان جانی دختر نواب قمرالدین خاں کا تذکرہ ہے۔ بعدہٗ گنا بیگم محل خاص عمادالملک غازی الدین خاں بہادر کا ذکر ہے۔ مولوی کریم الدین کا بیان ہے کہ گنا بیگم اکثر اصلاحِ اشعار محمد میر سوز اور کبھی کبھی مرزا محمد رفیع سودا سے بوساطت ملازمین لیتی تھی۔ اس کے بعد زینت کا ذکر کر کے صاحب جی کو چھیڑتے ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں: ''صاحب تخلص، نام اس کا امتہ الفاطمہ بیگم، مشہور صاحب جی، شوخ مزاج، آفتاب صفت، بتقریب مداوا حکیم محمد مومن خان سے اتفاق ملاقات کا اس کی ہوا۔ چند مہینے ملاقات اس سے رہی۔ کئی برس گزرے کہ لکھنؤ کو چلی گئی۔ مثنوی جس کا نام قول غمیں ہے، خان معزی الیہ نے اسی محبوبہ کے حق میں کہی ہے۔ القصہ فیض صحبت سے ان کی طبیعت اس کی مائل بہ شعر و سخن ہو گئی تھی اور شعر کہنے لگی تھی ...'' صاحب جی محبوبۂ مومن کے بعد نزاکت معشوقۂ شیفتہ کا ذکر آتا ہے، لیکن مولوی کریم الدین صاحب شیفتہ سے اس کی وابستگی کو صاف بچا جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ''نزاکت تخلص، مہ جمال، مہر تمثال، نادر الحسن، بدیع الجمال، جاں نواز، دل آرام، رجو نام۔ اصل اس کی بلدۂ نارنول ہے۔ بچپن سے جلوہ فرمائے شاہجہاں آباد اور رونق افزا اس شہر فرخندہ بنیاد کی ہے۔ عجب معشوق ہے شیریں اور دلبر ہے نمکیں، طبع لطیف اس کی بمقتضائے فطرت اور حدتِ ذہن کی کسبِ فنِ کمال کو مائل اور بحسبِ سرشت اور جبلت کے اوضاع ناپسندیدہ سے متنفر''۔ اس کے بعد دلبر کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ''دلبر تخلص ایک معشوقۂ جاں نواز، سراپا ناز، مسیح دم، خورشید رو، ماہ طلعت، سیمیں بدن، بلوریں ذقن، نازک اندام، خوش خرام، زیبا کلام، چھوٹی بیگم کا نام ہے۔ قلم میں یہ طاقت کہاں جو ایک شمہ حسن و

[حا]ل اور فصاحت قیل و قال دلبر مذکور سے لکھے... طرفہ تر یہ کہ اپنی جان پر سخت [ج]اشیدگیٔ افکار اختیار کی اور چند روز میں اشعار مثل جواہر آبدار صدف ذہن رسا سے [خ]ارج کرنے شروع کیے اور تصحیح و تحقیق الفاظ فارسیہ اور عربیہ ہمدموں اور مصاحبوں اپنوں [س]ے کر کے چکنے چکنے الفاظ اور محاورات دلچسپ برتنے شروع کیے...''

دلبر کے بعد جان کے لیے مولوی صاحب لکھتے ہیں: ''جان تخلص، عشیقۂ [ج]اں نواز، رقص ساز، خورشید تمثال، خوب رو، خوش کلام، حسن التیام، صاحبِ جاں کا []ہے۔ یہ معشوقہ اصل باشندہ فرخ آباد نیک بنیاد کی ہے۔ ایامِ صبا سے شوقِ حفظ اشعار [ا]ساتذہ رکھتی ہے، بلکہ طبیعت اس معشوقہ کی اکثر مائل بہ صحبت و ہمدمی اہل نوشت وخواند [ا]ور اہلِ سلیقہ سے رہتی ہے... یہ چند اشعار اس سے جو حسبِ حال اسی معشوقہ کے ہیں، [م]عرضِ تحریر میں آئے۔''

شاعرات کے تذکرہ میں آخری ذکر ماہ کا ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمایئے:

''ماہ تخلص، ماہ وش، حُور منش، معشوقۂ شہر آشوب، رشک افزائے لعبت چین، [ح]ور تمثال، ماہِ کمال، ابرو ہلال، یوسف جمال، زلیخا خصال، چمن حسن میں نو نہال، کج [ا]دائی اس کی عشاق کے حق میں قہر ذوالجلال، خندہ پیشانی، چہرہ نورانی، اٹھتی جوانی۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں اُمنگوں کے دِن

منجھلی بیگم کا نام ہے۔ فکر رسا، ذہن سلیم، خیال گرہ کشا، عقل فہیم رکھتی ہے...''

شاعرات کا تذکرہ تمام کرنے کے بعد چرکین کے ذکر پر کتاب تمام ہوئی ہے: ''چرکین تخلص، ہر چند کہ اشعار اس کے محتوی، فحش اور واہیات پر ہوتے ہیں... واسطے نزہت، طرب اور خندیدگی لاحظین گلدستۂ ہذا کے مقامِ مناسب یعنی اخیر کتاب [م]یں لکھے جاتے ہیں...'' چرکین کے اشعار کے بعد تذکرہ ختم ہو جاتا ہے۔

تاریخ اختتام طبع از نتائج افکار حضرت حکیم محمد مومن خان سلمہ الرحمٰن المتخلص بہ مومن ۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ مومن خان کا قطعۂ تاریخ ہے، اس کے تبرکاً دو تین شعر نقل کر رہا ہوں:

اس نے کہ جس کا نام بھی اور ذات بھی کریم
تالیف اک بیاض معانی نثار کی
دیکھے جو اس کتاب میں الفاظ گرم گرم
شمع زباں دراز سے چپ اختیار کی
اشعار عیشِ وصل کے جب آئے ہیں نظر
حالت بدل گئی ہے دلِ بیقرار کی
ارتنگ نقش علم سنی ہے سروش سے
تاریخ اس صحیفۂ معجز نگار کی

اس کے بعد ایک اور قطعۂ تاریخ فارسی زبان میں مومن کا ہی ہے۔ بعد میں تاریخ از نتائج افکار نواب زین العابدین خان عارف ہے۔

چوں بزرگے کہ مسمّی بہ کریم الدین است
ایں چنیں تذکرۂ نغز و دل آویز نوشت
گفت عارف کہ ہمیں سال سخن سنجی او
کہ زہے گوئی و گوئی کہ شود رشک بہشت

اس کے بعد ایک اور قطعۂ عارف ہی کا اُردو زبان میں ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے:

یہی مصرع رہے تاریخ اتمام
کہو گلدستۂ گلزار جنت

ن کے بعد مرقومۃ الذیل الفاظ پر تذکرہ کا خاتمہ ہے:

''تمام ہوا ''گلدستۂ نازنیناں'' بتاریخ بیست و سیوم ماہ رجب المرجب ۱۲۶۱

ہجری مطابق بیست و نہم شہر جولائی ۱۸۴۵ عیسوی کو تالیفات مولوی کریم الدین صاحب

سے۔''

[اورئینٹل کالج، میگزین، نومبر ۱۹۵۵ء]

خلیل الرحمٰن داؤدی

دیوانِ غالب اُردو

(ایک نادر مخطوطہ)

اس مضمون میں غالب کے اُردو دیوان کی اولین اشاعتوں کے متعلق کام کرنے والوں کے بیانات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

غالب کے اُردو دیوان کی اوّلین اشاعت اکتوبر ۱۸۴۱ء کو ''مطبع سیّد الاخبار'' دہلی سے ہوئی تھی اور دوسری ''مطبع دارالاسلام'' حوض قاضی دہلی سے مئی ۱۸۴۷ء میں۔ ان کے علاوہ حال ہی میں ان کا ایک مخطوطہ بھی دستیاب ہوا ہے جس کی تاریخ کتابت ۱۸۴۵ء ہے اور جس سے قیاساً دیوان کی کوئی ترتیب اس دوران میں بھی ہوئی ہے۔ ہم ان سب پر فرداً فرداً نظر ڈال کر دیکھتے ہیں کہ کلامِ غالب کی اشاعت کے سلسلہ میں یہ مخطوطہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔

اشاعتِ اوّل کے متعلق مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب ''غالب'' میں فرماتے ہیں:

''دیوانِ اُردو پہلی بار ۱۲۵۴ھ (۴۳-۱۸۴۲ء) میں چھپا۔ جس کے آخر میں، میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ تھی۔ اس دیوان میں کل ۱۰۷۲ شعر تھے۔ دوسرا

یشن ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء میں چھپا۔ اس نسخے میں ۱۷۹۳ اشعر تھے۔ اس کی ترتیب کلیاتِ ارسی کی موجودہ ترتیب سے مشابہ تھی۔ یعنی ابتداء میں قطعات، پھر مثنوی، پھر قصائد، بعد میں غزلیں اور آخر میں رباعیات۔'' (اقتباس از 'غالب' مولانا غلام رسول مہر، طبع چہارم، صفحہ ۳۸۶)

یہ تفصیلات صحیح نہیں، کیونکہ غالب کا دیوانِ اُردو پہلی بار ۱۲۵۴ھ میں نہیں بلکہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) میں چھپا۔ نیز ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء کے مطابق ہے۔ نہ کہ ۴۳-۱۸۴۲ء کے دوسرے یہ کہ دیوان میں تعداد اشعار ۱۰۹۸ ہے، ۱۰۷۲ نہیں۔ تیسرے یہ کہ دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) کی بجائے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں چھپا تھا۔ اور ان میں اشعار ۱۱۱۱ تھے نہ کہ ۱۷۹۳۔ درحقیقت ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں دیوانِ غالب کا کوئی ایڈیشن ہی شائع نہیں ہوا۔ اصل یہ ہے کہ مولانا غلام رسول مہر نے یہ معلومات اس وقت بہم پہنچائی تھیں جب کہ غالب کے متعلق زیادہ کام نہیں ہوا تھا اور اب اس کا سلسلہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔

ڈاکٹر زور نے ''روحِ غالب'' میں مولانا مہر ہی کے بیانات نقل کر دیے ہیں اور صرف ایک بات اِضافہ کی ہے کہ پہلا ایڈیشن ''فخر المطابع'' سے شائع ہوا تھا۔ معلوم نہیں آپ نے وہ ایڈیشن کہاں دیکھا۔ علاوہ بریں آپ نے ۱۲۵۴ھ اور ۱۸۴۲ء کی عدم مطابقت پر غور نہیں کیا۔ درحقیقت پہلا ایڈیشن فخر المطابع، دہلی سے نہیں بلکہ مطبع سیّد الاخبار دہلی سے ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ زور صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کے ۱۵ سال بعد ۱۲۷۱ھ میں شائع ہوا۔ حالانکہ ۱۲۵۴ھ سے ۱۲۷۱ھ تک ۱۷ سال بنتے ہیں۔ دوسرا ایڈیشن ۱۲۷۱ھ کی بجائے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں شائع ہوا تھا۔

آفاق دہلوی صاحب نے ''نادراتِ غالب'' میں زور ہی کی عبارت کو اپنا لیا

ہے۔ اسی لیے اُنھوں نے پہلے ایڈیشن کی طباعت ''فخر المطابع'' دہلی میں ظاہر کی ہے اور تاریخ ۱۲۵۴ھ کی بجائے ۱۲۴۵ھ بنا دی ہے۔ نبی بخش کے ایک خط مرقومہ اکتوبر ۱۸۵۵ء میں دیوانِ غالب اُردو کے ختم ہو جانے کا ذکر ہے۔ مصنف نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دیوان اس خط کی تحریر سے چند روز پیشتر ہی چھپا تھا اور فوراً ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ نبی بخش کو نہ بھیج سکے تھے۔ یہ استخراجِ نتائج اچنبھے سے خالی نہیں۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ''ماہِ نو'' بابت جولائی ۵۴ء میں اُردو دیوانِ غالب کے ایک نادر نسخہ پر جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں نیا داخل ہوا ہے، ایک مبسوط مضمون تحریر فرمایا تھا۔ اس میں اُنھوں نے ایک جگہ تو اشعار کی تعداد بظاہر مولانا امتیاز علی عرشی کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر ۱۰۹۰ سے کچھ زیادہ بیان کی ہے اور دوسری جگہ ۱۰۷۰۔ اسی طرح اُنھوں نے دوسرے ایڈیشن کے اشعار کی تعداد ایک جگہ ۱۱۰۰ لکھی ہے اور دوسری جگہ ۱۷۹۳۔ علاوہ بریں انھوں نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ رامپور والا نسخہ جس میں ۱۶۹۰ اشعار ہیں، طبع ثانی کے نسخہ سے اقدم ہے کیونکہ طبع ثانی کے نسخہ میں ۱۷۹۳ اشعار ہیں۔ رامپور والے نسخے کے متعلق سیّد صاحب نے دیباچہ نظامی میں اس کے ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے جس کا سن ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء ہے۔ ان امور کی صحت سے انکار نہیں۔ سوال صرف اتنا ہے کہ رامپور کا نسخہ طبع ثانی پر کیونکر اقدم ہے۔ مضمون نگار کے استدلال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طبع ثانی نسخۂ رامپور (۱۲۷۱ھ) سے بعد ہوئی، جو صحیح نہیں، کیونکہ اس کا سنِ طباعت ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) تھا۔ جیسا کہ اس نے خود اسی مضمون میں عرشی کے حوالے سے لکھا ہے۔ دراصل اس کی یہ عبارت ہی محلِ نظر ہے کہ:

> ''دیوانِ اُردو طبع اوّل کی تقریظ میں تعداد اشعار ۱۰۷۳ اور طبع ثانی میں ۱۷۹۳ء ہے۔''

کیونکہ طبعِ اوّل کی تقریظ میں اشعار ۱۰۹۰ سے کچھ زیادہ درج ہیں اور طبعِ ثانی

کی تقریظ میں ۱۱۰۰ بیان کیے گئے ہیں اور خود دیوان میں ۱۱۱۱ ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنے مضمون ''غالب کے اُردو کلام کی اشاعت'' (مطبوعہ ''ماہِ نو'' فروری ۵۴ء) میں طبع ثانی کی تعداد اشعار ۱۱۵۹ بیان کی ہے۔ اور امتیاز علی عرشی نے ۱۱۰۰ (''ماہِ نو'' جولائی ۵۴ء)۔ مسٹر مالک رام نے ''ذکرِ غالب'' کی تیسری اشاعت (مطبوعہ دہلی ۱۹۵۵ء) میں غالب سے متعلق تمام تحقیقات کو سمو دیا ہے۔ بعد کو اُنھوں نے ۱۹۵۷ء میں غالب کا اُردو دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ ''آزاد کتاب گھر، دہلی'' سے شائع کیا اور اس کے مقدمہ میں دیوانِ غالب کی مختلف اشاعتوں کے متعلق تفصیلات بہم پہنچائیں۔ ان سے بھی بعض امور میں سہو ہوا ہے۔ چنانچہ پہلی کتاب میں وہ اشاعتِ اوّل کو ''۱۵ سطری مسطر پر'' اور دوسری میں ''۱۳ سطری مسطر پر'' لکھی ہوئی بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک میں تعداد اشعار ۱۰۷۰ بیان کی گئی ہے تو دوسری میں، تقریظ میں ۱۰۹۸ اور دیوان میں ۱۰۹۵۔ دوسرے ایڈیشن کی تعداد اشعار ''ذکرِ غالب'' میں ۱۱۵۹ ہے تو مقدمہ میں ۱۱۱۱ یعنی طبعِ اوّل سے ۱۶ زیادہ۔

دیوان کی اوّلین دو اشاعتوں کی اہم تفصیلات یہ ہیں:

(۱) اشاعتِ اوّل: اکتوبر ۱۸۴۱ء، مطبع سیّد الاخبار دہلی۔ تقریظ کا سن ۱۲۵۴ھ، تعداد اشعار ''ہزار ونودواند'' یعنی ۱۰۹۰ سے اوپر۔ گو مالک رام نے ''اند'' کے ہوتے ہوئے بھی ''ہشت'' کو بڑھا دیا ہے۔ یعنی ۱۰۹۸۔ لیکن صحیح تعداد ۱۰۹۵ ہے کیونکہ کلکتہ والے قطعے کے آخری تین شعر غزلیات میں بالتکرار درج ہیں۔ اس دیوان میں دو قصیدے ۳ قطعات اور دس رباعیاں ہیں۔

(۲) اشاعتِ ثانی: مئی ۱۸۴۷ء۔ مطبع دارالسلام، دہلی، تقریظ کا سن ۱۲۵۴ھ۔ تعداد اشعار ۱۱۰۰۔ اگرچہ دیوان میں اشعار کی صحیح تعداد ۱۱۱۱ ہے۔ یعنی طبعِ اوّل سے ۱۶ زیادہ۔ ایک تو وہی بیسنی روٹی والا قطعہ جس کے ۳ شعر ہیں۔ دوسری ''جاں کے لیے'' والی غزل

جس کے ۱۴ شعر ہیں۔

اب اس تیسرے نسخے کی طرف آیئے جس کا ہم نے شروع ہی میں ذکر کیا ہے۔ اس کے اہم خصائص حسب ذیل ہیں۔

صفحات: ۱۲۸، تقطیع ۵ء۷" x ۵ "، سطور: ۱۱، نستعلیق، خوشخط، سنِ کتابت: ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء)، تعداد اشعار: ۱۱۰۷، تقریظ میں ۱۱۰۰ سے کچھ اوپر، غزلیات ۱۰۰۷، قصائد ۲ (۱۶۱ اشعار)، قطعات ۳ (۱۹ اشعار)، رباعیات ۱۰ (۲۰ اشعار)، صفحۂ اوّل یعنی سرورق پر مولوی کریم الدین پانی پتی کی دستخطی تحریر ہے۔ ''مالک ایں کریم الدین سرشتہ دار محکمہ ڈائریکٹری پنجاب۔'' صفحہ ۲ سے غالب کا دیباچہ ہے یعنی ''مشام شمیم آشنایاں را صلا...'' آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کی تقریظ ہے جس کا سن ۱۲۵۴ھ ہے، اور تعدادِ اشعار ''یکہزار و یکصد داند۔'' تقریظ کے خاتمہ پر کاتب کا ترقیمہ (ملاحظہ ہو، متعلقہ تصویری صفحہ) اشاعتِ اوّل کے برعکس مخطوطے میں قطعۂ کلکتہ والے تین اشعار مکرر درج نہیں۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ اشاعتِ اول ۱۸۴۱ء کے مطابق نہیں بلکہ اس کے بعد مرتب ہوا۔ دوسرے، اشاعتِ اوّل کی تقریظ میں تعداد اشعار ''یکہزار نود داند۔'' یعنی ۱۰۹۰ سے اوپر درج ہے لیکن اس مخطوطے کی تقریظ میں تعداد اشعار ''یکہزار و یکصد داند'' ہے۔

یہ مخطوطہ اشاعتِ ثانی سے بھی مختلف ہے کیونکہ اس میں ۱۱۰۷ اشعار ہیں اور اشاعتِ ثانی میں ۱۱۱۱۔ اشاعتِ ثانی کے مذکورہ بالا ۱۶ زائد اشعار مخطوطے میں موجود نہیں۔ اس لیے یہ اشاعتِ ثانی سے بھی مختلف ہے۔ مخطوطے کی تقریظ میں تعداد اشعار ۱۱۰۰ سے اوپر تحریر ہے اور اشاعتِ اوّل کی تقریظ میں ۱۰۹۰ اس لیے مخطوطے کی تقریظ ۱۸۴۱ء کے بعد مرتب ہوئی ہوگی۔ اشاعتِ ثانی کی تقریظ میں تعدادِ اشعار مخطوطے کے مطابق ہے، لیکن صحیح تعداد میں اختلاف ہے۔

اِن اُمور سے ظاہر ہے کہ مخطوطہ پہلے ایڈیشن کے بعد تیار کیا گیا کیونکہ اس کی تقریظ بھی بدلی گئی۔ اب تک تو ہمیں یہی معلوم تھا کہ ۱۸۴۱ء کے بعد ۱۸۴۷ء ہی میں تقریظ کی تعداد اشعار بدلی گئی تھی، لیکن اس مخطوطے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۷ء سے پیشتر ۱۸۴۵ء میں بھی تعداد اشعار ۱۰۹۰ سے اوپر کی بجائے ۱۱۰۰ سے اوپر لکھ دی گئی تھی۔ دونوں اشاعتوں کے درمیان ۱۸۴۵ء میں تقریظ کی تبدیلی صاحبِ دیوان کے ایما پر ہی ہوئی ہوگی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دہلی میں دیوانِ غالب کا ایک اور نسخہ ۱۸۴۵ء میں مرتب ہو رہا ہو اور غالب کو اس کا علم تک نہ ہو جب کہ تقریظ بھی بدلی جا رہی ہو۔ دوسرے اس مخطوطے کی کتابت مولوی کریم الدین پانی پتی کے لیے ہوئی جن کے پاس ۱۸۴۱ء کا مطبوعہ نسخہ ہونا یقینی ہے۔ پھر مطبوعہ نسخے کی موجودگی میں ایک اور نسخہ مرتب کرانا قابلِ غور ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، آج دیوانِ غالب اُردو کا کوئی ایسا مطبوعہ یا قلمی نسخہ موجود نہیں جو ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان مرتب ہوا ہو اور ان دونوں اشاعتوں سے مختلف ہو۔ موجودہ مخطوطے کی موجودگی سے یہ ثابت ہے کہ دیوانِ غالب ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان بھی ایک بار مرتب ہوا جس کی تقریظ بھی بدلی گئی اور اس مخطوطے کے علاوہ اس کی کوئی اور نقل بھی کہیں محفوظ نہیں اور نہ محققینِ کلامِ غالب کو اس کا علم ہے کہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان بھی کوئی نسخہ مرتب ہوا تھا۔ ممکن ہے ۱۸۴۵ء میں یہ نسخہ مرتب ہوا ہو اور ہمارا موجودہ مخطوطہ ہی وہ اصل نسخہ ہو۔

مولوی کریم الدین پانی پتی نے ۱۸۴۵ء کے قریب ہی اُردو شعراء کے تذکرے مرتب کیے تھے۔ پہلا ''گلدستۂ نازنیناں'' (اختتام تالیف، دسمبر ۱۸۴۴ء، اختتام طباعت جولائی ۱۸۴۵ء) اور دوسرا گارسن دتاسی سے ماخوذ ''طبقات الشعرائے ہند'' (تالیف ۱۸۴۷ء، طباعت ۱۸۴۸ء)۔ ان دونوں تذکروں میں مولوی کریم الدین نے غالب کے اُردو دیوان کا ذکر کیا ہے، جس کی نشان دہی سب سے پہلے شیخ محمد اکرام

صاحب مؤلف ''غالب نامہ'' نے کی تھی۔ اور مولوی کریم الدین کی شہادت کو دیوانِ غالب کی تاریخی ترتیب کے سلسلہ میں بطورِ اساس استعمال کیا تھا۔ موجودہ نسخہ خود مولوی کریم الدین نے تیار کرایا تھا جس سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔

[ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۹ء]

خلیل الرحمٰن داؤدی

۱۸۵۷ء سے قبل کی اُردو مطبوعات

عام خیال یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل اُردو مطبوعات کی تعداد بہت کم تھی۔ لے دے کے فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور دہلی کالج کی کتابیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ لیکن خود راقم الحروف کے پاس ۱۸۵۷ء، ۱۲۷۳ھ سے قبل کی مختلف مطبوعات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ جس کی فہرست کچھ یوں ہے:

(۱) سرور سلطانی: ترجمہ شمشیر خانی مصنفہ توکل بیگ (عہدِ شاہجہانی ۱۰۶۳ھ)۔ ترجمہ مرزا رجب علی بیگ سرور ترجمہ حسبِ ارشاد سلطان واجد علی شاہ فرماں روائے اودھ۔ سنہِ اتمام ترجمہ ۱۲۶۴ھ۔ مطبوعہ مطبع مسیحائی مسیح الزمان ۱۲۶۸ھ، ص ۲۰۴۔

(۲) فسانۂ عجائب: مصنفہ مرزا رجب علی بیگ سرور، مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں، ۱۲۶۱ھ، ص ۱۹۲، ناقص الآخر۔

(۳) فسانۂ عجائب: مصنفہ مرزا رجب علی بیگ سرور، مطبوعہ مطبع آئینہ ہند باہتمام شیخ مدد علی، ص ۱۶۶، ناقص الآخر۔

(۴) فسانۂ عجائب: مصنفہ مرزا رجب علی بیگ سرور، مطبوعہ محمدی حاجی حرمین شریفین محمد حسین خاتمۂ طبع از مصنف، ص ۱۳۶۔

(۵) گلِ بکاؤلی: اُردو ترجمہ از فارسی قصہ مصنفہ شیخ عزت اللہ بنگالی (۱۱۲۴ھ)

ترجمہ نہال چند لاہوری موسومہ مذہبِ عشق، ترجمہ حسبِ ارشاد ڈاکٹر گلکرائسٹ برائے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ یوح مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں ۱۲۶۸ھ۔ کتاب مطبوعہ درشہر کانپور بمحلہ فیلخانہ بازار در مطبع مسیحائی باہتمام مسیح الزمان ولد مولوی نور محمد اس نسخے میں یائے معروف و یائے مجہول بطور چھاپہ کلکتہ ہے، ص ۷۲

(۶) **باغ و بہار:** مؤلفہ میر امن دہلوی، سنہِ اتمام تالیف ۱۲۱۷ھ۔ ص ۱۶۸۔ اوّلین ایک ورق اور آخریں تین ورق قلمی ہیں۔

(۷) **اُردو:** ترجمہ گلستان سعدی شیرازی، مترجم نامعلوم الاسم۔ ناقص الطرفین۔ از ص ۴۱ تا ص ۶۰۴، قلم جلی۔ باب اوّل کا ترجمہ، ص ۵۴ سے شروع ہوتا ہے۔ آٹھواں باب در آدابِ صحبت و نصیحت ص ۵۶۹ سے شروع ہوتا ہے۔

(۸) **قصۂ گل وصنوبر:** ترجمہ از فارسی مترجمہ نیم چند کھتری، نستعلیق ٹائپ۔ عمدہ اور نفیس صفحات ۷ تا ۸، ۴۷ تا ۶۴، ۱۶۳ تا ۱۶۸ کم ہیں، پہلا ورق بھی نہیں ہے۔ ص ۱۰ پر خاتمہ تحریر ہے، لیکن وہ مکمل نہیں ہے۔ شاید ایک صفحہ اور کم ہے۔

(۹) **مثنوی ہشت گلزار:** مصنفہ شاہ حسین حقیقت۔ حقیقت نے امیر خسرو کی ہشت بہشت کو فارسی نثر کا جامہ پہنایا۔ اس کے بعد یہ اُردو نظم تصنیف کی۔ اتمامِ تصنیف ۱۱ر ربیع الاوّل ۱۲۲۵ھ۔ حقیقت جراُت کے شاگرد تھے اور اس مثنوی کے اتمام کے وقت جراُت (متوفیٰ ۱۲۲۵ھ) کا انتقال ہو چکا تھا۔ تعدادِ اشعار جو حقیقت نے آخر میں لکھے ہیں، ۴۷۶۵ ہیں۔ مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں لکھنؤ ۱۲۶۷ھ، ص ۱۰۸، مصور۔

(۱۰) **خزینۃ الامثال:** مصنفہ شاہ حسین حقیقت شاگرد جراُت، مطبع مصطفائی مصطفیٰ خان کانپور ۱۲۷۰ھ، ص ۲۲۴۔

(۱۱) صنمکدہ چین: مصنفہ شاہ حسین حقیقت شاگرد جرأت، سنہ تسوید ۱۲۰۹ھ، مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں ۱۲۶۹ھ، ص ۴۴۔

(۱۲) کلیاتِ جعفر زٹلی: مطبوعہ مطبع علی بخش خاں، لکھنؤ باہتمام کپتان مقبول الدولہ مرزا محمد مہدی علی خاں قبول، ص ۵۸۔

(۱۳) دیوانِ میر یار علی جان: آغاز ص ۵ سے ہے۔ اوّلین دو اوراق کم ہیں۔ ص ۵۸ پر اختتام ہے۔ قطعہ تاریخ از مصنف سے ۱۲۶۲ھ برآمد ہوتا ہے۔

(۱۴) گلزارِ نسیم: مصنفہ پنڈت دیاشنکر کول نسیم لکھنوی، مطبع حسین ولایت حسین ابنِ منشی حسین بخش باہتمام حاجی حرمین شریفین ولی محمد، لکھنؤ ۱۲۷۲ھ، ص ۳۴۔ دوسرا نسخہ ناقص الاوّل ہے۔ ص ۱۳ سے شروع ہوتا ہے۔ اور خاتمے تک مکمل ہے۔ یہ نسخہ بھی اسی اشاعت کا ہے۔

(۱۵) مثنوی گلزارِ نسیم: مصنفہ پنڈت دیاشنکر کول نسیم لکھنوی، مطبع نظامی کانپور، باہتمام محمد عبدالرحمٰن بن عاجز محمد روشن خاں۔ اتمام طباعت ۲۰؍ ربیع الاوّل ۱۲۷۲ھ، ص ۴۶۔

(۱۶) مثنوی خجستہ لقا: مصنف نامعلوم، حمد و نعت کے بعد نواب غوث خاں بہادر کی مدح کی ہے۔ مطبع مصطفائی باہتمام کپتان مقبول الدولہ، ص ۴۸۔ ناقص الآخر۔

(۱۷) مسدس کریما از نظیر اکبر آبادی: کاتب رنگین لال، مطبع مسیحائی کانپور، ص ۱۶۔

(۱۸) مسدس نظیر اکبر آبادی: مطبع آئینہ سکندر باہتمام شیخ مددعلی جعفر پاش مہربان علی و مرزا رمضان بیگ تاجرانِ کتب شہر میرٹھ، ص ۱۰ ناقص الآخر۔

(۱۹) قصۂ عاد اوّل و قصۂ عاد ثانی و رسالۂ جنادر درِ متن کتاب و برحاشیہ قصۂ شاہ روم و قصہ اصحابِ کہف: مطبوعہ مطبع مسیحائی کانپور، ۱۲۶۹ھ، ص ۲۲۔

(۲۰) داستانِ صادقان از کفایت علی کافی: مطبع مصطفائی محمد حسین خاں دہلی، ۱۲۷۱ھ کاتب محمد بشارت علی۔

(۲۱) مثنوی لیلیٰ مجنوں: مصنفہ نواب محمد تقی خاں ہوس لکھنوی، ناقص الطرفین، ص ۵ تا ص ۶۰ موجود ہے۔

(۲۲) بہارِ عشق: مصنفہ نواب مرزا خاں شوق لکھنوی مطبوعہ مطبع افضل المطابع محمدی لکھنؤ، ص ۱۸۔

(۲۳) شعلۂ حسن: مصنفہ میر تقی میر، مطبوعہ مطبع مصطفائی باہتمام عبدالواحد خاں ولد محمد مصطفیٰ خاں لکھنؤ، ۱۲۵۹ھ، ص ۱۶۔

(۲۴) دریائے عشق: مصنفہ میر تقی میر مطبوعہ مطبع مصطفائی، باہتمام عبدالواحد خاں ولد محمد مصطفیٰ خاں، لکھنؤ، ۱۲۵۹ھ، ص ۱۸

(۲۵) لیلیٰ مجنوں (مثنوی): مصنفہ محمد حسین تجلی خواہر زادہ میر تقی میر، اوّلین ایک ورق کم ہے، مطبع نامعلوم، ص ۸۴۔

(۲۶) گلشنِ عشق (مثنوی): مصنفہ امام مطبوعہ مطبع محبوبی، ص ۱۶، پشت کی جانب سے کرم خوردہ۔

(۲۷) قصۂ سپاہی زادہ: مصنفہ خوشدل کرتپوری (نظم) مطبوعہ فخر المطابع باہتمام

نیاز احمد کرانوی دہلی، ۱۲۶۸ھ، ص ۱۸۔

(۲۸) چراغ حقیقت و شمع معرفت در علم سلوک: تصنیف محمد خاں صاحب، ناظر ضلع لہیہ (نظم) مطبع اسعد الاخبار اکبر آباد، ۱۸۵۳ء، ص ۳۱۔

(۲۹) بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی و سمجھ بوجھ: (نظم) مطبع احمدی باہتمام شیخ ظفر علی دہلی، پشت کی طرف سے کرم خوردہ ہے، ص ۳۲۔

(۳۰) نوحۂ بسمل (نظم): مسدس مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں، لکھنؤ، ۱۲۶۷ھ، ص ۳۲۔

(۳۱) نوحۂ بسمل (نظم): مسدس مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں، لکھنؤ، ۱۲۶۷ھ، ص ۳۲۔

(۳۲) خلاصۃ الفقہ: مصنفہ حافظ مولانا شجاع الدین (نظم) مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں، ۱۲۶۳ھ، ص ۲۲۔

(۳۳) خلاصۂ ہندی: مصنفہ حافظ مولانا شجاع الدین، مطبع حیدری، بمبئی ۱۲۷۳ھ (نظم)، ص ۲۲۔

(۳۴) شریعت کا لٹھ: تصنیف مولوی محمد شمس الدین (نظم)، مطبوعہ مطبع مصطفائی دہلی، باہتمام محمد حسین خاں، ۱۲۷۳ھ، ص ۸۔

(۳۵) عشرت کدۂ ابراہیم: (نظم) مصنف نامعلوم مطبع احمدی باہتمام ظفر علی، ص ۴۲، دربیانِ حالات حضرت ابراہیم خلیل اللہ۔

(۳۶) بہار خلد: حامل المتن اُردو منظوم ترجمہ از کفایت علی کافی، مطبوعہ مطبع محمدی،

لکھنؤ، ۱۲۶۱ھ، ص ۱۶۴۔

(۳۷) تفسیر سورۂ یوسف: (منظوم) از حکیم محمد اشرف کاندھلوی، سنہِ اتمام تصنیف ۱۲۶۹ھ، مطبع محمدی بمبئی، ۱۲۶۹ھ، ص ۱۸۸۔ حضرت امام غزالیؒ نے حضرت عباس کی روایت سے بزبان عربی تفسیر سورۂ یوسف لکھی تھی۔ مترجم نے اسے اُردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔

(۳۸) دیوانِ خواجہ میر درد: مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد حسین خاں، دہلی ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء۔ آغاز میں ایک مبسوط دیباچہ از محمد حسین خاں تحسین مہتم مطبع ہے۔ کاتب محمد بشارت علی، ص ۴۸۔

(۳۹) کلیاتِ شیخ امام بخش ناسخ: مطبوعہ حسب الحکم مہر مطبع کثیر المنافع المسمّٰی بہ سلطان المطابع باہتمامِ مدد علی داروغہ مطبع سلطانی حسبِ فرمائش محمد مصطفیٰ خاں لکھنوی علی بخش خاں نے ۱۲۶۷ھ میں چھاپا۔ ص ۳۵۴

(۴۰) بہارستان سخن: کلام ہم طرحی آتش و آباد۔ اتمامِ تالیف ۱۲۶۳ھ، مطبع محمدی باہتمام مولوی عبداللہ پسر ولی محمد۔ بہ تصحیح مہدی حسین خان آباد۔ آخر میں آباد کا قطعۂ تاریخ الطباع ۱۲۶۳ھ ہے۔ ص ۲۵۶۔

(۴۱) دیوانِ فقیر محمد خان گویا: اوّلین ایک ورق کم ہے۔ تقطیع صغیر۔ ص ۳ سے ص ۲۳۶ تک ہے۔ ص ۲۲۶ پر خاتمہ الطبع ناتمام ہے۔ جتنا حصہ خاتمۃ الطبع کا موجود ہے، اس سے ظاہر ہے کہ گویا کے انتقال کے بعد یہ دیوان مکرر چھپا ہے۔ طباعت کا سنہ موجود نہیں ہے۔

(۴۲) دفترِ فصاحت یعنی کلیاتِ خواجہ محمد وزیر المتخلص بہ وزیر لکھنوی:

مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں، لکھنؤ، ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء، اشاعتِ اوّل۔

(۴۳) وفات نامہ: (نظم) مصنف نامعلوم، مطبع محبوبی، ص ۳۹۔

(۴۴) حارق الاشرار (خمسہ): مصنفہ مولوی فتح اللہ، شیخ الٰہی بخش سوداگر ولد حاجی عبدالوہاب انصاری دہلوی نے مطبع دارالسلام دہلی واقع حوض قاضی باہتمام نور الدین احمد لکھنوی، ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں چھپوایا، ص ۱۸۔

(۴۵) صد سی مسئلہ منظومہ: شیخ الٰہی بخش سوداگر ولد شیخ عبدالوہاب انصاری دہلوی نے مطبع دارالسلام دہلی میں باہتمام نور الدین احمد لکھنوی، ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں چھپوایا، ص ۸۔

(۴۶) تاریخِ جدولیہ: مصنفہ منشی خادم علی بن مولوی شیخ کرم علی فاروقی سندیلوی، تاریخ اتمام تصنیف ۱۲۶۹ھ مطبوعہ مطبع مدرسہ آگرہ، ۱۲۷۰-۷۲ھ، ناقص الطرفین ص ۲۴ تا ۵۵۳ موجود ہیں۔ اس کی تالیف کے زمانے میں بہادر شاہ ظفر، ذوق، شیفتہ، غالب، صہبائی، غلام امام شہید وغیرہ زندہ تھے۔

(۴۷) سلسلۃ الملوک: مؤلفہ سیّد احمد خاں منصف درجۂ اوّل، شاہجہان آباد، مطبوعہ مطبع شرف المطابع دہلی باہتمام خواجہ علی حسن، ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء، ص ۷۰۔

(۴۸) حدیقۂ شہداء: مصنفہ مرزا جان یکے از رفقائے مولوی امیر الدین علی۔ اس تالیف کا ماخذ مولوی امیر الدین علی کی تحریریں ہیں جو دورانِ جہاد اُنھوں نے مؤلف کو بھیجی تھیں۔ مولوی صاحب کی شہادت کے ساتھ ہی وہ تمام تحریریں مؤلف نے ترتیب دے کر حدیقۂ شہداء نام رکھ دیا۔ یہ ۱۲۷۲ھ کی تالیف ہے۔ اسی سن میں لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی، ص ۷۰۔

(۴۹) تواریخِ ہند: تالیف حسب الحکم مسٹر آرنلڈ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب، مطبع کوہ نور، لاہور، محلہ یکی دروازہ حویلی منشی ہرسکھ رائے پروپرائٹر میں باہتمام منشی نولکشور مینجر و غلام محمد پرنٹر و علی بخش پبلشر، سنہِ طباعت ۱۸۵۷ء، ص ۷۲۔

(۵۰) ہادی التواریخ: تالیف محمد ہمدانی، مطبع اُردو اخبار دہلی ۱۲۶۸ھ۔ ناقص الطرفین ص ۱۷ تا ص ۱۶۰ موجود ہے۔ اس کتاب کے متعلق مشہور ہے کہ یہ مولوی محمد باقر صاحب والد مولوی محمد حسین آزاد (مرحوم) کی تالیف ہے اور محمد ہمدانی فرضی نام ہے۔

(۵۱) طبِ نبوی: مطبوعہ مطبع مسیحائی مطابق نسخۂ مصطفائی باہتمام مولوی مسیح الزماں، ص ۵۲۔

(۵۲) معرکہ آراء: مصنفہ خواجہ احمد علی، تصنیف ۱۲۶۳ھ بعہد واجد علی شاہ، مطبع محمدی حاجی حرمین محمد حسین ۱۲۶۳ھ، کاتب سیّد طفیل احمد بگرامی، ص ۱۳۴۔

(۵۳) رسالہ تطعیم (ٹیکا لگانے کی کتاب): اصل عربی رسالہ مصنفہ احمد حسن رشیدی ترجمہ ڈاکٹر جاں مری، مطبوعہ چھاپہ خانہ صدر جیلخانہ باہتمام پنڈت کیسری داس جیلر مجلس آگرہ ۱۸۵۳ء، ص ۲۲۔

(۵۴) لوگارثم: مطبوعہ مطبع فخر المطابع دہلی باہتمام نیاز احمد، ص ۲۸۔

(۵۵) تحفۃ الاحباب: مؤلفہ منشی محمد ذکاء اللہ، منشی مدرسہ دہلی مطبوعہ بتصحیح و مقابلہ مؤلف کتاب سلمہ اللہ تعالیٰ مطبع مصطفائی محمد حسین خاں دہلی، ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء، کتابت شیخ محمد بشارت علی، ص ۳۶، یہ کتاب کسی دوسری کتاب کا ترجمہ نہیں ہے۔

(۵۶) تحریر اقلیدس: ترجمہ منشی محمد ذکاء اللہ منشی مدرسہ دہلی، اصل کتاب مؤلفہ شمس

سے ترجمہ کیا ہے۔ مطبوعہ مطبع العلوم باہتمام کریم بخش دہلی، ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء، کتابت سیّد غلام عباس، ص ۱۴۴۔

(۵۷) ماپ تول: مؤلفہ رائے رام سرنداس ڈپٹی کلکٹر دہلی، حسب الحکم جناب نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی، مطبوعہ مطبع کوہِ نور، باہتمام منشی ہرسکھ، ۱۸۵۱ء۔۔

(۵۸) پٹواری کی کتاب: مولفۂ رائے رام سرنداس ڈپٹی کلکٹر دہلی، حسب الحکم، نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی مطبوعہ بپٹسٹ مشن چھاپہ خانہ، کلکتہ، ۱۸۴۵ء

(۵۹) اُردو، ہندی، فارسی اور انگریزی فرہنگ: مرتبہ ایچ۔ ایس۔ ریڈ ڈائرکٹر جنرل آف پبلک انسٹرکشن ممالک شمالی و مغربی، معاونین منشی چرنجی لال و پنڈت بنسی دھر، مطبوعہ سکندرہ آرفن پریس، آگرہ، ۱۸۵۵ء، ص ۱۱۲

(۶۰) گلدستۂ معراج: ماخوذ از ۱۳۵ تفاسیر و دیگر کتب معتبرہ کہ نام ہر یک درمتن موجود، فراہم آوردہ مولوی عبدالرزاق کلیانوی، مطبوعہ فخر المطابع دہلی، باہتمام نیاز احمد، ۱۲۶۸ھ، مولوی عبدالرزاق ناہر خان مشہور محمد سپہدار خان چشتی النعمانی المتخلص بہ عشق، زمانۂ تصنیف ۱۲۶۶ھ، ص ۲۱۳ پر کتاب ختم ہو جاتی ہے اور قطعات تاریخ خاتمۂ کتاب شروع ہو جاتے ہیں۔ پہلا قطعہ میاں عبدالغنی خاں کا ہے۔ اس کے بعد امام بخش صہبائی، عبدالکریم خلف صہبائی، مولوی امین الدین دہلوی، محشی صحت نامہ عبداللہ خاں دہلوی، میاں جی مظفر علی راقم ہیں، ص ۲۱۷ پر قطعۂ تاریخ طبع ہے جو ص ۲۱۸ پر ختم ہوتا ہے اور سال ۱۲۶۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ تین صفحات کا ذیل الاغلاط ہے۔

(۶۱) پنج رسائل مشتملبر احکام الایمان، تنبیہہ بے نمازاں، موضح البدعات والکبائر، معاصیٔ کبیرہ منظوم، شرح عقد انامل: مطبوعہ مطبع

نظامی، کانپور، ۱۲۷۳ھ، پانچواں رسالہ ناقص الآخر ہے، ص ۲۴۔ احکام الایمان منظوم ہے اور مولانا عبدالواجد رامپوری کی تصنیف ہے۔ نسخۂ احکام الایمان در بیان عقائد مع منظوم ترجمۂ پنج کلمہ اور سیّد الاستغفار تصنیف مولانا عبدالواجد رامپوری، ص ۱۰ پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ رسالہ مصرعی ہے۔ تنبیہ بے نمازاں منظوم رسالہ ہے جو ص ۱۱ سے شروع ہوتا ہے اور ص ۱۶ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ رسالہ سہ مصرعی ہے۔ موضح الکبائر و البدعات والرسوم ص ۱۷ سے شروع ہوتا ہے اور ص ۲۰ پر خاتمہ ہے۔ یہ نثری رسالہ ہے۔ رسالۂ منظوم گناہ کبیرہ۔ یہ رسالہ دراصل مولانا رفیع الدین کے رسالہ راہِ نجات کا اُردو نظم میں ترجمہ ہے، جو عبدالرحیم آرندی نے کیا ہے۔ یہ صفحات ۲۱، ۲۲ پر ہے۔

شرح رسالۂ عقدانامل، نثری رسالہ ہے جسے عبدالرحمٰن شاکر نے تصنیف کیا ہے۔ یہ رسالہ ص ۲۳ سے شروع ہوتا ہے، ص ۲۴ تک ناتمام ہے۔

(۶۲) **محاسن العمل الافضل مع التتمات**: مصنفہ مفتی محمد عنایت احمد، مطبع نظامی کانپور باہتمام محمد عبدالرحمٰن ۱۲۷۲ھ، محاسن العمل کا سنہِ تالیف ۱۲۷۲ھ ہے، ص ۱۴ پر خاتمہ ہے، ص ۱۵ سے تتمات ہیں جو ۱۲۷۲ھ کی تالیف ہیں۔ ص ۳۴ پر خاتمۃ الطبع ہے۔ تاریخ اتمام طباعت ۲۷ر شعبان ۱۲۷۲ھ ہے، ص ۳۴۔

(۶۳) **الکلام المبین فی آیت رحمت للعلمین**: مصنفہ مفتی محمد عنایت احمد، سنہِ تصنیف ۱۲۶۹ھ، مطبع نظامی عبدالرحمٰن خاں کانپور، ۱۲۷۰ھ، ص ۱۷۲۔

(۶۴) **الدر الفرید فی مسایل الصیام والقیام العید**: مصنفہ مفتی محمد عنایت احمد، سنہِ تصنیف ۱۲۷۳ھ، مطبع نظامی باہتمام عبدالرحمٰن، کانپور، ۱۲۷۲ھ، ص ۱۲۔

(۶۵) **ضمان الفردوس**: مصنفہ مفتی محمد عنایت احمد، سنہِ تصنیف ۱۲۷۲ھ، مطبع نظامی، باہتمام عبدالرحمٰن کانپور، ۱۲۷۳ھ، ص ۴۴۔

(٦٦) فضائل درود و سلام: مصنفہ مفتی محمد عنایت احمد، مطبع نظامی کانپور باہتمام عبدالرحمٰن، ۱۲۷۳ھ، ص ۱۸۔

(٦٧) تقویٰ: مصنفہ مولوی سخاوت علی جونپوری، مطبوعہ مطبع مطیع الرحمٰن، محلّہ مٹیا محل، تاریخِ طباعت ۲/رجب ۱۲۶۸ھ، ص ۲۰۔

(٦٨) تقویٰ: مصنفہ مولوی سخاوت علی جونپوری، مطبوعہ مطبع عزیزی محمدی محمد نجف خاں صاحب در شہر اعظم گڑھ محلّہ پہار پور مکان محمد علی خاں صاحب، تحصیلدار کویلسہ بکتابت غلام علی سرایمیری باہتمام مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب حافظ آبادی معروف پیلی پھبتی تاریخ اتمام طباعت ۱۱/ذی الحجہ ۱۲۶۹ھ، ص ۴۰۔

(٦٩) خلاصۃ الفقہ: (اُردو نظم) مصنفہ شجاع الدین حافظ، اتمام طباعت ۲۰/ربیع الآخر ۱۲۶۷ھ، مطبع مصطفائی لکھنؤ، ص ۱۰، احکام الایمان (اُردو نظم) در عقاید مع ترجمۂ پنج کلمہ و استغفار مصنفہ مولانا عبدالواحد رامپوری، مطبع مصطفائی، لکھنؤ، ۱۲۶۷ھ، ص ۱۱ تا ۱۶۔

مسائل ثمانیہ: (اُردو نظم) مصنفہ محمد یعقوب علی محمدی متوطن موضع نیلاہہ ضلع میرٹھ، تصنیف ۱۲۶۶ھ، مطبع مصطفائی، لکھنؤ ۱۲۶۷ھ، ص ۱۷ تا ۲۱۔ صفحہ ۲۱، ۲۲ پر خاتمۂ کتاب ہے۔ کل صفحات ۲۲۔

(٧٠) راہِ نجات: (اُردو نثر) مصنفہ مولانا رفیع الدین دہلوی، مطبع مصطفائی باہتمام محمد مصطفیٰ خاں اتمامِ طباعت ۱۵/شوال ۱۲۶۶ھ، ص ۲۴۔

(٧١) مختصر وافی الہدایہ ماحی الضلالۃ: مؤلفہ شیخ امداد شاگرد مولوی محمد باقر در بیانِ تکذیب و فرار شیخ حیدر علی صاحب منتہی الکلام کے مباہلہ سے، بفرمائش مولوی سیّد

رجب علی خاں بہادر مکرر باضافہ تفصیل ضروری و تصریح ظہور زیب شیخ جیو در باب مواہیر وغیرہ۔ مطبع الہدایہ نور مشرقی میں، ربیع الثانی ۱۲۷۲ھ میں چھپا، ص ۴۸۔

(۷۲) رسالہ: مؤلفہ مولوی انوار الحق صاحب شاگرد، مولوی حیدر علی در بیان تکذیب اس خبر کی کہ پرچہ اخبار نور مشرقی میں مندرج تھی، یعنی انکار کرنا مولوی صاب ممدوح کا مباہلہ سے۔ مطبع مرتضوی میں باہتمام حافظ غیاث الدین شوال ۱۲۷۱ھ میں چھپا، ص ۲۴۔

(۷۳) رسالہ: مؤلفہ شیخ امداد، مطبوعہ مطبع الہدایہ نور مشرقی، صفحات ۸۔

(۷۴) مفتاح الجنّۃ: مؤلفہ مولوی کرامت علی جونپوری، تالیف ۱۲۴۳ھ، مطبوعہ بارِ سوم باضافہ مضامین وصحت مکرر۔ طباعت ۱۲۶۷ھ یہ اشاعت بھی مؤلف علوم کی تصحیح و اہتمام کے ساتھ ہوئی ہے۔ نستعلیق ٹائپ؛ ناقص الاوّل، ص ۱۹ تا ص ۱۸۰ موجود۔

(۷۵) مسائل ثلثین: مؤلفہ محمد یوسف، مطبع مصطفائی، دہلی، اتمامِ طباعت ۱۲/صفر ۱۲۷۰ھ، ص ۱۸۔

(۷۶) بہشت نامہ: مؤلف مولوی فیاض الحق، سنِ تالیف ۱۲۶۵ھ، مطبوعہ مطبع مسیحائی باہتمام مولوی مسیح الزمان ولد مولوی نور محمد مرحوم، ص ۲۲۔

(۷۷) جامع السعادات: ترجمہ کتاب منبہات مصنفہ شیخ شہاب الدین مصری شافعی الموسوم بہ ابنِ حجر عسقلانی، مترجمہ مولوی سیّد صدیق حسن قنوجی۔ مترجم نے اس رسالے کا ترجمہ حسبِ فرمائش شیخ فقیر اللہ کیا تھا۔ مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد حسین خاں دہلی، ۱۲۷۰ھ، ص ۳۶۔

(۷۸) طریقۃ المسلمین فی ردِّ ہدایۃ للمؤمنین: مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۰ھ، ص ۸۹ پر

یہ کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ''نسخۂ مذاہب سنیہ فی رد مذہب وہابیہ'' ہے جو صفحہ ۱۰۴ پر ختم ہو جاتا ہے، مصنفین نامعلوم۔

(۷۹) مولود شریف: مصنفہ غلام امام شہید اکبر آبادی مطبوعہ مطبع سنگین درحیات مصنف، ص ۵٦۔

(۸۰) کتاب معدن الجواہر: مؤلف محمد قطب الدین ابنِ محی الدین خاں ابنِ شاہ حاجی، سنہِ تالیف ۱۲۵۸ھ، مطبوعہ مطبع احمدی واقع شاہدرہ، دہلی، باہتمام مرزا امو جان، ص ۸۸۔

(۸۱) رسالہ رد نصاریٰ: مطبوعہ ۲۰ رستمبر ۱۸۴۰ء، ص ٦۲۔

(۸۲) اُردو: ترجمہ زینت القاری از کرامت علی جونپوری۔ ترجمہ صفحہ ۱۷ پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد شرح زینت القاری ہے جو ص ۳۹ پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد زینت القاری کا عربی متن ۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ آغاز کے چار صفحات کم ہیں۔ موجودہ صورت میں ص ۵ تا ۳۹ اور ص ۱ تا ص ۷ ہیں، نستعلیق ٹائپ۔

(۸۳) ہدایت الاسلام: مؤلفہ مولوی امانت اللہ، برائے فورٹ ولیم کالج، نستعلیق ٹائپ، ص ۱۵۴۔

(۸۴) چہل حدیث حامل المتن اُردو ترجمہ: مطبع دارالسلام دہلی، باہتمام نور الدین احمد لکھنوی، ۱۲٦۳ھ / ۱۸۴۷ء برائے شیخ الٰہی بخش، سوداگر، ص ۸۔

(۸۵) پارۂ عم مع ترجمہ ہندی: محمد حسین بن محمد سلیم و عبدالملک ولد مولوی محمد صادق نے مولوی محمد عبدالحلیم کی فرمائش پر اپنے چھاپے خانے میں ۵ ر ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ کو بمبئی میں چھاپا۔ ص ۴۲ و تفسیر مقبول مشتمل بر اُردو تفسیر سورۂ یٰسین، سورۂ رحمٰن، سورۂ

واقعہ، سورۂ تبارک، سورۂ نوح، سورۂ عم، سورۂ مزمل اور سورۂ جن، مصنفہ مولوی حاجی سیّد عبداللہ ولد سیّد بہادر علی مرحوم حسب الامر مولوی محمد عبدالحلیم، محمد حسین بن محمد سلیم و عبدالملک ولد مولوی محمد صادق نے ۱۲۵۹ھ میں بمبئی میں چھاپا، ص ۱۲۶۔

(۸۶) اُردو ترجمہ حامل المتن فتاویٰ: مطبوعہ دہلی، ۱۲۶۲ھ کاتب عنایت علی دہلوی، ناقص الاوّل موجود ص ۱۱ تا ۱۶، ۲۵ تا ۱۴۰۔

(۸۷) نگارستانِ جوش یعنی دیوان: مصنفہ نواب احمد حسن خاں جوش ابن نواب محمد مقیم خان مقیم ابن نواب محبت خاں محبت ابن حافظ الملک نواب رحمت خاں روہیلہ، مطبوعہ علی بخش خاں، لکھنؤ ۱۲۶۹ھ، ص ۱۶۔

(۸۸) آثار محشر: (نظم) مصنفہ محمد علی محمد، مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں لکھنؤ، ۱۲۶۵ھ، یہ کتاب دراصل شاہ رفیع الدینؒ دہلوی کے قیامت نامہ (فارسی نثر) کا اُردو منظوم ترجمہ ہے۔ کچھ مطالب زیادہ ہیں اور کتاب بجائے ترجمے کے تصنیف معلوم ہوتی ہے، ص ۶۰۔

(۸۹) مثنوی بدر منیر مع تصاویر: مصنفہ میر حسن دہلوی، مطبع افضل المطابع باہتمام الٰہی بخش، ص ۶۲، ناقص الآخر۔

(۹۰) مثنوی سحر البیان: مصنفہ میر حسن مرحوم، مطبع نظامی کانپور کے مطابق مطبع مسیحائی شاہدرہ دہلی میں باہتمام محمد عبدالرحمٰن عرف رحمٰن بخش چھپا۔ سنہِ طباعت ندارد۔ ص ۴۶، قدرے ناقص الآخر۔

(۹۱) فراست نامہ: معروف بہ فرس نامہ از سعادت یار خاں رنگین: مطبع مسیحائی مولوی مسیح الزمان کانپور، کاتب رنگے لال، ص ۲۶۔

(۹۲) دریائے لطافت از سیّد انشاء اللہ خاں و قتیل: مطبع آفتاب عالمتاب مرشد آباد، ۱۸۵۰ء/ ۱۲۶۶ھ، باہتمام احمد علی گوپاموی، نستعلیق ٹائپ، ص ۴۷۶۔

(۹۳) کلیاتِ سیّد انشاء اللہ خاں انشاء: تقطیع کلاں، حوض و حاشیہ بر متن، صفحات ۲۴۰، مطبوعہ مطبع اُردو اخبار باہتمام محمد حسین دہلی، ۱۸۵۵ء/ ۱۲۷۱ھ

(۹۴) دستور النصیحت: ۱۲۵۹ھ (تصنیف) اُردو مثنوی از احمد علی رسا۔ مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں کانپور، ۱۲۶۶ھ۔

مزید برآں تاریخ ادب کی مختلف کتابوں میں جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل اُردو مطبوعات کثرت سے موجود تھیں۔ مثلاً ''داستانِ تاریخِ اُردو'' میں حامد حسن قادری لکھتے ہیں:(۱)

''ان کتابوں کے چھاپنے کے لیے اُردو ٹائپ کا مطبع بھی قائم کر دیا۔ یہی ہندوستان میں سب سے بڑا چھاپہ خانہ تھا۔ اس وقت تمام ملک میں اُردو کی ایک کتاب نثر میں ایسی نہ تھی جس کو فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل کیا جاتا۔ مطبوعہ کتاب کا تو اس سے پہلے امکان ہی نہ تھا۔ قلمی کتابوں میں فضل کی وہ مجلس تھی، فورٹ ولیم کے چھاپے خانے کے بعد انگریز پادریوں نے سیرامپور میں مطبع قائم کیا۔ پادری مارٹن نے انجیل کے عہدِ جدید کا ترجمہ ۱۸۱۴ء میں یونانی سے اُردو زبان میں کیا۔ سیرامپور کے مشنریوں نے پوری بائبل کا ترجمہ پانچ جلدوں میں ۱۸۱۶ء سے ۱۸۱۹ء تک شائع کیا۔ لکھنؤ میں نواب غازی الدین حیدر (سال جلوس ۱۸۱۴ء/ ۱۲۲۹ھ) کے زمانے میں ٹائپ کا مطبع قائم ہوا۔ اس میں سب سے پہلی تصنیف ہفت قلزم (فارسی لغت) طبع ہوئی۔ لیتھو کا سنگی مطبع سب سے پہلے ۱۸۳۰ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر نے کانپور میں جاری کیا۔ ۱۸۳۵ء میں دہلی سنگی مطبع قائم ہوا اور ۱۸۳۶ء میں دہلی میں مولوی محمد باقر

(مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے والد) نے دہلی اُردو اخبار جاری کیا۔ یہ اُردو زبان کا دوسرا اخبار تھا۔ پہلا اُردو اخبار مولوی اکرام علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔ نواب نصیر الدین حمید (سالِ جلوس ۱۸۲۷ء/ ۱۲۴۳ھ) نے مسٹر آرچر کو کانپور سے بلا کر لکھنؤ میں سنگی مطبع قائم کیا جس میں سے پہلی کتاب شرح الفیہ چھپی ۱۸۳۷ء میں دہلی میں ٹائپ کا مطبع بھی قائم ہو گیا۔ اس سال کے بعد تمام ہندوستان میں لیتھو کے چھاپے خانے کھلنے لگے اور اخبارات نکلنے لگے۔ آگرہ، میرٹھ، بنارس، بریلی، پنجاب، بمبئی، مدارس وغیرہ میں بڑی کثرت سے مطابع و اخبارات جاری ہو گئے۔ ۱۸۴۹ء میں صرف ممالک مغربی شمالی (یعنی موجودہ یوپی، دہلی اور پنجاب) میں ۲۴ مطبع تھے جن میں بارہ مطبع صرف لکھنؤ میں تھے اور ان مقامات پر ۲۳ اخبار اُردو کے نکلتے تھے۔ اس سال تمام ہندوستان کے اُردو اخباروں اور رسالوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی اور صرف ممالک مغربی شمالی میں ۱۴۱ کتابیں طبع ہوئی تھیں۔ غدر کے اگلے سال ۱۸۵۸ء میں مطبع نولکشور قائم ہوا اور اس سال مطبع سے اُردو اخبار جاری ہوا۔ یہ اخبار آئندہ چل کر روزانہ ہو گیا اور ملک کے ممتاز اخباروں میں شمار ہونے لگا۔ اور مطبع نولکشور کو اس قدر ترقی ہوئی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک مشرقی میں اس سے بڑا مطبع نہ تھا۔ لیکن صحتِ کتاب اور حسنِ طباعت کے اعتبار سے منشی رحمت اللہ کے مطبع نامی کانپور نے نام پیدا کیا جو انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہوا تھا اور بیس سال سے زیادہ ملک کی خدمت کر کے اپنے مالک کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کی مطبوعات حسن و خوبی کے لحاظ سے ایشیا بھر میں بے نظیر تھیں۔ قدیم مطابع میں مطبع نولکشور کے علاوہ صوفی قادر علی خاں کے مطبع مفید عام آگرہ کو بھی فنِ طباعت میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ بیسویں صدی میں متعدد اعلیٰ مطابع جاری ہوئے۔ کامیاب ہوئے اور قائم رہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں بلاک کی چھپائی اس قدر عام اور ارزاں ہو گئی ہے کہ تمام سنگی مطابع کی خوشنمائی اس کے سامنے

پیچ ہے۔

''کتاب ''ہندوستانی اخبار نویسی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں'' کے مؤلف محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں:(۲) ''... فورٹ ولیم کالج فتح سرنگاپٹم کی یادگار کے طور پر ۱۸۰۰ء میں قائم ہو چکا تھا...''

''شمالی ہند میں اُردو اخباروں اور چھاپے خانوں کی کثرت کا دَور ۱۸۴۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اور اس دور میں شمالی ہند کے شہروں اور قصبوں سے ان گنت اُردو اخباروں کا اجراء ہوا۔ اُردو کا پہلا مطبع مؤلف ''اختر شہنشاہی'' کی فہرست کے مطابق دہلی کا مطبع عبدالرحمٰن تھا۔ جو ۱۸۱۳ء میں قائم ہوا، لیکن کسی دہلی والے نے سی۔ایف اینڈ ریوز کو یہ بتایا تھا کہ کلکتہ سے ایک چھاپا خانہ دہلی لایا گیا اور اُردو کا پہلا نصاب مولوی محمد باقر نے اسی چھاپہ خانہ سے جاری کیا۔

دہلی کے مطبع عبدالرحمٰن کے بعد لکھنؤ میں غازی الدین حیدر کے عہد میں بہت صرف اور تکلیف کے ساتھ ایک مطبع ٹائپ کا کھولا گیا، جس میں سب سے پہلے ہفت اقلیم چھپی۔ دوسری کتابیں جو اس مطبع سے نکلتی تھیں۔ حسبِ ذیل ہیں: ''مناقب حیدر بزبان عربی ۱۸۱۹ء میں، محامد حیدری فارسی میں ۱۸۲۲ء میں (دونوں کتابیں غازی الدین حیدر کی تعریف میں تھیں)، گلدستۂ محبت جس میں جناب گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز اور غازی الدین حیدر کی ملاقات کا حال فارسی میں ہے۔'' ۱۸۳۰ء میں ایک انگریز مسٹر آرچر جنھوں نے ایک لیتھوگراف کا چھاپہ خانہ کانپور میں کھولا تھا۔ نصیر الدین کے حکم سے لکھنؤ آئے اور یہاں ایک مطبع جاری کیا اور ایک مشہور کتاب جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں چھپی تھی، وہ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ تھی جس کو لارڈ براہم نے سائنس کے فوائد و اعمال پر تصنیف کیا تھا۔ اس کا ترجمہ سیّد کمال الدین حیدر معروف بہ میر محمد حسین لکھنوی نے اسکول بک سوسائٹی کی فرمائش سے کیا اور مطبع سلطانی میں ۱۸۴۳ء میں

چھپا۔ یہ ترجمہ نہایت صاف اور سلیس اُردو میں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۴۰ء میں سرکار اودھ کے ٹائپ کے چھاپہ خانے کے علاوہ لکھنؤ اور کانپور دونوں شہروں میں لیتھو کا ایک چھاپہ خانہ تھا۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں:(۳)

''۱۸۰۱ء میں کلکتہ کے انگریزی اخباروں کے کم از کم چار چھاپے خانوں میں فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے ٹائپ موجود تھے، جہاں ہندی اور اُردو کی کتابیں چھپ سکتی تھیں۔ اس کا اندازہ ہم کو جان گل کرائسٹ(۴) کی ایک رپورٹ سے ہوتا ہے جو ۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو لکھی گئی تھی۔ اس رپورٹ سے ہم کو پتا چلتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج نے اپنی زندگی کے دوسرے سال (۱۸۰۱ء) میں ہندوستانی زبانوں کی حسبِ ذیل کتابیں شائع کی تھیں۔ اس رپورٹ میں ان چھاپے خانوں کے نام بھی لیے گئے ہیں۔ جہاں یہ کتابیں چھپی تھیں۔ فہرست یہ ہے:

نام کتاب	رسم الخط	مطبع
مسکین کے مرثیے	ناگری	ہرکارہ پریس
بتیسی سنگھاسن	ناگری	ہرکارہ پریس
شکنتلا ناٹک	ناگری	کلکتہ گزٹ پریس
اخلاقِ ہندی	ناگری	ٹیلیگراف پریس
چہار درویش	فارسی	ہرکارہ پریس
میر حسن	فارسی	کلکتہ گزٹ پریس
گلستان	فارسی	میرر پریس
طوطا کہانی	فارسی	ٹیلیگراف پریس

فارسی رسم الخط کا تجارتی چھاپہ خانہ:

کلکتے کے انگریزی اخباروں کے ان چھاپے خانوں کو ہم اگر نظرانداز کر دیں، جہاں فارسی رسم الخط کے ٹائپ موجود تھے تو فارسی رسم الخط کا پہلا باضابطہ تجارتی چھاپہ خانہ ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں قائم ہوا۔ اس کا نام ہندوستانی پریس تھا۔ ۱۸۰۲ء میں اس چھاپے خانے سے فورٹ ولیم کالج کی کم از کم ایک کتاب ضرور شائع ہوئی۔ اس کتاب کا نام ''سٹرینجرز ایسٹ انڈیا گائیڈ ٹو ہندوستانی'' ہے۔ ہندوستانی پریس کی دوسری چھپی ہوئی کتاب جو ہم کو ملی ہے، وہ ''اخلاقِ ہندی'' ہے جو ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے سرورق کی تصویر اس کتاب میں پیش کی جا رہی ہے۔

بعض محققین نے ہندوستانی پریس کا سنہِ اجراء ۱۸۱۰ء بتلایا ہے جو یقیناً صحیح نہیں ہے اور یہ غلطی سب نے مؤلف اختر شہنشاہی (۱۸۸۸ء) سے مستعار لی ہے، جنہوں نے اس مطبع کا سنہِ اجراء ''یکم جنوری ۱۸۱۹ء'' بتلایا ہے۔''

شمالی ہند کی اخبارنویسی کے بارے میں لکھتے ہیں: (۵)

''شمالی ہند کا پہلا انگریزی چھاپہ خانہ ۱۸۲۲ء میں کانپور میں قائم ہوا۔ اسی چھاپے خانے کے بانی مسٹر سیم ویل گرین ولے تھے اور اسی چھاپے خانہ سے شمالی ہند کا پہلا انگریزی اخبار کانپور ایڈورٹائزر کے نام سے شائع ہوا۔ پھر ۱۸۲۸ء میں ایک اور اخبار اسی چھاپہ خانہ سے آم فی بس کے نام سے شائع ہوا۔ مؤخر الذکر اخبار کے صرف چند ہی نمبر شائع ہوئے۔ ۱۸۳۰ء میں کانپور کے اس چھاپے خانہ کی ایک شاخ میرٹھ میں قائم کی گئی۔ انگریزی چھاؤنی ہونے کی وجہ سے ان دنوں میرٹھ کا شہر شمالی ہند میں انگریزوں کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔ میرٹھ کا چھاپہ خانہ کھلنے کے دوسرے سال ۱۸۳۱ء میں میرٹھ آب زرور کا اجرا ہوا۔ اور اس کے بعد اس چھاپے خانہ کا نام بھی آب زرور

پریس ہو گیا۔ میرٹھ آب زرور اس وجہ سے قابلِ ذکر ہے کہ وہ غالباً ۱۸۲۷ء سے قلمی جاری تھا۔ اس کو کیپٹن ٹیوکیٹ مرتب کرتے تھے۔

۱۸۳۵ء میں آب زرور پریس سے ایک ماہوار رسالہ جاری ہوا جس کا نام میرٹھ یونیورسل میگزین تھا، لیکن عام طور پر ''مم'' کی عرفیت سے مشہور ہوا۔ یہ شمالی ہند کا پہلا انگریزی رسالہ تھا، لیکن زیادہ دِنوں نہ چل سکا۔ کانپور اور میرٹھ کے بعد تیسرا چھاپہ خانہ آگرہ میں کھولا گیا۔ اس کے مالک مسٹر ہنڈرسن تھے...''

ماہنامہ ''اعجاز'' مئی ۱۹۳۰ء کے مضمون ''ہندو مصنفین اُردو'' سے مندرجہ ذیل کتب کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ تاریخِ کانپور، ۳ جلد، منشی درگاہی لال، تاریخ و تذکرہ، ۱۸۵۷ء

۲۔ گلشنِ پنجاب، لالہ دیبی پرشاد، تاریخ و تذکرہ، ۱۸۵۰ء

۳۔ اصولِ مساحت، دیبی چند، ریاضی، ۱۸۵۴ء

۴۔ لیلاوتی، دیبی چند، ریاضی، ۱۸۷۱ء

۵۔ اقلیدس (دو مقالے)، بنسی دھر، ریاضی، ۱۸۵۳ء

۶۔ جبر و مقابلہ، بنسی دہر، ریاضی، ۱۸۵۶ء

مولوی محمد یحییٰ تنہا ''سیر المصنّفین'' میں لکھتے ہیں(۶): ''مرقومتہ الذیل کتب انڈیا آفس لائبریری، لندن میں محفوظ ہیں:

کتب نجوم و ہئیت:

(۱) مفتاح الافلاک از عبدالسلام، صفحات ۲۷۲، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۳۳ء

(۲) نظامِ آسمانی (انگریزی مع ترجمہ ہندوستانی)، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۳۶ء

(۳) علمِ ہئیت: ترجمہ لیفٹیننٹ میلس، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۸۳۲ء

جغرافیہ:

(۱) خلاصہ علم الارض (مع انگریزی)، مطبوعہ کلکتہ،۱۸۲۴ء

(۲) مراۃ الاقالیم، صفحات ۱۸۰، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۳۶ء

علم المعاشرت:

(۱) اقبال فرنگ: بیان عادات و آداب و احوال فرنگ از نواب اقبال الدولہ بہادر، مطبوعہ، کلکتہ۱۸۳۴ء

تالیفات ڈاکٹر جان گلکرائسٹ:

(۱) انگریزی ہندوستانی لغت: مطبوعہ کلکتہ ۱۷۸۷ء و ۱۷۹۶ء

(۲) ہندوستانی علم اللسانی جس میں انگریزی، ہندوستان اور ہندوستانی انگلریزی کی فرہنگ ہے اور شروع میں صرف ونحو پر مقدمہ بھی ہے جو دوسرے ایڈیشن میں باضافہ و ترمیم شائع ہوا ہے۔ مطبوعہ ایڈنبرا،۱۸۱۰ء

(۳) ہندوستانی کی صرف ونحو، مطبوعہ کلکتہ، ۱۷۹۶ء

(۴) مشرقی زبان داں یعنی ہندوستان کی مقبول زبان کا آسان مقدمہ جس میں زبان کے ابتدائی مسائل اور انگریزی ہندوستانی اور ہندوستانی انگریزی لغت بھی شامل ہیں، مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۸ء

(۵) کتابِ مذکورہ بالا کا اضافہ بعض اضافوں کے ساتھ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۱ء

(۶) فارسی فعل کا جدید نظریہ مع ہندوستانی مترادفات، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۰۱ء

(۷) ہندوستان کی سب سے بڑی اور مقبول زبان ہندوستانی کا راہنما (اجنبیوں کے لیے)، مطبوعہ کلکتہ،۱۸۰۲ء

(۸) اتالیقِ ہندی یعنی فارسی طلباء کے لیے ہندوستانی کی تحصیل کا آسان رستہ۔ یہ

کتاب کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے علماء نے ڈاکٹر گلکرائسٹ کی ہدایت و نگرانی میں ترجمہ و مرتب کی۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء

(۹) ہندی عربی آئینہ یعنی ایسے عربی الفاظ کی جدولیں جن کا ہندوستانی زبان سے خاص تعلق ہے، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۴ء

(۱۰) مکالمہ (انگریزی و ہندوستانی): یہ کتاب یورپینوں کے لیے تھی، کہ عام مضامین پر بول چال میں اُنہیں مہارت حاصل ہو اور وہ ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ گفتگو کر سکیں، مطبوعہ لندن، ۱۸۰۲ء

(۱۱) قصصِ مشرقی: اس میں حکایتِ لقمان و قدیم حکایات وقصص کا ترجمہ انگریزی سے ہندوستانی اور فارسی وغیرہ میں کیا گیا ہے، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء"

فنِ زراعت:

(۱) جار لگانے کی کتاب، (۱۷ صفحات)، مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء

(۲) گنگا کی نہر: ترجمہ سدا سکھ لال از انگریزی (صفحات ۲۴)، مطبوعہ آگرہ، ۱۸۵۴ء

(۳) کھیت کرم، مصنفہ کالی رائے، تین حصے، مطبوعہ دہلی، ۱۸۴۶ء

(۴) پند نامۂ کاشتکاری، مصنفہ موتی لال، مطبوعہ آگرہ، ۱۸۵۷ء

(۵) ریشم کا کیڑا از موتی لال، مطبوعہ لاہور، ۱۸۰۳ء

(۶) توصیف زراعت: از کلب حسین خاں، مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۸ء

کتبِ حکمت:

(۱) بحر الحکمت (اسٹیم انجن کا بیان) ریورنڈر پارکن، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۸۴۷ء

(۲) بخار کی کل (اسٹیم انجن کا بیان) ایشوری لال، مطبوعہ بنارس، ۱۸۵۵ء

(۳) نور النواظر از احمد علی، مطبوعہ کانپور، ۱۸۵۴ء

(۴) قانون الطباع (چھاپہ) از سیتل سنگھ، مطبوعہ دہلی، ۱۸۴۸ء

کتب نجوم و ہیئت:

(۱) خلاصہ نظام آسمانی از پنڈت داسی دھیرا، مطبوعہ آگرہ، ۱۸۰۲ء

(۲) مختصر احوال نظام آسمانی، مطبوعہ آگرہ، ۱۸۵۲ء

(۳) مختصر دقائق النجوم، بڑے صاحب گھاٹلے، مطبوعہ مدراس ۱۸۴۸ء

(۴) احوال علم ہئیت از رام چندر، صفحات ۳۳۵، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء

جغرافیہ:

(۱) فتح گڑھ نامہ (احوال ضلع فتح گڑھ) کالی رائے، صفحات ۲۰۴، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۹ء

(۲) علم جغرافیہ ترجمہ میر غلام علی، صفحات ۱۰۹، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۱ء

(۳) جغرافیۂ عالم، صفحات ۱۰۹، مطبوعہ دہلی ۱۸۵۳ء

(۴) خلاصۃ الجغرافیہ، مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء

(۵) جغرافیہ کا پہلا رسالہ مترجم از انگریزی، میر غلام علی، مطبوعہ مدراس ۱۸۵۳ء

(۶) جغرافیۂ ہند از انگریزی، پنڈت سوا روپ نرائن، دسیو روپ نرائن، صفحات ۱۲۲ر مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء

طبیعیات:

(۱) عجائب روزگار از رام چندر مطبوعہ، دہلی ۱۸۴۷ء

(۲) جے ڈبلیو، بیل، مطبوعہ آگرہ، ۱۸۵۴ء

(۳) ہوا کا بیان از بدری لال، مطبوعہ بنارس، ۱۸۵۴ء

(۴) علم حکمت (مکینکس) چارلس فنک، صفحات ۳۰۱، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۴۳ء

(۵) معدنیات، جواہر لال مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۵ء

(۶) خلاصۃ الصنائع (ترجمہ انگریزی)، بھولا ناتھ، صفحات ۱۱۲، مطبوعہ آگرہ، ۱۸۵۴ء

(۷) مراۃ العلوم، ہری دامن لال، مطبوعہ بنارس ۱۸۴۹ء

(۸) رسالہ مقناطیس ترجمہ از انگریزی سیّد کمال الدین صفحات ۲۷۱، مطبوعہ دہلی، ۱۸۵۰ء

(۹) تحصیل فی جراثقیل، سیّد احمد خاں، مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۴ء

(۱۰) اصول علم طبعی ترجمہ از انگریزی، اجودھیا پرشاد سیوا پرشاد، صفحات ۱۶۱، مطبوعہ دہلی، ۱۸۴۸ء

(۱۱) اصول جرثقیل، محمد حسن، مطبوعہ بنارس ۱۸۵۴ء

(۱۲) اصول قواعد مائیات، ترجمہ انگریزی اجودھیا پرشاد۔ مطبوعہ دہلی، ۱۸۵۰ء، ص ۲۶۴

(۱۳) مقاصد العلوم، ترجمہ انگریزی از سیّد محمد میر، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۴۱ء

(۱۴) دائرہ علم (نیچرل فلاسفی) محمد کرم بخش، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۸۴۶ء

معاشیات (پولیٹکل اکانمی):۔

(۱) ترجمہ معاشیات مل، وزیر علی، ص ۴۱۸، مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء

(۲) اصول علم انتظام مدن، ترجمہ انگریزی، دھرام نرائن، مطبوعہ دہلی، ۱۸۴۶ء

منطق:

(۱) ترجمہ شمسیہ، مولوی سیّد محمد، مطبوعہ دہلی، ۱۹۴۴ء

متفرق:

مولوی محمد عمران رامپوری نے رسالہ تجہیز و تکفین ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۱ء میں تصنیف کیا تھا۔

نیم چند کھتری نے قصہ گل با صنوبر فارسی زبان سے اُردو میں ۱۸۳۷ء میں ترجمہ کیا جو لارڈ اکلینڈ کے عہد میں داتا رام برہمنی کی تصحیح سے چھاپا گیا۔

لالہ گوبند سنگھ ساکن شاہجہاں آباد نے جو مدتوں لکھنؤ رہے اور وہاں سے کلکتہ

پنج کر نغمۂ عندلیب کے نام سے ایک قصہ ۱۲۶۱ھ میں تصنیف کیا۔ چوہدری نبی احمد نے ترتیبِ نو کے ساتھ سلطانیہ بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ سے باردگر شائع کیا۔

مولوی مسیح الزماں ولد مولوی نور محمد نے ۱۸۴۸ء میں تعلیم مکاتب کے لیے معلم الحساب ملقب بہ مکتب نامہ لکھا، جس میں لڑکوں کے لیے نصائح، حکایات، انشاء، رقعات، قواعد، حساب اور بارہ سو برس کی ایک جنتری تحریر کی۔ مکتب نامہ دوسری بار ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا۔ اشاعتِ اوّل ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۷ء میں ہوئی تھی۔

منشی چرنجی لال الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ فلسفہ و ریاضی کا بہت شوق تھا۔ مصباح المساحت ۱۸۵۴ء میں لکھی۔ اس کے بعد مسٹر ہنری کارٹر کی تحریک اور مسٹر چارلس فنک کی اعانت سے علم نفسیات کی ایک کتاب انگریزی سے ترجمہ کی اور اس کا نام تعلیم النفس رکھا۔ یہ کتاب گورنمنٹ پریس میں ۱۸۵۹ء میں طبع ہوئی۔

سیّد فدا حسین عرف نبی بخش نے تاریخِ افغانستان ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء میں لکھی۔ دیباچہ میں مولانا کے حالات خودنوشت موجود ہیں۔

مفتی سعد اللہ رامپوری نے ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۴۰ء میں ترجمہ فقہ اکبر کے نام سے کتاب لکھی۔ ان کا نام مولوی محمد نظام الدین تھا۔ اصل وطن مراد آباد ۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ علماء عصر سے تحصیلِ علوم کی۔ دہلی میں تعلیم حاصل کر کے لکھنؤ گئے، وہاں تکمیلِ علم کے بعد مدرسۂ شاہی میں مدرس ہو گئے۔ الحاق اودھ کے بعد رامپور چلے گئے۔ نواب یوسف علی خاں اور منشی امیر مینائی بھی آپ کے شاگرد ہیں۔ ۱۸۷۶ء/ ۱۲۹۳ء میں انتقال ہوا۔ ۲۸ تصانیف کے مالک ہیں۔

عباس بن ناصر علی المورخ نے رسالہ صبح کا ستارہ ترجمہ کیا۔ یہ رسالہ ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۲ء میں مرتب ہوا اور ۱۰ر شوال ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۲ء کو مطبع مصطفائی محلہ ٹپکا

پور، کانپور میں چھپا۔ اس میں موت اور بعد موت کا حال لکھا ہے۔ ہر بیان کو آیات و احادیث و اقوال علماء و اولیاء سے مدلل کیا ہے۔ ترجمہ و دقائق الاخبار کے بعد مترجم نے اپنی طرف سے چند اخلاقی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

امام بخش صہبائی نے دہلی کالج کی ملازمت کے دوران ۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۲ء میں منشی شمس الدین فقیر کی حدائق البلاغت کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

سیّد باقر حسین بن سیّد علی خاں متوطن دہلی نے عجائب القصص کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب کلیم اللہ خاں نے فارسی زبان میں تحریر کی تھی۔ اس کا دیباچہ فخر الدین حسین نے لکھا تھا۔

سیّد افضل علی متوطن شاہجہاں آباد کا خاندانی پیشہ شہزادوں کی تعلیم و تعلم کا تھا۔ سیّد شاکر علی کے بیٹے تھے۔ کتاب مفید الاجسام ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۴ء میں لکھی تھی، یہ فنِ جراحی کے متعلق ہے۔

نواب محمد قطب الدین خاں شاگرد شاہ محمد اسحاق دہلوی۔ خواجہ ضیاء الدین احمد کی فرمائش پر تحفۃ الزوجین تصنیف کی۔ والد کا نام محمد محی الدین خاں ہے۔ تحفۃ الزوجین کا سنِ تصنیف ۱۲۶۱ھ ہے۔ تفسیر قرآن بزبانِ اُردو غیر مکمل چھپی ہے۔ ترجمہ حصن حصین درفنِ حدیث اُردو ترجمہ مشکوٰۃ بعنوان مظاہرِ حق مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ دینیات کے متعدد رسالے لکھے ہیں۔ تحفۃ الزوجین (۱۳۲ صفحات) کو سیّد حیات علی نے ۱۲۶۸ھ میں دوسری بار مطبع مطیع الرحمٰن میں طبع کرالیا تھا۔

مولوی کریم الدین پانی پتی نے طبقات شعرائے ہند ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء میں لکھا تھا۔ یہ تذکرہ شعرائے ہند ۹۶۴ شعراء کے حال پر مشتمل ہے اور صرف ایک مرتبہ مطبع العلوم دہلی میں باہتمام سیّد اشرف علی ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا۔ اس کے علاوہ مولوی کریم الدین نے موضح اللسان حصہ اوّل بھی ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء میں تحریر فرمائی تھی۔

جیمس کارکرن عدالت دیوانی صدر کلکتہ میں مترجم تھے۔ آپ نے تاریخ ممالک چین ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء تحریر فرمائی تھی۔ یہ کتاب ۲ جلدوں میں تمام ہے۔ پہلی جلد مؤلف کے اہتمام سے بمطبع پادری ٹامس صاحب واقع شہر کلکتہ بماہ نومبر ۱۸۴۸ء میں ختم ہوئی۔

پنڈت سروپ نرائن و شیخو نرائن نے کتاب حکمت (علمِ طبعی) مصنفہ ارنٹ کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب قاضی محمد سعید و قاضی محمد فرید ایم۔اے رئیسانِ پٹنہ محلّہ لودی کٹرہ ولدان قاضی عبدالوحید مرحوم مدیر تحفۂ حنفیہ کے کتب خانہ میں احسن مارہروی مرحوم نے دیکھی تھی، ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء کی چھپی ہوئی ہے۔

سیّد ظہیر الدین حسنین ظہیر نے قصۂ ممتاز کو فارسی سے اُردو میں بموجب فرمائش حکیم احسن اللہ خاں منتقل کیا ہے۔ یہ کتاب میسور پریس دہلی میں باہتمام منشی بلاقی داس بھی طبع ہوئی ہے۔

امام الدین طالب نے تقویت الشعراء ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۶ء میں تصنیف کی تھی۔ یہ علمِ عروض کے متعلق ہے۔ سلطان المطابع لکھنؤ میں ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۱ء میں چھپی تھی۔

شیخ احمد علی گوپاموی نے حملاتِ حیدری (تواریخ گزیدہ انس جنگ نامہ نواب حیدر علی والیٔ میسور) کا ترجمہ ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء میں کیا تھا۔

یوسف خاں عرف کمبل پوش حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے۔ تاریخِ یوسفی ان سے یادگار ہے۔ یہ کتاب سفرنامۂ انگلستان ہے۔ مطبع العلوم دہلی میں ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا، صفحات ۲۹۷۔(۷)

سیّد احمد ولد سیّد درویش ساکن کرناٹک نے مطبع القمرین فی احکام العیدین لکھی تھی۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۱۲۴ صفحات پر ختم ہوئی۔ اور نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانہ میں ہے۔ ۲۷ رجب ۱۲۶۵ھ کو کشن راج کے چھاپے خانے

میں چھپی تھی۔

ماسٹر رام چندر جو دہلی کالج کے استاد تھے اور بعد میں پٹیالہ میں ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ہو گئے تھے نے تذکرہ الکاملین تحریر فرمائی، جو یکم اکتوبر ۱۸۴۹ء کو پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ اصولِ ہیئت اور عجائب روزگار ۱۸۴۷ء، ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی تھیں۔

مفتی سیّد عنایت احمد کاکوروی نے محاسن العمل الافضل ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں لکھی تھی۔ مفتی لطف اللہ علی گڑھی اُنہیں کے شاگرد تھے۔ مفتی صاحب حدیث میں شاہ محمد اسحٰق صاحب کے شاگرد تھے۔ علماء میں جامع العلوم مانے جاتے تھے۔ تاریخ حبیب اللہ الکلام المبین دربیانِ معجزات اور ضمان الفردوس در بیان نصائح آپ کی تصانیف ہیں، یہ کتاب ۱۲۷۲ھ میں مطبع نظامی کانپور میں چھپی تھی۔

مولوی غلام امام خاں ہجر ساکن حیدرآباد نے ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں تاریخ رشید الدین خاں مطبوعہ مطبع خورشیدیہ (پانگاہ) تصنیف فرمائی۔ دوسری کتاب تاریخِ خورشید جاہی (۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء) میں تصنیف فرمائی جو ۱۲۹۷ء میں چھپی۔

منشی عبدالکریم لکھنوی کلکتہ میں میر منشی دفتر فارسی نواب گورنر جنرل بہادر تھے۔ پینشن لینے کے بعد ۱۸۴۵ء میں انگریزی الف لیلۃ سے اُردو ترجمہ کیا جو ۱۸۴۷ء میں چھپا۔ اس کے ۲۲ سال بعد ۱۲۹۵ء میں بفرمائش نولکشور مطبع نظامی میں یہ ترجمہ طبع ہوا اور مترجم نے عمدہ عمدہ تصاویر الف لیلیٰ انگریزی مطبوعہ لندن برمحل اور موقع پر شائع کیں۔

گارساں دی تاسی (۸) ۱۷۹۴ء میں مارسیلز میں پیدا ہوا۔ اس کا انتقال ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ اس کی کتابوں کی فہرست یوں ہے:

(الف) تراجم:

(۱) منطق الطیر فارسی، (۲) مثنوی اژدر نامہ میر تقی میر، مطبوعہ ۱۸۲۶ء، (۳) مثنوی کامروپ تحسین الدین، مطبوعہ ۱۸۳۴ء (۴) خلاصہ گلِ بکاؤلی، مطبوعہ ۱۸۳۵ء، (۵) مرثیہ مسکین، مطبوعہ ۱۸۴۵ء، (۶) فرمان وائسرائے دربارہ سومنات، مطبوعہ ۱۸۴۵ء، (۷) اُردو ڈرامہ، مطبوعہ ۱۸۵۰ء، (۸) شکنتلا ناٹک، مطبوعہ ۱۸۵۲ء، (۹) آثار الصنادید، مطبوعہ ۱۸۶۱ء، (۱۰) اخوان الصفا، مطبوعہ ۱۸۶۴ء، (۱۱) اُردو، فارسی، ترکی کے مشہور مقولوں، نظموں اور تلمیحوں کا ترجمہ، مطبوعہ ۱۸۷۶ء، (۱۲) باغ و بہار، میر امن، مطبوعہ ۱۸۷۸ء

(ب) ترتیب:

(۱) کلیاتِ ولی اورنگ آبادی، مطبوعہ ۱۸۳۴ء، (۲) مثنوی کامروپ تحسین الدین مطبوعہ ۱۸۳۵ء

(ج) تصنیف و تالیف:

(۱) اُردو کا قاعدہ، مطبوعہ ۱۸۱۹ء، (۲) ادب اُردو ہندی کی تاریخ، مطبوعہ ۱۸۳۹ء، (۳) ہندی کا قاعدہ، مطبوعہ ۱۸۴۷ء، (۴) خطبہ افتتاحیہ، مطبوعہ ۱۸۵۰ء، (۵) ہندوستانی شاعر عورتیں، مطبوعہ ۱۸۵۴ء، (۶) ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات، مطبوعہ ۱۸۵۵ء، (۷) اُردو کا قاعدہ (دوسرا ایڈیشن) مطبوعہ ۱۸۶۳ء، (۸) ادب اُردو ہندی کی تاریخ طبع ثانی، مطبوعہ ۱۸۷۰ء

''ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات کا اُردو ترجمہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے اصل کتاب کی اشاعت کے دوسرے ہی سال ۱۸۵۶ء میں شائع کیا تھا اور ۱۸۵۲ء میں منشی کریم الدین تاریخ ادبیات ہندوستانی کا ترجمہ طبقات الشعراء کے نام سے چھپوا

چکے تھے۔(۹)

○

اُردو کتابیات کے سلسلے میں معروف کتاب ''الفہرست''(۱۰) مرتبہ محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی میں کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے، وہ کچھ یوں ہے:

ترجمہ قرآن مجید:

۲ ترجمہ قرآن شریف، شاہ عبدالقادر صاحب، ۱۲۰۵ھ

۲ ترجمہ قرآن شریف، شاہ رفیع الدین صاحب، ۱۲۲۲ھ

تفسیر:

۷ کوکب دری، محمد جمال الدین خاں، ۱۲۰۳ھ، ۳۳۲ صفحات

تجوید:

۱۶ زینت القاری، ۱۲۲۴ھ، ۲۴ صفحات، مطبع اکبری

۱۷ مختصر تجوید، قادر بخش پانی پتی، ۱۲۶۴ھ، ۲۲ صفحات، مطبع مصطفائی، دہلی

۱۸ ہدیۃ الوحید فی علم التجوید، قاری عبدالوحید، ۱۲۳۲ھ، مطبع قاسمی دیوبند

حدیث:

۲۳ تحفۃ الحرمین، حاجی شاہ نورالحسن، ۱۲۰۰ھ، ۵۴۷ صفحات

فقہ:

۳۳ اصول شرع محمدی، مگناٹن، ۱۸۲۸ء، ۳۸ صفحات، ثمر ہند لکھنؤ

۳۴ جامع البرکات، مولوی سراج الدین، ۱۲۶۱ھ، ۶۷ صفحات

۳۵ کفایت الاسلام، شاہ ملک، ۱۲۴۷ھ

دینیات اہلسنت:

۴۵ تحفۃ الزوجین، مولوی قطب الدین خاں، ۱۲۶۱ھ، ۸۸ صفحات، نولکشور، لکھنؤ

۴۸ داستانِ صادقین، مولوی کفایت علی کافی، ۱۸۵۳ء، ۱۶ صفحات، دہلی

۴۸ سیرت الاسلام، غلام قادر، ۱۸۴۳ء، ۱۲۰ صفحات، مدراس، کتاب مطبوعہ نظام پریس، دکن، ۱۹۲۳ء

مذہبِ نصاریٰ:

۶۸ داؤد کی زبور، ۱۸۲۵ء، ۲۵۳ صفحات، سرام پور

۷۱ مسیح کا مرنا، ۱۸۵۰ء، ۶۰ صفحات، الہ آباد

۷۲ مقدس کتاب کا احوال، ۱۸۴۷ء، ۲۷۲ صفحات، آگرہ

علم اخلاق:

۱۰۱ خلاصۃ النصائح، ۱۸۲۶ء، ۱۰۴ صفحات

۱۰۱ لڑکوں کا درپن، ۱۸۴۶ء، ۱۸ صفحات، آگرہ

۱۰۲ منتخب النصائح، ۱۸۲۶ء، ۵۴ صفحات، کلکتہ

۱۱۲ رسالہ اصطلاحات صوفیہ معرفت سلوک، محمد ولی اللہ قادری، ۱۱۹۵ھ

۱۱۳ میخانۂ وحدت، غلام علی، ۱۲۴۲ھ، قلمی

حساب:

۱۲۹ دستورات گنج شمار، انام بدھ سنگھ، ۱۸۴۸ء، سیالکوٹ

۱۳۰ خزینۃ الحساب، سکھ دیو سہا، ۱۸۵۶ء، ۲۲۴ صفحات، لاہور

۱۳۰ میزان الحساب، قادر علی خاں ناظر، ۱۸۴۷ء، ۴۲ صفحات، مدراس

۱۳۰ پھیلاوٹ، رام سرنداس، ۱۸۴۵ء، ۲۴ صفحات، کلکتہ

۱۳۱ سریع الفہم، رامچند ر، ۱۸۴۵ء، ۴۴ صفحات، دہلی

۱۳۱ سراج الہدایات، کانٹی دیال، ۱۸۴۵ء، ۲۴ صفحات، بنارس

۱۳۱ تحفۃ الحساب، مولوی ذکاء اللہ، ۱۸۵۴ء، ۲۶ صفحات، کانپور

۱۳۲ عمدہ کتاب در حساب، تارا چند، ۱۸۴۴ء، ۳۲ صفحات، لکھنؤ

۱۳۲ اصولِ علم حساب، ۱۸۴۴ء، ۶۱ صفحات، آگرہ

۱۳۲ اصول علم حساب جزئیات، رامچند، ۱۸۴۵ء، ۶۱۷ صفحات، دہلی

جبر المقابلہ:

۱۳۶ علم جبر المقابلہ، دیوی پرشاد، ۱۸۴۰ء، بریلی

۱۳۶ اصول جبر المقابلہ، رامچند ر، ۱۸۴۵ء، ۸۷۴ صفحات، دہلی

۱۳۶ لوگارثم، عظیم بخش، ۱۸۱۲ء، ۱۸ صفحات، آگرہ

مساحت:

۱۳۹ مصباح المساحت، چرنجی لال، ۱۸۵۴ء، آگرہ، نولکشور لکھنؤ

۱۴۰ آلاتِ پیمائش، کنھیالال، ۱۸۵۷ء، ۱۷۶ صفحات، مفید عام لاہور

۱۴۰ ہدایت نامہ کام پیمائش، کالی رائے، ۱۸۵۰ء، ۲۴ صفحات، دہلی

۱۴۱ معدن الفیض، لالہ سیوا پرشاد، ۱۸۴۹ء، ۲۲۱ صفحات، میرٹھ

۱۴۱ ناپ تول، رام سرنداس، ۱۸۴۵ء، ۱۶ صفحات، کلکتہ

۱۴۱ پیمائشِ خطوط، درباری لال، ۱۸۵۰ء، ۱۲۵ صفحات، دہلی

۱۴۱ رسالہ پیمائشِ زمین کا، بسدیوا سمہا، ۱۸۴۸ء، ۴۷ صفحات، دہلی

۱۴۲ اصولِ مساحت، دیوی پرشاد، ۱۸۵۴ء، ۱۷۴ صفحات، آگرہ

علمِ مثلث:

۱۴۵ اصولِ علمِ مثلث، رام چندر، ۱۸۴۴ء، ۲۱۷ صفحات، دہلی

جرثقیل:

۱۴۸ تسہیل فی جرثقیل، سیّد احمد خاں، ۱۸۵۴ء، ۳۸ صفحات

۱۴۸ اصولِ جرثقیل، محمد احسن، ۱۸۵۴ء، ۱۶ صفحات، بنارس

۱۴۸ اصولِ قواعد مائیات، اجودھیا پرشاد، ۱۸۵۰، ۲۵۰ صفحات، دہلی

علمِ تعمیرات:

۱۵۱ علمِ روات، رادھا کرشن، ۱۸۵۲ء، ۴۶۰ صفحات، دہلی، (جرثقیل)

علمِ ہندسہ:

۱۵۷ ہندسہ بالجبر، رام چند رادھا کرشن، ۱۸۵۳ء، ۴۴۸ صفحات، دہلی

۱۵۷ نتائج تحریر اقلیدس، داس دہر، ۱۸۵۴ء، ۱۵۶ صفحات، آگرہ

۱۵۷ تحریر اقلیدس، ۱۸۴۰ء، ۲۹۵ صفحات، دہلی

تاریخ:

۱۶۲ دلائلِ رسالت، سیّد عبداللہ، ۱۸۵۰ء، ۴۸ صفحات، کلکتہ

۱۶۲ ہشت بہشت، محمد باقر، ۱۸۴۵ء، ۲۷۵ صفحات، مدراس

۱۶۳ مولود تاریخیہ، محمد طاہر، ۱۸۴۷ء، ۸۹ صفحات، مدراس

۱۶۳ میلاد شریف، محمد سلامت اللہ کاشفی، ۱۸۴۶ء، ۱۷۴ صفحات، کلکتہ

۱۶۳ نبی نامہ، محمد غلام غوث خاں، ۱۸۵۲ء، ۱۳۲ صفحات، دہلی

۱۶۴ صیانت العوام، محمد فرید الدین، ۱۸۵۱ء، ۶۴ صفحات، دہلی

تاریخِ اسلام:

۱۷۴ عروج الاسلام، عبدالغفور خاں، ۱۸۱۲ء، مفید عام آگرہ، ترجمہ تاریخ ابنِ اثیر (۳۶ جلدیں)

۱۷۶ بیاگرافکل ہسٹری آف محمڈن جیورس پروڈنس، سبحان بخش، ۱۸۴۸ء، ۱۶۱ صفحات، دہلی

۱۷۷ تاریخ ابوالفدا، کریم الدین، ۱۸۴۷ء، دہلی، تین جلدیں

۱۸۰ دروازہ مجلس، مولوی خیر الدین، ۱۲۵۶ھ، ۳۴۶ صفحات، صوفی پنڈی بہاء الدین، گجرات

۱۸۰ تاریخ مکہ معظمہ، مولوی فخر الدین حسین خاں، ۱۲۶۸ھ، ص ۶۴، صوفی پنڈی بہاءالدین، گجرات

حالات بزرگانِ دین:

۱۹۳ دہ مجلس اُردو، ۱۸۵۰ء، ۱۰۴ صفحات، دہلی

۱۹۳ دہ مخزن، نصر اللہ خاں، ۱۸۴۹ء، ۲۶۴ صفحات، میرٹھ

تاریخِ انگلستان:

۱۹۸ مختصر تاریخِ انگلستان، ۱۸۵۴ء، ص ۶۶، الہ آباد

۱۹۹ تاریخِ روم، ڈاکٹر گولڈ اسمتھ، ۱۸۴۱ء، ص ۳۴۰، دہلی

۱۹۹ تاریخ انگلینڈ کی، ۱۸۴۰ء، ص ۲۰۰، مدراس

تاریخِ جاپان وچین:

۲۰۱ تاریخ ممالک چین، جیمس کارکون، ۱۸۴۱ء، کلکتہ

تاریخِ یونان:

۲۰۲ تاریخِ یونان، وزیر علی وشیو پرشاد، ۱۸۴۸ء، ص ۴۰۳، دہلی

۲۰۲ تاریخِ یونان، ڈاکٹر گولڈ اسمتھ، ۱۸۴۶ء، ص ۴۰۳، دہلی

تاریخ ترکان:

۲۰۹ توزک تیموری، سبحان بخش، ۱۸۴۵ء، ص ۸۸۴، دہلی

تاریخ ایران:

۲۱۱ تاریخ ایران، منشی حسین مترجم، ۱۸۴۵ء، ص ۲۲۴۸، علی گڑھ

۲۱۲ تاریخ ایران، منشی حسینی، ۱۸۴۵ء، ص ۲۵۰، دہلی

تاریخِ افغانستان:

۲۱۳ تاریخِ افغانستان، میر اشرف علی، ۱۸۴۵ء، ص ۳۴۰

تاریخِ ہندوستان:

۲۱۷ آرائشِ محفل، شیر علی افسوس، ۱۸۰۸ء، ص ۳۳۱، کلکتہ

۲۱۷ تاریخِ بنگال، ترجمہ نور محمد، ۱۸۴۴ء، ص ۲۰۹، دہلی

۲۱۷ تاریخِ آسام، میر حسین، ۱۸۴۰ء، ص ۳۱۶، پیرس

۲۲۸ سرور سلطانی، رجب علی سرور، ۱۸۵۱ء، ص ۲۰۴، مطبع نظامی، کانپور

۲۳۱ حل راجہ دہار و دیواس، ۱۸۵۰ء، ص ۶۰، اندور

۲۳۱ خلاصہ تواریخِ ہند، دیوی پرشاد، ۱۸۴۸ء، ص ۹۶، بریلی

۲۳۴ سرور سلطانی، رجب علی سرور، ۱۸۵۱ء، ص ۲۰۴، نظامی کانپور، حاجی روشن خاں، کانپور

۲۳۷ مخزن التواریخ، جواہر لال، ۱۸۵۲ء، ص ۳۷۰، آگرہ

۲۳۸ تاریخِ بنگال، نور محمد، ۱۸۴۴ء، ص ۲۰۹، دہلی

۲۳۸ تاریخِ ہند، سداسکھ لال، ۱۸۵۲ء، ص ۱۳۶، الٰہ آباد

۲۳۸ تاریخِ کشمیر، اشرف علی، ۱۸۴۶ء، دہلی

۲۳۸ تاریخِ مغلیہ، نور محمد، ۱۸۴۷ء، ص ۱۲۰، دہلی

۲۳۸ تاریخِ پنجاب، شنکرداس، ۱۸۵۰ء، ص ۲۹۴، بریلی

۲۳۸ گلشنِ پنجاب، دیوی پرشاد، ۱۸۵۰ء، ص ۳۰۰، بریلی

۲۴۰ تاریخِ آگرہ، محمد سعید الدین خاں، ۱۸۴۸ء، ص ۵۷، آگرہ

حالاتِ اقوام:

۲۴۶ سیّد المتقدمین، ۱۸۲۱ء، کلکتہ

۲۴۶ تاریخِ عالم، ایچ۔ایس۔ رید، ۱۸۵۱ء، الٰہ آباد

۲۴۶ تاریخِ متقدمین و متاخرین، جے۔او، شرمن، ۱۸۵۲ء، ص ۳۱۶، کلکتہ

۲۴۶ تاریخ بری و بحری، سیو پرشاد، ۱۸۴۵ء، دہلی

۲۴۷ تاریخِ شام، ۱۸۴۵ء، ص ۲۵۷، پیرس

۲۴۹ لب التواریخ دو حصے، ۱۸۴۹ء، ص ۷۰۰، کلکتہ، نیو کرزن گزٹ دہلی، قدیم و جدید بادشاہوں اور سلطنتوں کے حالات

۲۵۱ تاریخ چین، جیمس کارکرن، ۱۸۴۸ء، کلکتہ

۲۵۱ یہودیوں کا احوال، ۱۸۵۴ء، ص ۲۹۶، آگرہ

۲۵۲ خلاصۃ التواریخ، سیو نرائن، ۱۸۴۴ء، دہلی

۲۵۲ لب التواریخ، لیوس ڈ کاسٹا، ۱۸۲۵ء، کلکتہ

۲۵۲ یہودیوں کا احوال، ۱۸۵۴ء، ص ۲۰۰، آ گرہ

سوانح عمری:

۲۷۴ عروج الاسلام ترجمہ تاریخ، عبدالغفور خاں، ۱۸۱۳ء، مفید عام آ گرہ، ڈیوٹی بک ڈپو، کالج، علی گڑھ، ۳۶ جلدوں میں ہے۔

۳۰۸ جامع فتح خاں، نصر اللہ خاں، ۱۸۴۹ء، ص ۹۲، دہلی

سفرنامہ:

۳۲۶ سفرنامہ حرمین، حکیم محمد محدی الدین، ۱۲۴۴ھ، ص ۲۸۴، مطبع ہدایت مدارس

قصص:

۳۲۹ باغ و بہار، سیّد کریم علی، ۱۸۵۲ء، ص ۴۹۰، اندور

۳۳۰ سفر یوسف خاں، یوسف خاں کمبل پوش، ۱۸۴۵ء، ص ۲۹۷، دہلی

۳۳۱ سفرنامہ سنگر پارک، ۱۸۴۲ء، ص ۱۷۳، آ گرہ

۳۳۳ تاریخ شعرائے اُردو، مولوی کریم الدین صاحب، ۱۸۴۰ء، ص ۵۰۲، دہلی

۳۳۴ گلشنِ ہند، مرزا علی لطف، ۱۸۰۱ء، ص ۲۳۲، رفاہِ عام لاہور

۳۳۵ گلشنِ بے خار، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، ۱۸۴۲ء، ص ۴۰۱، دہلی

۳۳۶ تاریخ شعرائے عرب، مولوی کریم الدین، ۱۸۴۷ء، ص ۴۴۰

۳۳۶ تاریخ شعرائے اُردو، مولوی کریم الدین، ۱۸۴۸ء، ص ۵۲۰، دہلی

۳۶۰ لیلیٰ مجنوں، محمد تقی ہوس، ۱۸۴۹ء

۳۶۰ افسانۂ رنگیں، نواب امجد علی خاں، ۱۸۴۹ء، ص ۱۵۷، آ گرہ

۳۶۰ احسن المواعظ، راجہ کالی کرشن، ۱۸۲۰ء، ص ۲۱۷، کلکتہ

۳۶۰ اخلاقِ ہندی، میر بہادر علی، ۱۸۰۳ء، ص ۲۷۳، کلکتہ

۳۶۰ الف لیلۃ، منشی شمس الدین احمد، ۱۸۲۶ء، ص ۵۲۰، مدراس

۳۶۰ الف لیلۃ، جعفر علی ولد محمد حسن علی خاں، ۱۸۴۴ء، ص ۶۰۰، دہلی

۳۶۰ الف لیلۃ، منشی عبدالکریم، ۱۸۴۴ء، کانپور

۳۶۱ انوار سہیلی، محمد ابراہیم دکنی، ۱۸۲۴ء، ص ۴۴۱، مدراس

۳۶۱ آرائشِ محفل، سیّد حیدر بخش حیدر، ۱۸۰۵ء، ص ۲۱۰، کلکتہ، قصہ حاتم طائی

۳۶۱ باغِ اُردو، میر شیر علی افسوس، ۱۸۰۸ء، ص ۳۶۴، کلکتہ، ترجمہ گلستانِ سعدی

۳۶۲ بہارِ دانش، ۱۸۴۵ء، ص ۲۷۲، کلکتہ ترجمہ گلستانِ سعدی

۳۶۲ بیتال پچیسی، مظہر علی خاں ولا، ۱۸۰۵ء، کلکتہ

۳۶۳ دل بہلاؤ، بابو سیوا پرشاد، ۱۸۵۴ء، ص ۵۰، آگرہ

۳۶۵ فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ، ۱۸۴۵ء، ص ۱۹۷، لکھنؤ

۳۶۶ گنج خوبی، میر امن، ۱۸۰۵ء کلکتہ، ترجمہ اخلاق محسنی

۳۶۶ غنچۂ صدق، تفضل حسین، ۱۸۰۴ء، ص ۶۶، کلکتہ

۳۶۶ گلدستۂ انجمن، کاشی ناتھ دسواس، ۱۸۰۰ء، ص ۱۳۱، آگرہ

۳۶۶ گلدستۂ نثر، سیّد سعادت علی، ۱۸۵۳ء، ص ۶۴، آگرہ

۳۶۷ گلستان، ترجمہ موتی لال، ۱۸۴۷ء، ص ۹۲، دہلی

۳۶۷ گلشنِ نوبہار، محمد بخش مہجور، ۱۸۴۵ء، ص ۱۹۲، دہلی

۳۶۹ حکایاتِ سخن سنج، انبا پرشاد رسا، ۱۸۴۵ء، دہلی

۳۶۹ اخوان الصفا، مولوی اکرام علی، ۱۸۱۱ء، ص ۲۹۹، کلکتہ

۳۶۹ اخوان الصفا، غلام حیدر، ۱۸۴۶ء، ص ۲۶۴، کلکتہ

۳۶۹ اخوان الصفا، منشی سیّد حسین، ۱۸۵۵ء، ص ۱۰۴، مدراس

۳۷۰ جامع الحکایات، شیخ صالح محمد عثمان، ۱۸۴۶ء، ص ۲۴۷، بمبئی

علم تشریح طب:

۴۳۵ تشریح الاجسام، ڈاکٹر میر فضل علی، ۱۸۴۷ء، ص ۱۸۱

۴۵۹ مُعین البحرین، ڈاکٹر جیمس مونٹ، ۱۸۴۶ء، اُردو انگریزی میں ہے۔

۴۷۴ زادِ غریب، حکیم صادق علی خاں، ۱۲۳۴ھ، ص ۲۲۲

۴۸۰ عملِ جراحی، ترجمہ جیمس ہنری بٹلر، ۱۸۴۸ء، ص ۱۱۹، دہلی

۴۸۱ چیچک کا ٹیکہ لگانا، ۱۸۵۰ء، ص ۸، بریلی

۴۸۲ ستیلا کا ٹیکہ، پنڈت مگن لال، ۱۸۵۳ء، ص ۲۰، آگرہ

۴۸۲ ہیضہ کا علاج، ۱۸۵۳ء، ص ۱۰، الٰہ آباد

۴۸۳ علم جراحی، تارا چند، ۱۸۵۴ء، ص ۷۶، علی گڑھ

۴۸۳ چمنستان شیریں، سیّد عبدالوحید خاں، ۱۸۴۵ء، ص ۵۴، لکھنؤ

۴۸۳ علم طب، ۱۸۴۷ء، ص ۱۷۴، دہلی

۴۸۵ مظہر العجائب، فخر الدین احمد، ۱۸۴۸ء، ص ۱۹۲، آگرہ

۴۸۵ مفتاح الدقائق، کاشی دیال، ۱۸۴۹ء، ص ۱۴، بنارس

۴۸۵ میزان الطب، محمد حسن علی خاں، ۱۸۵۲ء، ص ۳۵۰

۴۸۶ اعمال جراحی، ۱۸۴۸ء، ص ۱۱۹، دہلی

۴۸۷ چیچک کا ٹیکہ لگانا، ۱۸۵۰ء، ص ۸، بلاری

۴۹۰ علمِ جراحی، تارا چند، ۱۸۵۴ء، ص ۷۶، علی گڑھ

۴۹۰ علمِ طب، ۱۸۴۷ء، ص ۱۷۴، دہلی

۴۹۱ مظہر العجائب، فخر الدین احمد، ۱۸۴۸ء، ص ۱۹۲، آگرہ

۴۹۱ دایہ گری، محمد یار خاں، ۱۸۵۶ء، ص ۱۹۳، آگرہ

۴۹۴ میزان الطب، محمد حسن علی خاں، ۱۸۵۲ء، ص ۲۵۰، دہلی

۴۹۳ مجرباتِ وبائی، مظہر علیخاں، ۱۸۴۳ء، ص ۲۴، مدراس، ہیضہ کا علاج

۴۹۶ طبِ نبوی، اکرام الدین، ۱۸۵۱ء، ص ٦٧، کانپور

۴۹٦ رسالہ چیچک، ایچ ای میکلین، ۱۸۵۷ء، مدراس

۴۹٦ ام الصبیان، محمد حسین، ۱۸۵۲ء، ص ۴۷، دہلی، دایہ گری و علاج اطفال

۴۹٦ اصول فن قابلہ، ای بیلغور، ۱۸۵۲ء، ص ۴۲٦، مدراس

ڈاکٹری:

۵۰۴ اناٹمی یعنی تشریح، ۱۲۷۳ھ، ص ۵۱۱، قلمی

۵۰۵ تشریح الاجسام، ڈاکٹر میر فضل علی، ۱۸۴۷ء، ص ۱۸۴

عروض و فلسفہ شاعری:

۵۳۳ حدایق بلاغت، امام بخش صہبائی، ۱۸۴۳ء، ص ۱۷۴، دہلی

۵۳۳ عجالتہ العلالہ، کریم الدین، ۱۸۴۵ء، دہلی

مثنوی:

۵۴۲ مثنوی سراپائے سوز، قاضی محمد صادق خاں، ۱۸۴۱ء، ص ۱۸، لکھنؤ

۵۴۳ مثنوی نل دمن، کالی پرشاد، ۱۸۴۵ء، ص ۵۰، دہلی

۵۴۳ ناز و نیاز، غلام علی خاں راسخ، ۱۸۰۵ء، ص ۱٦، کانپور

۵۴۳ مظہر العجایب، سعادت یار خاں رنگین، ۱۸۴۰ء، ص ۲٦، لکھنؤ

۵۴۵ افسانہ لیلیٰ و مجنوں، میر محمد حسین تجلّی، ۱۸۴۴ء، ص ۱۲۰، دہلی

۵۴۵ چار باغ، سعادت خاں رنگین، ۱۸۵۷ء، ص ۸، دہلی

۵۴۵ داغ دل، دینا ناتھ، ۱۸۴۰ء، ص ۲۵، دہلی

۵۴۶ دستور النصیحت، منشی احمد علی، ۱۸۴۹ء، ص ۸۴، کانپور

۵۴۶ گلدستہ نرگس، یار محمد خاں شوکت، ۱۸۵۳ء، ص ۱۰۰، کانپور

۵۴۶ گلزارِ نسیم، دیا شنکر نسیم، ۱۸۴۷ء، ص ۴۵، لکھنؤ

۵۴۶ ہشت گلزار، شاہ حسین خاں حقیقت، ۱۸۵۱ء، ص ۱۰۸، لکھنؤ

۵۴۶ ایجادِ رنگین، سعادت یار خاں رنگین، ۱۸۴۶ء، ص ۲۶، لکھنؤ

۵۴۷ لیلیٰ و مجنوں، محمد تقی خاں ہوس، ۱۸۴۴ء، ص ۷۹، کانپور

۵۴۷ لیلیٰ و مجنوں، ولی محمد نظیر، ۱۸۵۱ء، ص ۲۰، دہلی

۵۴۷ لختِ جگر، بالمکند بے بصر، ۱۸۵۰ء، ص ۱۳۰، اندور

۵۴۹ قصہ شاہ روم، ۱۸۵۰ء، ص ۳۴، دہلی

۵۴۹ قصہ یوسف زلیخا، مولوی قاسم علی فگار، ۱۸۴۷ء، ص ۲۱۲، بمبئی

دیوان:

۵۶۶ کلیاتِ میر تقی، محمد تقی میر، ۱۸۱۱ء، ص ۱۰۸۵، کلکتہ

۵۷۲ میر جعفر زٹلی، ۱۸۵۳ء، ص ۱۲۰، دہلی

۵۷۳ دیوانِ حیا، مرزا رحیم الدین حیا، ۱۸۵۲ء، ص ۲۰۲، دہلی

۵۷۳ دیوان مسکین، ۱۸۵۷ء، ص ۱۹۶، مدراس

۵۷۴ دیوانِ رند، نواب سیّد محمد خاں رند، ۱۸۵۱ء، ص ۲۱۶، کانپور

۵۷۴ دیوانِ شاہدی، کرامت علی خاں، ۱۸۵۰ء، ص ۲۱۲، دہلی

۵۷۵ دیوانِ ولی، ولی اللہ ولی، ۱۸۳۴ء، پیرس

مجموعہ نظم:

۵۸۸ عاشق نامہ، ولی محمد نظیر، ۱۸۵۲ء، ص ۲۴، کانپور

۵۸۹ باغ نو بہار، غلام محمد خاں، ۱۸۵۱ء، ص ۹۲، مدراس

۵۸۹ بہارستان، ۱۸۴۶ء، ص ۲۵۶، لکھنؤ

۵۹۰ بارہ ماسہ، کاظم علی، ۱۸۱۲ء، ص ۱۲، کلکتہ

۵۹۳ چرکین نامہ، ۱۸۵۲ء، ص ۸، دہلی

۵۹۵ جواہر منظوم، غلام مولا، ۱۸۴۹ء، ص ۱۲، الٰہ آباد

مرثیے:

۶۰۰ چہار دہ مجلسِ دلپذیر معروف تاریخ الامیہ، سیّد وزیر حسین رضوی، ۱۲۳۴ھ، ص ۳۲۰، نولکشور، لکھنؤ

۶۰۰ خلاصۃ المصائب، مولوی مرزا محمد ہادی، ۱۲۳۴ھ، ص ۴۴۲، نولکشور، لکھنؤ

۶۰۴ دہ مخزن، حکیم نصر اللہ خاں، ۱۲۵۲ھ، ص ۱۷۴، نولکشور، لکھنؤ

قانون:

۶۱۳ احکامِ ملکی، ۱۸۵۰ء، مدراس، سول سرکلر گورنمنٹ، مدراس

۶۱۳ حالاتِ دیہی، جمال الدین حسن، ۱۸۵۰ء، ص ۱۳۹، آگرہ

۶۱۴ ہدایت نامہ بندوبست، ۱۸۴۹ء، ص ۱۴۰، آگرہ

۶۱۴ ہدایت نامۂ مال گزاری، ۱۸۴۸ء، آگرہ

۶۱۴ ہدایت نامہ پیشکارانِ پرتال، ۱۸۵۰ء، ص ۶، لاہور

۶۱۵ ہدایت نامہ تحصیلدار، ۱۸۵۰ء، ص ۶، لاہور

۶۱۵ ہدایت نامہ ترتیب دفتر، بہاری لال، ۱۸۵۴ء، ص ۴۴، لاہور

۶۱۵ اصول قواعد اخلاق، رام کرشن، ۱۸۴۰ء، ص ۲۴۷، دہلی

۶۱۵ اصول قوانین ممالک، ترجمہ رام کرشن، ۱۸۴۴ء، ص ۳۶۰، دہلی

۶۱۵ اصول سرکاری محاصل، ترجمہ رام کرشن، ۱۸۴۵، دہلی

۶۱۵ احکامِ ملکی، ۱۸۵۰ء، مدراس

۶۱۶ دستور العمل ایمنان، ولیم وینارڈ، ۱۸۵۰ء، ص ۲۴، لاہور

۶۱۷ ہدایت نامہ بندوبست، ۱۸۴۹ء، ص ۱۴۸، آگرہ

۶۱۷ ہدایت نامہ مالگزاری، دی میسور، ۱۸۴۸ء، لاہور

۶۱۸ اصولِ گورنمنٹ، سر جی۔ نارٹن، ۱۸۴۵ء، ص ۱۵۵، دہلی

۶۸۱ اصولِ قانون، ترجمہ رام کرشن، ۱۸۴۵ء، ص ۴۴۰، دہلی

۶۱۸ قانونِ دیوانی، ۱۸۵۰ء، ص ۵۲، سیالکوٹ

۶۲۰ منودھرم شاستر، لچھمن پرشاد، ۱۸۵۲ء، ص ۴۶، بریلی

۶۲۱ عروس المومنین، محمد قطب الدین، ۱۸۴۹ء، ص ۹۷، نکاح ثانی بیوگان

۶۲۱ فقہ الاکبر و وصیت نامہ، محمد سعد اللہ، ۱۸۴۳ء، ص ۲۲، لکھنؤ، از کتاب ابوحنیفہ

۶۲۱ فقہ احمدی، قدرت احمد، ۱۸۴۷ء، ص ۹۰، دہلی

۶۲۱ علم الفرائض، محمد عنایت احمد، ۱۸۴۷ء، ص ۱۹، لکھنؤ

۶۲۲ مشکلات الفقہ، ۱۸۵۰ء، ص ۳۲، کانپور

۶۲۳ رسالہ نکاح، مصنفہ محمد باقر مجلسی، ترجمہ محمد حسین، ۱۸۲۸ء، ص ۱۰، دہلی

۶۲۳ اصولِ قوانینِ محمدی، علماء دہلی کالج، ۱۸۴۳ء، ص ۲۱، دہلی

قواعدِ فوج:

۶۲۵ مفتاح الظفر، ایچ۔ سیموئیل، ۱۸۵۴ء، ص ۱۵۸، بنارس

علمِ منطق:

۶۲۸ اصول منطق، مولوی سیّد محمد، ۱۸۴۴ء، ص ۵۳، دہلی، شمسیہ کا ترجمہ

۶۲۹ اصول منطق، سیّد محمد، ۱۸۴۴ء، ص ۵۳، دہلی، ترجمہ شمسیہ

علم زبان:

۶۴۳ فائض المعانی، حافظ عمر دراز، ۱۸۰۷ء، ص ۱۴۴، مطبع پنجاب لاہور، گلاب سنگھ مفید عام لاہور

۶۴۳ فائض البیان، حافظ عمر دراز، ۱۸۰۷ء، ص ۶۰، مطبع پنجاب لاہو، گلاب سنگھ مفید عام لاہور

۶۴۳ گلدستۂ گفتار، شیر محمد خاں ایمان، ۱۲۶۱ھ

علم الاقتصاد:

۶۵۳ اصول پولٹیکل اکانمی، ترجمہ وزیر علی، ۱۸۴۴ء، ص ۱۸۴، دہلی، مل کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

۶۵۳ توقیعاتِ کروی، سیّد عبداللہ، ۱۸۵۴ء، ص ۱۴۳، آگرہ، فارسی کی کتاب از جلال الدین طباطبائی کا ترجمہ

۶۵۳ اصول علم انتظام مدن، دھرم نرائن، ۱۸۴۶ء، ص ۲۱۰، دہلی

تمدن:

۶۵۷ اقبال فرنگ، نواب اقبال الدولہ بہادر، ۱۸۳۴ء، ص ۱۹۷، کلکتہ

۶۵۹ صراط المستقیم، منشی دیوان چند، ۱۸۵۰ء، ص ۲۵، سیالکوٹ

۶۵۹ تنبیہہ الغافلین، منشی ہرسکھ رائے، ۱۸۵۳ء، ص ۲۴، لاہور

جغرافیہ:

۶۶۱ مراۃ الاقالیم، ۱۲۵۵ء

۶۶۲ مراۃ الاقالیم، ۱۲۵۵، مطبع سرکاری شمس الارا۔ یہ کتاب بعہد حضرت نواب میر

فرخندہ علیخاں بہادر تالیف ہوئی۔ مصنف نے اپنا نام نہیں لکھا۔ ایک جلد کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔

۶۷۲ فتح گڑھ نامہ، کالی رائے، ۱۸۴۸، ص ۲۰۸، دہلی

۶۷۳ حالات موضع دھن گاؤں، عماد علی، ۱۸۵۳ء، ص ۱۷، آگرہ

۶۷۳ علم جغرافیہ، میر غلام علی، ۱۸۵۱ء، ص ۲۲۰، کلکتہ

۶۷۴ علم جغرافیہ ضلع بریلی، گنگا پرشاد، ۱۸۵۲ء، ص ۶۷، آگرہ

۶۷۳ جغرافیہ، ۱۸۵۲ء، ص ۱۰۹، دہلی

۶۷۵ جغرافیہ کا پہلا رسالہ، میر غلام علی، ۱۸۵۲ء، مدراس

۶۷۵ خلاصہ علم الارض، ۱۸۲۴ء، ص ۱۴۷، کلکتہ

۶۷۶ خلاصۃ الجغرافیہ، ۱۸۴۵ء، ص ۱۰۴، آگرہ

۶۷۶ مراۃ الاقالیم، ۱۸۳۶ء، ص ۱۸۴، کلکتہ

۶۷۸ تقویم البلدان، ۱۸۵۰ء، پورٹ بلیر

۶۷۸ اصول علم جغرافیہ، منولال، ۱۸۵۰ء، ص ۱۴۵، آگرہ

علم طبعیات و برق:

۶۸۴ رسالہ فی خواص الاجرام والفنون، لیفٹیننٹ میکائیل، ۱۲۴۸ھ

۶۸۸ اصول علم طبعی، اجودھیا پرشاد، ۱۸۲۸ء، ص ۱۶۹، دہلی

۶۸۹ بجلی کی ڈاک، جے۔ڈبلیو۔بل، ۱۸۵۴ء، ص ۳۲، آگرہ

۶۸۹ حقائق الموجودات، داسی دھر، ۱۸۵۲ء، ص ۹۶، آگرہ

۶۹۰ رسالہ مقناطیس، سیّد کمال الدین، ۱۸۵۰ء، ص ۲۷، دہلی

علمِ ہئیت :

۶۹۴ مفتاح الافلاک، عبدالسلام لکھنوی، ۱۸۴۶ء، کلکتہ، ترجمہ کتاب فرگیوسن، ترجمہ شرح چغمنی

۶۹۴ شمس الہیت، شاہ علی، ۱۲۶۰ھ

۶۹۴ مفتاح الافلاک مریم، مریم، ۱۲۵۷ھ

۶۹۴ رسالہ اعمال کرہ، جوزف رتن ناتھ، ۱۲۵۵ھ

۶۹۴ ستہ شمسیہ، شمس الامراء فخر الدین خاں، ۱۲۷۲ھ

۶۹۵ فالنامہ، ۱۸۵۳ء، ص ۳۷

۶۹۵ خلاصہ نظام شمسی، امراؤ سنگھ، ۱۸۵۲ء، ص ۴۴، آگرہ

۶۹۶ مفتاح الافلاک، ترجمہ عبدالسلام، ۱۸۳۳ء، ص ۴۷۵، کلکتہ

۶۹۶ مختصر اصول نظامِ شمسی، ۱۸۴۰ء، ص ۵۱، آگرہ

۶۹۶ مختصر دقائق النجوم، لکشمی نرائن، ۱۸۴۷ء، ص ۲۶، بریلی

۶۹۶ دقائق النجوم، رائے صاحب، ۱۸۴۸ء، ص ۱۲، مدراس

۶۹۶ اصول علم ہئیت، پنڈت اجودھیا پرشاد، ۱۸۴۸ء، ص ۴۰۵، دہلی

کھیل تماشے :

۷۰۱ گنھار پھیری، نصیر اللہ خاں، ۱۸۵۳ء، ص ۱۷، علی گڑھ

۷۰۳ رسالہ معرکہ آرا، خواجہ احمد علی، ۱۸۴۸ء، ص ۱۵۳، لکھنؤ۔ بھالہ و برچھا استعمال کرنے کا طریقہ

صنعت و حرفت :

۷۱۶ بخار کی کل، اسوارا لالہ، ۱۸۵۵ء، ص ۱۰، بنارس، اسٹیم انجن کا بیان

۷۱۶ نور النواظیر ، احمد علی، ۱۸۵۴ء، ص ۲۴، کانپور، علم نظر

۷۱۶ قانون الانطباع، ستیل سنگھ، ۱۸۴۸ء، دہلی، فنِ طباعت

۷۱۶ رسالہ آتشبازی، محمد عمر خاں از کتاب میر عباس، ۱۸۵۶ء، ص ۱۶، دہلی۔ فارسی سے ترجمہ کیا گیا۔

۷۱۶ تیاری سڑک، جے۔ڈی۔ سنڈیمان، ۱۸۵۴ء، ص ۶۴، الٰہ آباد

۷۱۷ رسالہ جات تھومسن سول انجینئرنگ کالج، ترجمہ منولال، ۱۸۵۱ء، ص ۵۱، آگرہ

۷۱۷ اصول نقاشی، سداسکھ لال، ۱۸۵۴ء، الٰہ آباد

عملیات:

۷۲۳ سوگیتی، ۱۸۵۴ء، بنارس

۷۲۳ تعبیر نامہ خواب، ۱۸۵۰ء، ص ۴۰، آگرہ

۷۲۳ تحرک الاعضاء، سیّد احمد علی، ۱۸۵۰ء، آگرہ

۷۲۳ تحرک النفس، سیّد احمد علی، ۱۸۵۰ء، ص ۴۲، آگرہ

علمِ نباتات، زراعت، باغبانی وغیرہ:

۷۴۷ توصیف زراعت، کلب حسین خاں، ۱۸۴۸ء، ص ۲۷۰، آگرہ

۷۴۸ چاء لگانے کی ترکیب، ۱۸۵۴ء، ص ۱۷، لاہور

۷۴۸ پند نامہ کاشت کرن، مولی لال، ۱۸۵۲ء، ص ۲۴، آگرہ

۷۴۹ ریشم کا کیڑا، ترجمہ موتی لال، ۱۸۵۳ء، ص ۶۲، لاہور

۷۵۴ عجائباتِ روزگار، رام چندر، ۱۸۴۷ء، ص ۱۹۸، دہلی

لغات زبان اُردو:

۷۶۲ لغات السعید، ۱۸۴۵ء، ص ۱۶

۷۶۳ مفتاح اللغات، سیّد محمد، ۱۸۵۱ء، دہلی

۷۶۳ نصاب غریب، سیّد احمد علی، ۱۸۵۰ء، ص ۳۶، آگرہ

حرف ونحو:

۷۶۹ قواعد صرف نحو، احمد علی، ۱۸۴۵ء، ص ۲۲، دہلی

۷۶۹ قواعد زبان اُردو، گلکرسٹ صاحب، ۱۸۲۰ء، ص ۱۸۱، کلکتہ

تعلیم النسواں:

۷۹۴ زینت المصل، کرامت علی جونپوری، ۱۸۴۲ء، ص ۲۰، کلکتہ

انشاء:

۸۰۹ منتخباتِ انشاء خلیفہ، ترجمہ قمر الدین خاں، ۱۸۵۵ء، ص ۱۲۰، آگرہ، ترجمہ اُردو

۸۰۹ منتخابِ ابوالفضل، ترجمہ قمر الدین خاں، ۱۸۵۶ء، ص ۳۶۶، آگرہ، ترجمہ اُردو

۸۰۹ منتخبات رقعاتِ عالمگیری، ترجمہ قمر الدین خاں، ۱۸۵۵ء، ص ۷۷، آگرہ، ترجمہ اُردو

۸۱۰ عرایض وخطوط، ۱۸۴۶ء، ص ۱۳۵، مدراس

۸۱۰ ہدایت المعلمین، محمد نور اللہ خاں، ۱۸۵۹ء، ص ۳۵، میرٹھ

۸۱۰ انشائے حرفہ افروز، قمر الدین خاں، ۱۸۵۲ء، ص ۶۴، آگرہ

۸۱۱ انشاء اُردو، چرنجی لال، ۱۸۴۶ء، ص ۵۵، آگرہ

مزید براں جن کتابوں کا علم ہوا ہے، ان میں انشائے اردو، نسخہ مفید الحساب، اصول قواعد مالیات، ناپ تول، پٹواری کی کتاب، رسالہ ڈاک بجلی، تذکرہ سکندر اعظم، رسالہ تعلیم النفس، دستور النصیحت اور مظاہر حق شامل ہیں۔ ان کی تشریح وتفصیل یوں ہے۔

۱۔ **انشائے اردو:** حسب الارشاد جناب معلّٰی القاب نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی شمال و بمنظوری۔ جناب ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی کے منشی چرنجی لال نے واسطے استعمالِ مدارس کے سنہ ۱۸۴۶ء میں تصنیف کی۔

الہ آباد گورنمنٹ پریس میں چھاپی گئی	۱۸۷۵ء
بار	چہارم
تعداد	۱۰،۰۰۰

اس سے پہلے آگرہ میں ۱۸۵۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ٹائپ میں ۳۲ صفحات پر ہے۔ تقلیع صغیر۔ آخر میں قطعۂ تاریخ یہ ہے:

لکھی میں نے ایسی یہ انشا کہ جو
دبیروں کو از بس وہ مرغوب ہے
کہا غیب نے سرجیل آ (کذا)
یہ انشائے اردو بنا خوب ہے

۱۲۶۱ ہجری

۲۔ **نسخہ مفید الحساب بمطبع کبریٰ شاہ ابوتراب:** باہتمام سید امیر علی طبع شد، آغاز: ستائش معکاثر و نبائش متوافر محاسبے را زیبا است ...'' مصنفہ سید محمد بخش شائق مستوجہ از سید امداد علی صاحب۔ جلد اول میں ہے خاتمۃ الطبع سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کتاب پہلی بار مطبع کبریٰ عظیم آباد ضلع پٹنہ میں بتاریخ یکم صفر ۱۲۷۱ھ میں طبع ہوکر شائع ہوئی۔ آخر کتاب میں قطعۂ تاریخ تصنیف از مصنف ہے۔ جس سے ۱۲۷۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ کل صفحات ۳۰ سائز صغیر۔

۳۔ **اصول قواعد مالیات:** کا ترجمہ پنڈت اجودھیا پرشاد مدرسہ دہلی نے کیا۔

دہلی اردو اخبار پریس مکان متعلقہ امام باڑہ وقفی مولوی محمد باقر صاحب میں باہتمام بندہ محمد حسین پرنٹر پبلشر کے ۱۸۵۰ء میں چھاپا گیا۔ خطِ نستعلیق۔ اشکال۔ صفحات ۲۴۵ ملحقہ ۸ صفحات مشتمل نقشہ وزن مخصوص مملوکہ محمد حلیم صاحب مالک مکتبہ خاور چوک مینار لاہور۔

۴۔ **ماپ تول:** جناب نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی کے حکم سے رائے رام سرنداس ڈپٹی کلکٹر دہلی نے تالیف کی۔ مطبوعہ لاہور۔ مطبع کوہ نور میں منشی ہرسکھ کے اہتمام سے چھاپی گئی۔ ۱۸۵۱ء

۵۔ **پٹواری کی کتاب:** جناب نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی کے حکم سے رائے رام سرنداس ڈپٹی کلکٹر دہلی نے تالیف کی۔ کلکتہ باپتست مشن کے چھاپے خانے میں چھاپی گئی۔ ۱۸۴۵ء

۶۔ **رسالہ ڈاک بجلی:** حسب ارشادِ نواب لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی منشی بلدیو بخش وزیٹر مدارس آگرہ نے صاحب وزیٹر جنرل بہادر ممالک مغربی کے سررشتہ میں عوام کی آگاہی کے لیے تصنیف کیا۔ سکندرہ کے چھاپہ خانہ میں بمقام اکبرآباد ۱۸۵۴ء میں مطبوعہ ہوا۔ تقلیع صغیر ص ۸۔ قیمت ۶ روپے۔

۷۔ **تذکرہ سکندرِ اعظم:** جس کو پنڈت سیروپ نارائن اسکالر اعلیٰ مدرسہ دہلی نے ۱۸۴۶ء میں زبان انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ مطبع العلوم مدرسہ دہلی میں باہتمام سید اشرف علی ۱۸۴۷ء میں چھپا۔ صفحات ۱۵۳

۸۔ **رسالہ تعلیم النفس:** حصہ اوّل۔ ترجمہ منشی چرنجی لال مطبع اکبرآباد ۱۸۵۳ء۔ دوم اکبرآباد ۱۸۷۳ء

۹۔ دستور النصیحت: (۱۲۵۹ھ) (اردو مثنوی) مصنفہ منشی احمد علی رسا۔ مطبوعہ مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خاں محلّہ ٹپکا پور کاہنہ پور اہتمام طباعت ۲۰ ربیع الاوّل ۱۲۶۶ھ صفحات ۸۴۔ حوض و حاشیہ پر سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک روز چند آشنا کہنے لگے کہ ایجاد رنگین خوب ہے تو بھی ایک مثنوی اسی طرز کی تحریر کر۔ اسی تعمیل میں یہ مثنوی لکھی گئی۔

۱۰۔ مظاہر حق: اردو ترجمہ مشکوۃ شریف از مولانا محمد قطب الدین خاں صاحب۔

جلد اوّل: ''بفرمائش جناب مولوی سبحان بخش صاحب ۱۲۶۸ ہجری بار دوم در فخر المطابع باہتمام نیاز احمد آغاز طبع گرفت۔'' تقطیع کلاں۔ صفحات ۲۸۴۔

جلد دوم: ''بمطبع سلطانی در ماہ محرم الحرام ۱۲۷۳ھ مطبوع شدہ'' صفحات ۸۴۴ خاتمہ: ''کتبہ اضعف العباد محمد بخش از کمترین تلمیذان سید امیر رضوی سلہم ربہم ۱۲۷۳ ہجری۔''

جلد سوم: صفحات ۸۱۹ قدرے ناقص الآخر۔ سرورق غائب۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مطبع اردو اخبار میں چھپی ہے اور طباعت ۱۸۵۷ء سے پہلی ہے۔

جلد چہارم: صفحات ۸۱۳ کرم خورہ۔ سرورق غائب۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مطبع اردو اخبار میں ۱۸۵۷ء سے قبل چھپی ہے۔

تتمہ جلد چہارم: در شہر شعبان ۱۲۶۷ ہجری نبوی بسعی احقر العباد نیاز احمد فخر افزائے فخر المطابع شد۔'' صفحات ۲۸۸۔ خاتمۃ الطبع اتمام طباعت ۲۸/ جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ ہے۔

تتمہ جلد چہارم: در شہر شعبان ۱۲۶۷ھ نبوی بسعی احقر العباد نیاز احمد فخر افزائے فخر المطابع شد۔'' صفحات ۲۸۸، خاتمۃ الطبع اتمام طباعت، ۲۸/ جمادی الثانی

۱۲٦۸ھ ہے۔

خاتمۃ الطبع میں لکھا ہے کہ اس کی چار جلدیں اُردو اخبار میں مولوی باقر صاحب کے اہتمام سے چھپی تھیں، لیکن چوتھی ناتمام تھی۔ مولوی قطب الدین صاحب مترجم کے ارشاد پر یہ تکمل اس مطبع میں چھپا تا کہ اُردو اخبار والا نسخہ مکمل ہو جائے۔

لیاقت نیشنل لائبریری، کراچی میں موجود ۱۸۵۷ء، سے قبل کی اُردو مطبوعات کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ کلیاتِ میر مطبوعہ ۱۸۱۱ء: ''کلیاتِ میر تقی مدرسہ عالیہ کے لیے نوازش و تفصلات سے صاحبان عالی شان کالج کونسل کے عہدِ حکومت میں زبدہ نوئیسان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان لارڈ منٹو گورنر جنرل بہادر دام ظلہہ کے حسبِ الارشاد کپتان ٹیلر صاحب مدرس ہندی دام اقبالہ اور اعانت و پرورش سے ڈاکٹر ولیم ہنٹر صاحب دام حشمتہ اور عنایت اکرام سے کپتان کا لویصاحب دام ثروتہ اور مرحمت و امداد سے کپتان ٹامس روبک صاحب دام افضالہ کی بتصحیح۔ مرزا کاظم علی جواں اور مرزا جان طپش و مولوی محمد اسلم و تاریخرن سرو منشی غلام اکبر ۱۸۱۱ء، عیسوی میں مطابق ۱۲۲٦ھ ہندوستانی چھاپے خانے میں چھاپا کیا ہوا منشی مراد بخش کا۔'' (نستعلیق ٹائپ میں ہے) صفحہ ۱۰٦۹ پر متن ختم ہو جاتا ہے۔ صفحہ ۱۰۷۰ سے صفحہ ۱۰۷۳ تک فہرست کلیاتِ میر تقی میر کے عنوان سے مطالب درج ہیں۔ صفحہ ۱۰۷۳ کے آخر سے ہی غلط نامہ شروع ہوتا ہے جو صفحہ ۱۰۷۵ تک جاتا ہے، اسی صفحہ پر خاتمہ ہے۔ کتاب کی دوسری جانب انگریزی میں بھی ٹائٹل دیا ہے۔ کلیاتِ میر کی اشاعتیں لکھنؤ سے ۱۸٦۷ء اور ۱۸۷۸ء، میں بھی ہوئیں (لیتھو)۔

میر تقی کا انتقال ۱۲۲٦ھ میں ہوا۔ کلیات کے علاوہ میر صاحب کے مراثی کا

ایک مجموعہ بھی ہے جس کا ایک نسخہ پروفیسر سیّد مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ان مراثی کو مسیح الزماں صاحب نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

میر تقی میر کا ایک فارسی دیوان بھی ہے جو آج تک طبع نہیں ہوا۔(۱۰) لیکن مخطوطات کی صورت میں موجود ہے۔ میر تقی کے مراثی اور تین مثنویاں کلیاتِ میر میں شائع نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان چیزوں کو بھی اپنے کلیات میں شامل کر دیا ہے اور ماخذ کے لیے سیّد مسعود حسن رضوی، مسیح الزماں صاحب اور ڈاکٹر گیلانی چند کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غیر مطبوعہ مثنویوں میں تین مثنویاں اپنے کلیات کے صفحہ ۱۱۲۸ سے ۱۱۵۴ تک تحریر کی ہیں۔

پہلی مثنوی کا عنوان ''مثنوی'' ہے اور آغاز یہ ہے:

ہے غبار وادی وحدت جہاں　　　کثرت اعیان ہو گئی اب عیاں

اس مثنوی میں صرف ۴۱ شعر ہیں۔

دوسری مثنوی کا عنوان ''مورنامہ'' جس کا آغاز یہ ہے:

دشت سے بستی میں آیا ایک مور
زور تھا واں حسن کا رانی کے شور

یہ طویل مثنوی ہے۔ آخری تیسری مثنوی کا عنوان ''مثنوی'' ہے جس کا آغاز یہ ہے:

خدا ایک فرقہ میں مانا ہے عشق
کہ نظم کل ان سب نے جانا ہے عشق

۲: قصہ خسروانِ عجم: صفحہ اوّل پر یہ عبارت ہے:

''یہ منظوم موسوم بقصہ خسروانِ عجم، ترجمہ تمام شاہ نامے کا ہے۔ بطورِ اختصار

کے اُردو زبان میں۔ نام مترجم کا مول چند لکھنوی اور تخلص اس کا منشی ہے۔ بندہ احقر غلام حیدر ساکن ہوگلی نے اس کتاب فوائد انتساب کو ۱۲۶۲ھ قدسی میں مطابق سنہ ۱۸۴۶ عیسوی کے کلکتے کے درمیان عہد حکومت میں زبدہ نوئینان عظیم الشان اشرف الامراء نواب گورنر جنرل سرہنری بارڈنگ بہادر دام اقبالہ کے حسبِ ایماء جناب گردوں رکاب معدن ذہن و ذکا مخزن جود و عطا صاحب السیف والقلم و المناقب عالی کپتان جارج کرنیل مارشل بہادر کے اسکول و مدارس کے اُردو آموز طلباء کی سیر کے لیے چھاپا گیا۔''

تمام کتاب نستعلیق ٹائپ میں ہے۔ ابتدائی ۱۲ صفحات پر فہرستِ مضامین ہے۔ اس کے بعد ۵۹۲ صفحات پر متن ہے۔ آخر میں چار صفحات کا غلط نامہ ہے۔ صفحہ ۵۹۲ پر خاتمہ بایں الفاظ ہے:

''الحمد اللہ کہ اُردو شاہنامہ منظوم جس کا نام خسروانِ عجم ہے رجب کی انتیسویں تاریخ ۱۲۶۲ھ قدس مطابق ۱۸۴۶ عیسوی کے درمیان مطبع طبی میں مولوی عبداللہ صاحب کے اہتمام سے عاصی پر معاصی غلام حیدر ساکن ہوگلی کے اور اعانت و تصحیح سے مولوی احمد علی صاحب گوپاموی سے تمام چھپ چکی۔ جو شخص اس کتاب کو بلا مہر حاجی غلام حیدر کے پاوے خرید نہ کرنے اور مہربانی کی راہ سے اس کی خبر عاصی کو پہنچا دے۔ فقط''

۳۔ تاریخِ افغانستان: صفحہ اوّل پر یہ عبارت ہے:

''تاریخِ افغانستان، جس میں ملک سندھ کی حقیقت بھی داخل ہے۔ مرتب کی ہوئی میر اشرف علی بانی مجمع الاخبار کی۔ فضل الدین کھمکر کے چھاپے خانے میں ۱۲۶۱ ہجری مقدسہ مطابق ۱۸۴۵ عیسویہ دارالحکومت بمبئی میں چھاپی گئی۔''

اس صفحہ اوّل کی پشت پر انگریزی میں بھی ٹائٹل ہے۔

مصنف کا پورا نام سیّد عبدالفتاح عرف میر اشرف علی گلشن آبادی ہے جو ہفتہ وار مجمع الاخبار کا مدیر بھی تھا۔ مصنف نے دیباچہ میں سببِ تصنیف بیان کرتے ہوئے اپنے ماخذات کا ذکر کیا ہے، جن میں تاریخِ افغانستان مصنفہ سیّد فدا حسین جمعدار ترکسوار بزبانِ اُردو مجموعہ دہلی و تاریخِ افغانستان مترجمہ شیخ ذوالفقار الدین جونپوری (اُردو ترجمہ از فارسی منظوم تاریخِ افغانستان) و دیگر تاریخہائے افغانستان، مختلف اخبارت ہیں۔ دراصل مصنف نے مرقومہ مابعد دونوں تاریخوں کو ان کے مؤلفین کے الفاظ میں مرتب کر دیا ہے۔ چھوٹے سائز کی کتاب ہے۔

۴۔ پنج رسالہ منظوم:

(۱) احکام الایمان، (۲) تنبیہہ بے نمازاں، (۳) موضح البدعات و الکبائر، (۴) معاصی کبیرہ منظوم، (۵) شرح عقد انامل، مطبوعہ مطبع نظامی، کانپور، ۱۲۷۳ھ

(۱) رسالہ احکام الایمان اوّلین ۱۰ صفحات پر ہے، در بیان عقائد مع ترجمہ پنج کلمہ وسیّد الاستغفار، تصنیف مولانا عبدالواجد رامپوری۔

(۲) رسالہ مع صفحہ ۱۱ سے ص ۱۶ تک ہے، مصنف نامعلوم۔

(۳) رسالہ سوم، موضح الکبائر والبدعات والرسوم۔ یہ نثر میں ہے۔ صفحہ ۱۷ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۲۰ پر تمام ہو جاتا ہے۔

(۴) رسالہ چہارم منظوم گناہ کبیرہ، عبدالرحیم آرندی نے راہِ نجات مصنفہ مولوی رفیع الدین کو نظم کر دیا ہے۔

یہ صرف دو صفحات ۲۱، ۲۲ پر ہے۔ یہ نثر میں ہے اور اس کے مصنف عبدالرحمٰن شاکر ہیں۔ یہ شرح ہے، رسالہ مصنفہ مولوی رفیع الدین محدث دہلوی کی۔

جملہ رسالے مطبع نظامی کانپور، ۶ر جمادی الاولیٰ ۱۲۷۳ ہجری۔

۵۔ **دیوانِ مہر (آغا علی خاں):** صفحہ اوّل پر یہ عبارت خوش خط لوح میں ہے:

''بعونہ مکانی دیوان لال جناب مستطاب معلیٰ القاب نواب امین الدولہ سیف الملوک سیّد آغا علیخاں بہادر، فیروز جنگ متخلص مہر، خلف کلاں جناب علیین مآب نواب معتمد الدولہ، مختار الملک سیّد محمد خاں بہادر، ضیغم جنگ در ۱۲۶۳ ہجری حلیہ طبع پوشید۔''

اسی سرورق پر قطعۂ تاریخ بھی ہے، جس سے ۱۲۶۳ھ نکلتے ہیں۔ صفحہ ۲ سے غزلیات بالتزام ردیف شروع ہوتی ہیں۔ صفحہ ۴۰۱ پر غزلیات ختم ہو جاتی ہیں اور تاریخِ تصنیف میر علی اوسط رشک ہے، جس سے ۱۲۶۳ھ نکلتے ہیں۔

آخر میں کاتب کا نام ''کتبہ جعفر'' موجود ہے۔ تمام دیوان نہایت خوشخط کتابت کا ہے۔ قلم جلی ہے، صفحہ ۴۰۲ پر صحت نامہ اغلاط ہے۔

۶۔ **ہزار رسائل ہندی (نثر):** ۴۸ صفحات کا رسالہ ہے، مصنف نامعلوم۔ مطبوعہ مطبع حیدری باہتمام نور الدین جیوا خاں، ۱۲۷۳ ہجری۔

ان کے علاوہ جن کتابوں کی تفصیل نہیں مل سکی اور وہ لیاقت نیشنل لائبریری میں موجود ہیں، ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ توتا کہانی، حیدر بخش حیدری، ۱۸۵۲ء، ۱۴۶+۴۱، ایلن اینڈ کمپنی
۲۔ باغ و بہار، میر امن، ۱۸۴۹ء، ۲۵۹+۱۲۰، ایلن اینڈ کمپنی
۳۔ گنجِ خوبی، میر امن، ۱۸۴۶ء، ۴۶۲، احمدی پریس، کلکتہ
۴۔ تاریخِ افغانستان و سندھ، اشرف علی، ۱۸۴۵ء، ۳۴۰، چھاپہ فضل الدین بھکر
۵۔ گلدستۂ نازنیناں، کریم الدین، ۱۸۴۵ء، ۳۳۰، مطبع رفاہِ عام

۶۔ گلستان مترجم، ۱۲۶۶ھ، ۲۱۶، سلطان المطابع

۷۔ منتخباتِ ہندی، جان شیکسپیئر، ۱۸۴۴ء، ۱۹۶، کوکس برادرز

۸۔ غنچہ، صبا۔ میر وزیر علی، ۱۲۷۲ھ، ۲۰۰، مطبع کارنامہ لکھنؤ

۹۔ نگارستانِ جوش، ۱۲۶۹ھ، ۱۶، مطبع علوی علی بخش خاں

۱۰۔ ہندوستانی انگریزی ڈکشنری، شیکسپیئر، ۱۸۱۷ء، ۸۳۴ صفحات، لندن

۱۱۔ دیوانِ وزیر، وزیر، ۱۲۷۲ھ، ۲۴۸، مصطفائی پریس

۱۲۔ کلیاتِ آتش، آتش، حیدر علی، ۱۲۶۷ھ، ۲۹۳، کارخانہ علی بخش

۱۳۔ لوگارثم، ۱۸۵۶ء، ۸/۲۸

۱۴۔ لطائف الظر ائف اُردو، محمد صالح، ۱۲۶۵ھ، ۴۶، مصطفائی کانپور

۱۵۔ ہزار مسائل ہندی، ۱۲۷۳ھ، ۶۸، مطبع حیدری

۱۶۔ گلزارِ نسیم، نسیم۔ دیاشنکر، ۱۲۶۸ھ، ۳۴، مصطفائی

۱۷۔ نورتن، مہجور، ۱۲۶۷ھ، ۱۸۲، مصطفائی

۱۸۔ پنج رسالہ در احکام الایماں، ۱۲۶۳ھ، ۲۶، مطبع نظامی

۱۹۔ فرائض قادریہ، محمد اسمٰعیل کوکنی، ۱۲۶۱ھ، ۳۱۷، مطبع گنپت جی بن کرشنا جی بمبئی

۲۰۔ کلیاتِ میر تقی میر، میر تقی میر، ۱۸۱۱ء، ۱۰۸۵، ہندوستانی چھاپہ خانہ، کلکتہ

۲۱۔ دیوانِ مہر، مہر۔ آغا علی خاں، ۱۲۶۳ھ، ۴۰۲، ہند

۲۲۔ ترجمہ باغ و بہار (انگریزی)، ۱۸۵۲ء، ۲۵۵، سمپن کمپنی، لندن

۲۳۔ مذہبِ عشق، نہال چند، ۱۲۶۳ھ، ۱۶۱، مطبع احمدی، کلکتہ

۲۴۔ قصہ خسروانِ عجم (شاہنامہ منظوم)، مول چند منشی، ۱۲۶۲ھ، ۵۹۲، مطبع طبی، کلکتہ

۲۵۔ انتخاب کلیات سودا، سودا، ۱۸۴۷ء، ۱۱۴، مطبع اخوان الصفا، کلکتہ

۲۶۔ زبدۃ الخیال، عالم علی کرانی، ۱۲۵۶ھ، ۴۱۰، کلکتہ

۲۷۔ باغ و بہار، میر امن دہلوی، ۱۸۳۲ء، ۲۲۵، مطبع نوطرز ایشیاٹک لیتھوگرافک کمپنی

۲۸۔ توتا کہانی، حیدر بخش حیدری، ۱۸۴۱ء، ۲۰۰، مطبع سیّد رحمت اللہ مدراس

۲۹۔ انتخاب تصانیفِ ہندوستانی، اُردو دکھنی، ۱۸۴۷ء، ۹۶، امپرر اورینٹل ایم پریس

[اُردو نامہ، لاہور]

حوالے اور حواشی:

(۱) اقتباسات از تحشیہ، ص ۸۲، ۸۳، طبع دوم، آگرہ، ۱۹۵۷ء

(۲) اقتباسات از کتاب، ص ۲۶۵، ص ۲۶۶، مطبوعہ انجمن ترقیٔ اُردو، ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء

(۳) ایضاً، ص ۴۲ تا ۴۴

(۴) صحیح: گلکرسٹ [مرتبین]

(۵) ہندوستانی اخبار نویسی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں، ص ۲۳۸

(۶) اقتباسات از کتاب طبع دوم، ۱۹۴۸ء، شیخ مبارک علی، تاجر کتب، لاہور

(۷) پاکستان سے یہ سفرنامہ ۱۹۸۳ء، میں تحسین فراقی کے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ [جعفر بلوچ]

(۸) کتاب مطبوعہ نظام پریس، دکن، ۱۹۲۳ء

(۹) طبقات الشعراء میں منشی کریم الدین نے گارسیں دتاسی کی مذکورہ تاریخ سے بھرپور استفادہ کیا اور اس میں متعدد اضافے کیے، لہٰذا اسے ترجمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خود داؤدی صاحب نے بھی اپنی اس رائے سے اس مقالے کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد رجوع کر لیا تھا۔ [مرتبین]

(۱۰) ادارۂ نقوش کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکا ہے۔ [مرتبین]

Khalilur Rahman Daoodi

MUSLIM CONTRIBUTION TO MATHEMATICS

This is a brief account of the contributions made by the Muslims to science in general and Mathematics in particular during the medieval period. After tracing the state of Greek learning in an age preceding Islam the writer describes the early Muslim efforts at translating Greek works. He then goes on to describe the original contributions of Muslim scholars and scientists and repudiates the view that Muslims only acted as transmitters of Greek knowledge and did not add anything of their own.

REGULAR history of mathematics begins from 650 B.C. Famous Greek scientists' period is from 650 to the birth of Christ. The contribution of the Greeks to arithmetic, geometry, during this period, covers the high school syllabus of today. After the birth of Christ for about 650 years there was no great advancement being achieved. In this period the old pagan religion was replaced by Christianity, a religion whose most salient feature in theory was love and toleration. The custodians of religion, the priests, however so fanned flames of hatred and in-toleration amongst their flocks that they burnt the libraries at Alexanderia and other places. A Christ sect was founded in 428 A.D. by Patriarch of Constantinople. The Council of Ephesus declated them to be heretics and the persecution compelled them to migrate to Edessa in Mesopotamia.

From that place they were expelled in 489 A.D. and then they went to Persia. During those days the Sassanian King Kaikhusro Nusherwan (531-579 A.D.) was on throne. He welcomed them. The King gave shelter to the Greek scholars also who were expelled out of Athens and Alexandria by the Christian King. All those scholars centered at Junde Shapur that became a nucleus for the development of Arabic learning in later years when Persia came under Arabs.

Then comes an extraordinary grand upheaval on the peninsula of Arabia within a miraculously short period. It produced a host of brilliant scholars whose achievements we have completely forgotten today. From 750 to 900 A.D. the work of translating the Greek literature was completed. It is a false propaganda that Arabs simply translated the Greek works. The scholars of this period were not mere translators but they supplemented the originals to a very great extent and wrote their own commentaries. The translators faced many difficulties. The Greek material was incomplete. Most of the Greek works were done between 500 and 200 B.C., i.e., more than a thousand years before the search of Arabs. Today when the world is so advanced and there are so many kinds of facilities of communication, preserving of manuscripts and multiplying their copies, etc., imagine how meagre information you can gather about the manuscripts of one thousand years old. Secondly during the political disturbances in Greece all the valuable Greek works were destroyed. Thirdly the Alexandrian Library which was the only asylum of Greeks was burnt twice (in 47 B.C.) by Romans and in 642 A.D. So the Arabs worked hard in compiling the Greek works. The study of arithmetic and geometry led the Arabs to the invention of Algebra which was accomplished early in the IX century. In the connection of Muslim contribution, the following quotation from the Legacy of Islam by Sir Thomas Arnold is given:

> "The treasure-houses of Islamic science are just beginning to be opened. In Constantinople alone there were more than

> eighty mosque libraries containing tens of thousands of manuscripts. In Cairo, Damascus, Mosul and Baghdad as well as in Persia and India, there are other collections. Few have been listed, much less described or edited. Even the catalogue of the Eleorial Library in Spain, which contains a large part of the wisdom of Western Islam, is not yet completed. During the last few years the mass of material recovered has gone far to subvert our former conceptions and has thrown a flood of new light in the early history of scientific thought in the Islamic world. Thus at present even an outline of the scientific achievements of Islam can, at best, be but tentative."

Therefore, it can be said without any fear of contradiction that while Europe was immersed in the abysmal degradation of ignorance, superstition and bigotry, the Arabs were the torch-bearers of learning and enlightenment.

Jabir ibn Haiyan (777 A.D.), the greatest Arab chemist, is the earliest known astronomer. Abu Yahya (806 A.D.) translated the works of Ptolemy and constructed an astronomical table called Al-Qiyas al-Mumtanah. Muhammad ibn Musa al-Khawarsmi (845 A.D.), one of the ablest astronomers of al-Mamun, is the earliest known writer on algebra. Abu Taiyab (850 A.D.) is the first writer on trignometry. Al-Kindi, Yakub ibn Ishaq (874 A.D.) the distinguished scholar of mathematics, astronomy and natural philosophy, to him are attributed more than 200 writings on astronomy, optics, Euclid and meteorology. Al-Mahani, Muhammad ibn Isa (884 A.D.) wrote on trignometry, astronomy, solid geometry and cubic equations. Abu Mashar al-Balkhi (888 A.D.) wrote on astronomy and astrology. His astronomical treatise namely Kitab al-Makhal al-Kabir has the same scope as Ptolemy's Al-Majest. Al-Himsi (888 A.D.) translated the work of

Appalonius. Al-Sarakshi Ahmad ibn Taiyab (899 A.D.) wrote on arithmetic, algebra, astrology and astronomy.

Thabit ibn Qurra (900 A.D.) revised the Greek translations of Euclid and Ptolemy and wrote extensively on astronomy, magic-squares, astrology, amicable numbers and spherics. He is said to have invented some new propositions in geometry and is known for using algebra in geometry, being the greatest Arab geometrician.

After the completion of translation work, a period of 500 years (900-1400 A.D.) comes in which purely original kind of additions were made by the Muslims. In this period astronomy and algebra were further developed, plane trigonometry was systematized. Afterwards the Muslim mathematicians developed the spherical trigonometry. The scholars of IX century realized the need of the other branches of applied mathematics also, such as statics, optics and dynamics in which they did the elementary kind of work. The well-known mathematicians of this period are as follows:

Muslim ibn Ahmad al-laisi (908 A.D.) wrote on arithmetic and astronomy. Muhammad ibn Jabir al-Battani (929 A.D.), Governor of Syria, and the greatest Arab astronomer, first published the trigonometric ratios, and determined very accurately the obliquity of the ecliptic and wrote on orthographic projections, motions of the moon and planets. Al-Farabi, Abu Nasr (951 A.D.), the greatest philosopher of Islam, wrote on astronomy and geometry. Abul Wafa, Muhammad ibn Muhammad (998 A.D.) compiled trigonometrical tables, introduced the interval of 10 in the values of tangents and introduced sec A and cosec A and noted the relation sin (AB) sin B. He worked on plane and solid geometry also. Al-Majrit Abul Qasim Maslama (1004 A.D.) wrote on astronomy, geometry and on theory of numbers. Ali ibn Yunus (1007 A.D.) famous astronomer next to Battani. Ibn Sina Abu Ali (1037 A.D.) wrote on euclid, arithmetic and astronomy. Al-Haitham, Hasan ibn al-Hasan (1038 A.D.), author of about 200

books, wrote on algebra, geometry and astronomy; he is an authority on optics being the first writer on refraction and twilight. Al-Kirkhi, Muhammad Abu-Bakr (1039 A.D.), and first-rank algebrist, devised a neat geometrical proof for the summation of natural and solved the quadratic equations. Omar ibn Ibrahim al-Khayyam (1123 A.D.) wrote on algebra, astronomy and geometry. His solutions of the culuc and liquadratic equations with the help of conic sections is the most advanced work of Arabic mathematics; discovered Pascal's triangle, and binomial theorem and also worked on calendar. Abu Zakariya, Mohammad al-Hassar (1170 A.D.) introduced subtraction from the left side and he is the first to use horizontal line in fractions. Ibn Rushd, Abul Waheed (1198 A.D.) the greatest Arab philosopher of Spain wrote on externity of universe, planets, eclipses. He is said to have worked on spherical trigonometry and on theory of aeronautics also. Ahmad ibn Ali al-Buni (1225 A.D.) discussed a very ingenious general solution of magic squares. Muhammad Nasiruddin Tusi (1247 A.D.), an all-round scholar with a fine synthetic brain, worked on arithmetic, geometry, plane and spherical trigonometry and on astronomy. He gave a new proof of Pythagorus Theorem, made observations at Maragha in which he set up huge rings for ecliptical, solstical, equatorial armillaries purposes. Al-Banna, Ahmad ibn Muhammad (133 A.D.) wrote on algebra, arithmetic, mensuration and astronomy. His best known work is Talqis. Ali ibn Ibrahim, ibn-al-Shatir (1383 A.D.) studied the works of Tusi and wrote on trigonometry and astronomy.

After a period of 700 years there begins a rapid decline; the following are a few names that close the list of Muslim mathematicians. Jamshid ibn Masud al-Kasbi (1436 A.D.), an assistant of Ulugh Beg, wrote a short treatise on geometry, arithmetic and astronomy. Ulugh Beg (1449 A.D.) a Persian prince founded an observatory at Samarqand. The astronomical tables which were worked out under his personal directions are highly esteemed in Europe as well as in the East. Ali ibn Muhammad al-

Qalasadi (1486 A.D.) wrote on arithmetic and has shown considerable originality in his work on theory of numbers. He is the last of the great mathematicians of Spain. Muhammad ibn Maruf of Constantinople (1585 A.D.) wrote on arithmetic, algebra and spherics. Behauddin al-Amili (1623 A.D.) to the glory of the scholars of Islam, his is the only name to be found in the records. He studied the works of his predecessor and himself wrote on arithmetic and spherics.

After Behauddin Amili we do not find any Muslim mathematician of reputation who did any original work. During the last 300 years the Muslim scholars forgot the achievements of their ancestors. In XX century some Muslim mathematicians like the late Sir Shah Muhammad Sulaiman, late Dr. Sir Ziauddin Ahmad and Dr. Raziuddin Siddiqui worked on different branches of mathematics.

[The Islamic Literature, Lahore, Sept. 1953]

Khalilur Rahman Daoodi

RELIGION AND MORALITY

[In this article Mr. Khalil-ur-Rahman discusses the connection between religion and morality. We are glad that he repudiates the idea that a sound morality can be built on individual conscience. What is called conscience is nothing but the values which a particular social group upholds. Similarly, morality cannot be based on utility, simply because men do not and cannot calculate the consequences of their actions. They are impelled to satisfy their desires and if the consequences do not appear to be pleasant, they devise methods to avoid the anticipated consequences. The fact is that morality depends in nine out of ten cases on the reward or punishment which a society prescribes for specific modes of behavior. It is only exceptional men who can rise above the considerations of social reward and punishment. The ordinary man's morality is determined firstly by his own native impulses and ambitions and secondly by the fear and hope of social approval and disapproval. This is why the morality of human beings can be so easily changed by changing the standards of social approval.]

All knowledge of search can be divided into three stages observation, intellection and action. We first note

how things happen and store the impressions in our brain. Then we connect them and try to find some sequence between them: some things become the cause, others the effect and from these, we formulate a law. Then we use the knowledge. Knowledge for the sake of knowledge is a meaningless phrase, because knowledge is infinite. The British Museum has more than 20 lakhs of books: all full of knowledge, and it is utterly impossible to have all knowledge, at any rate according to our methods. We can have only that part which we need and can put into practice. So we use our knowledge - not necessarily to make money but we make use of it all the same and then perhaps we observe some fresh phenomena which suggest a new aspect of Truth, and so on. The whole process goes round and round in a circle, or rather in a spiral along which we ascend all the time. But the trinity observation intellection and action - remains there all the time.

Religion has also three aspects. First comes observation, truth as experienced by our seers and prophets, who have so kindly recorded it, for our benefit, and which we can verify for ourselves by methods laid down in religious books, if only we are prepared to take the trouble. Then comes intellection, the theories which suggest cause and effect, the various systems of philosophies; found in every religion. And lastly, comes action, the rules of conduct in the proper spirit we may get on in life much better than the philosopher. But moral laws act slowly. When a moralist is crying hoarse before asking you to be honest, you cannot help seeing hundreds of dishonest men prospering just before your eyes. The temptation to get rich like others by dishonest means is very great, and mere moral commandments are seldom powerful enough to keep a man from following a wrong path. Mere moral commandments have no sanction behind them. They are like an ultimatum to an enemy, without any army to back it up, and both are equally futile. Attempts have been made to get this sanction by postulating a "conscience." It is claimed that every man has an inner voice in him, which

tells him what is right and what is wrong, and that it should be taken as the basis of morality. People who believe in this, argue that a nation may safely commit the moral direction of the young to this inner voice or 'Conscience.' They ignore the fact that 'conscience' is a variable quantity and is coloured by communal, national and even family considerations. It is useful conditions to which the man is accustomed, but in a new set of circumstances, it entirely fails. Some of the worst crimes in the world have been committed by persons whose' inner voice failed to guide them right. No doubt, every man has a conscience, but if it happens to be the conscience of a fool, he will commit mistakes. To base a whole code of morals on individual conscience is like founding an edifice on shifting sand.

There is another school of thought which advocates that an action should be judged as right or wrong according as it leads or does not lead to the greatest good of the greatest number. They argue that every one of us is protected, guarded, educated and nurtured by the whole of humanity, which has gone before us and therefore we are bound by honour and sheer honesty to add something to these accumulations by our own labours, so that we may pass on to posterity a richer and larger legacy. It will be noticed that "honour and honesty" have here to be assumed, and where these exist a further stimulus would be unnecessary. An average man is likely to ask: "What has posterity done for me, that I should work for them?" As for present society which enables him to enjoy the fruits of his labour by maintaining law and order, he agrees to abide by the criminal procedure code but can see no reason for going beyond it. For instance, he knows that operations on the stock exchange by which a few clever men make money at the expense of hundreds of foolish and ignorant men, are a form of robbery, which causes greater suffering than burglary and yet, as long as it is legal, it does not jar on the moral sense of the average man. The weakness of the utilitarian basis lies in the fact that it fails except when you appeal to the noble-minded, to those who need it least.

These certainly will respond to it, but others feel inclined to shrug their shoulders, when they are asked to suffer for the whole of humanity.

Our wise men have for centuries past used praises and threats, rewards and punishments, suited to the age and intelligence of the adherents of each religion. Ignorance has often distorted the sure sequence of a moral law into an avenging deity; and many self-seeking and ignorant priests have no doubt at times used these truths for terrorizing the simple and timid. But a few religions of the world trained their believers into a practical and useful morality. It is said that religions have been the police of society. However, much we may dislike it, we must admit that fear - whether of jail or hell—is one of the motives which curbs the strong and greedy and spreads a shield over the otherwise defenseless victims of their rapacity.

The possibility of reward and punishment after death, is not the only motive religion offers for being moral. For those who have grown above these, all religions proclaim the unity of creation. All religions teach the unity of life. The whole purpose of our existence is to realize this unity in diversity, says religion. This is the great law of life. When we try to oppose the Law, we get pain, when we obey, bliss is assured to us. All acts against the Law are sins, others meritorious. You may take the Law as a cruel tyrant if you please, or a loving father who has your happiness at heart if you are so minded. None of us can escape Him and His presence behind is the surest guarantee that the moral laws shall be enforced. Those considerations have made for centuries and still make a powerful appeal to millions of men, and even if it were entirely unnecessary in the case of a few evolved persons who can be a law unto themselves, it would be unwise to throw away this great educative force in dealing with mankind at large.

Religion not only supplies the necessary sanction to morality but it has in the past been a great inspirer of art, as is exemplified by the wonderful mosques, temples,

churches, all over the world. The most beautiful buildings in every nation have generally been 'Houses of God' and connected with religion, in some form. Hundreds of artists have toiled for years on the most lavish decoration, acres of paintings, innumerable statues and images, out of love for God.

Religion has been the foundation of great literature in the world. The mighty and marvelous literature is mostly religious, and has been kept alive for us, by the priests, from mouth to mouth through centuries, when the press did not exist and copying out by hand was a very laborious process. The great literature of Islam, philosophical and scientific, grew out of the Prophet's religious teachings in the few centuries after his death. Other religions have inspired the literature in other countries and history everywhere testifies to the close relationship that exists between the two.

We have thus tried to see how Religion instead of being antagonistic to science serves as a sure basis of morality, and how it has inspired Art and Literature. In spite of all the wrong that has been done in the name of religion, it still remains a great beneficent force in the world and it were folly to ignore it, or to talk of relegating it to the "Scrap Heap." We must take out of it all the good it can give, and try at the same time to reduce the harm it has done. If we look through history we shall see that religion has brought misery only when the adherents of one religion or sect, believing in its superiority, have tried to force it on the others and the best remedy for this is to study all of them in both the parts—the theoretical and the practical—the philosophy and morality.

[The Islamic Literature, Lahore, Dec. 1954 A.D.]

اہم مخطوطات پر

داؤدی صاحب کے شذرات

(اُن کے اپنے سوادِ قلم میں)

تقطیع: ۲۵.۷ × ۱۵.۸ سم — ۱۳ سطور، آدھی عربی اور آدھی فارسی — صفحات ۸۷۰

ترجمہ قرآن کریم فارسیہ حامل المتن

کامل نسخہ نہایت عمدہ حالت میں محفوظ ہے۔ ترقیمۂ کاتب موجود ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:—

این ترجمۂ رفیع قرآن، محبوب دل است، مونس جان، نور نظر، چراغ ایمان،
روشن بزبان پارسی خوان۔ ۵ کارے کردم برائے یاران، حق یار نگار بندہ خوشنود،
تاریخ تمام این زبان گفت، تفسیر کلام حق بحق بود
۱۰۷۱
۷۵۰ ۹۱ ۲۰۸ ۱۱۰ ۱۲

حررہ نعمت اللہ بن عطاء اللہ بتاریخ چہار شنبہ بیست و چہارم ماہ رجب سنہ یک ہزار و ہفتاد و یک۔
حامداً و مصلیاً صلی اللہ علی سیدنا محمد و آلہ الطاہرین و اصحابہ اجمعین الی یوم الدین و سلم تسلیماً کثیراً دائماً

کاتب نسخہ ہذا: نعمت اللہ بن عطاء اللہ

تاریخ اتمام کتابت نسخہ ہذا: ۲۴ رجب ۱۰۷۱ھ

ترقیمۂ کاتب سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب نعمت اللہ ہی نے قرآن کریم کا فارسی ترجمہ کیا ہے یعنی نعمت اللہ ہی مترجم ہیں اور وہی خود نسخہ ہذا کے کاتب بھی ہیں۔ موجودہ نسخہ مترجم فارسی کا اپنا ذاتی مسودہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نقلیں اشاعت پذیر نہیں ہوئیں اور یہ واحد مخطوطہ بخط مترجم علام ہے جو دستبرد روزگار سے محفوظ رہ گیا ہے۔ قرآن کریم کے جتنے فارسی تراجم شائع ہوئے ہیں یہ نسخہ اُن سب سے مختلف ہے۔ فارسی تراجم کے مخطوطات کی کسی فہرست میں یہ موجود نہیں ہے یعنی یہ ترجمہ قلمی صورت میں بھی کہیں محفوظ نہیں ہے اور نہ ہی کسی فہرست نگار نے اسے اپنے یہاں شامل کیا ہے۔ یہ منحصر بفرد مخطوطہ (unique copy) ہے جو مترجم نے خود اپنے قلم سے لکھ کر یادگار چھوڑا ہے۔ یکتا و عدیم النظیر مخطوطہ ہے اور فارسی کے قرآنی لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

تقطیع: ۲۷×۱۳.۲ س-م، سطور: ۱۳، صفحات: ۸۰

تحقیق البرہان فی رسم القرآن

مصنف: عبدالخالق المنوفی بن محمد بن نجم الدین المشہور بشیخ القراء

جامع: سید محمد دراب ساکن کشمیر

سن تالیف: ۱۱۷۱ھ

شنگرفی اور لاجوردی جداول کے درمیان نہایت خوشخط عمل میں لائی گئی ہے۔ عنوان شنگرفی اور سیاہ دو روشنائیوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

موجودہ مخطوطہ ناقص الآخر ہے۔ اس لئے نام کاتب و سن کتابت معلوم نہ ہو سکا۔

رسم الخط پر عدیم النظیر کتاب ہے جو ابھی تک طباعت سے محروم ہے۔ اس کے قلمی نسخے بھی حد درجہ کمیاب ہیں۔ بڑے بڑے کتابخانوں کی فہارس مخطوطات میں نہیں ہے۔

تفسیر یعقوب چرخی

تالیف : مولانا محمد یعقوب بن عثمان بن محمود بن محمد، غزنوی، چرخی نقشبندی متوفی ۸۵۱ھ -
مؤلف علام نے شیراز میں اقامت اختیار کر لی تھی
یہ کتاب سورۃ الفاتحہ + پارہ تبارک (۲۹) + پارہ عم (۳۰) کی تفاسیر کو محتوی ہے - جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پورے قرآن کی تفسیر ہے غلطی پر ہیں - بلکہ سورۃ الفاتحہ اور آخری دو پاروں کی تفسیر کو محتوی ہے -
مختصر میں نظم پارے بھی موجود ہیں - اس کے مختلف مخطوطات میں اضافات متن پائے جاتے ہیں - کچھ حکایات بعد میں شامل کر لی گئی ہیں جو الحاقی ہیں مثلاً سورہ ملک میں قصہ یوسف، قصہ صالح، قصہ لوط، حکایت امام فخر الدین رازی
مؤلف علام کی دیگر تالیفات : نائیہ، انسیہ، حورائیہ (جمالیہ) شرح اسماء الحسنیٰ، ابدالیہ وغیرہ
چونکہ اس کتاب کے بعد کے مکتوبہ نسخوں میں اضافات متن پائے جاتے ہیں اس لئے اہل علم کو اس کے قدیم ترین مخطوطات کی تلاش رہتی ہے تاکہ کاتب کی دخل اندازیاں کم سے کم ہوں -
موجودہ مخطوطہ نایاب مخطوطات میں "کامل" محفوظ ہے -
- از کتابت نسخہ ہذا : ۸۸۹ھ -
موجودہ نسخہ مصنف کے انتقال (۸۵۱ھ) سے صرف ۳۸ سال بعد کتابت کیا گیا ہے اور اس کتاب کا قدیم ترین مخطوطہ (اقدم الکتاب) ہے - اتنا قدیم الکتاب نسخہ اتنے طویل عرصے تک کس طرح محفوظ رہ گیا ورنہ عام طور پر اتنا طویل زمانہ در بدر تمام کے کٹ ناقص الاول، ناقص الآخر، ناقص الباطن ہو کر رہ جاتے ہیں۔
موجودہ مخطوطہ منتہائے روزگار سے ہے -

تقطیع : ۳۲ء۲ × ۲۱ء۳ سم
سطور : ۲۱
صفحات : ۲۲۸

ملفوظات شیخ بہاء الدین نقشبند بخاری

مرتبہ محمد بن محمود الحافظی البخاری المعروف بہ خواجہ محمد پارسا بخاری متوفی ۸۲۲ھ
مرید و خلیفہ و جانشین شیخ بہاء الدین نقشبند بخاری۔

خواجہ محمد پارسا ۷۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ بہاء الدین نقشبندی کی طرف سے انھیں خرقۂ خلافت ملا تھا۔ انھیں "پارسا" کا لقب شیخ بہاء الدین نقشبند علیہ الرحمہ نے عطا کیا تھا۔ ۶۶ سال کی عمر میں حج بیت الحرام کو گئے۔ مدینہ منورہ میں ۲۴ ذی الحجہ ۸۲۲ھ کو انتقال فرمائے۔ تصانیف کے نام: ۱۔ تحقیقات ۲۔ تفسیر سورۂ مومن، سورۃ النبا و سورۃ الملک ۳۔ شرح فصوص الحکم فارسی ۴۔ فصل الخطاب بوصل الاحباب ۵۔ الفصول الستہ ۶۔ مناسک الحج ۷۔ مناقب شیخ بہاء الدین نقشبندی۔

یہ کتاب آج تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے قلمی نسخے بھی حد درجہ کمیاب ہیں۔
بڑے بڑے کتب خانوں میں اس کا کوئی مخطوطہ محفوظ نہیں ہے۔
کامل نسخہ نہایت عمدہ حالت میں محفوظ ہے۔

کاتب: ہدایت اللہ
سن کتابت ندارد۔

Unpublished and extremely rare manuscript

تقطیع: ۲۲٫۸ × ۱۳٫۵ س م
سطور: ۱۵
صفحات: ۵۶

تقطیع: ۱۹.۵ × ۱۳.۸ س م ، سطور: ۱۷ ، صفحات: ۵۰ ـ ۵

مسـ: شرح مثنوی مولوی معنوی

شارح: ؟

پر مشتمل دفاتر کے چیدہ چیدہ اشعار کی مختصر شرح ہے۔ پہلا اور شاید ایک ورق افتادہ ہے۔ ورق ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ تالیف شرح ہذا اورنگ زیب عالمگیر کا عہد حکومت (۱۰۶۸ - ۱۱۱۸ھ) ہے۔ چھ دفتر الگ الگ جلدوں میں ہیں۔ خاتمہ دفتر سوم پر سن کتابت ۱۱۳۱ھ ہے یعنی محمد شاہ بادشاہ کا پہلا سال جلوس۔ اسی طرح دفتر ششم کے خاتمہ پر سن کتابت ۱۱۳۱ھ ہے۔ ہم کتاب اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں تالیف کی گئی جو ۱۱۱۸ھ تک چلتا ہے اور سن کتابت ۱۱۳۱ھ ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ نسخہ سن تالیف کے چند سال بعد نقل کیا گیا ہے۔

کاتب: ابوالخیر خیری محمد اسحق علمی تورانی

تاریخ اختتام کتابت نسخہ ہذا: ۲۹ ذوالقعدہ ۱۱۳۱ھ

عالمگیری عہد میں مثنوی مولوی معنوی مصنفہ مولانا جلال الدین محمد رومی متوفی ۶۷۲ھ کی یہ قیمتی شرح لکھی گئی جو شرح ابیات سے مختلف ہے۔ یہ شرح ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس شرح کا کوئی دوسرا نسخہ کسی کتب خانہ کی فہرست مخطوطات میں موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واحد نسخہ دستبرد روزگار سے محفوظ رہ گیا ہے۔

unique copy غیر مطبوعہ و منفرد نسخہ مخطوطہ ہے

مناقب مرتضوی

تصنیف : میر محمد صالح "مشکین قلم" ابن میر عبداللہ "مشکین قلم" متوفی ۱۰۶۱ھ۔

میر عبداللہ مشکین قلم عہدِ اکبر اعظم (۹۶۳ - ۱۰۱۴ھ) کے مشہور خطاط تھے ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی ان کے دو صاحبزادے میر محمد صالح متوفی ۱۰۶۱ھ اور میر محمد مومن متوفی ۱۰۹۱ھ بھی اپنے عہد کے مشہور خطاط تھے۔ میر محمد صالح کو بھی "مشکین قلم" کا خطاب تھا۔

جملہ علوم متداولہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور شاعر بھی تھے۔ تذکرۂ خوشنویسان مصنفہ [illegible] میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:—

"محمد صالح خان ابن میر عبداللہ مشکین قلم۔ خود ان کو بھی مشکین قلم کا خطاب تھا۔ خوشنویس سحر نگار اور شاعر شیریں گفتار تھے۔ فارسی میں کشفی اور ہندی میں سبحان تخلص کرتے تھے شاہزادوں کی ملیح و دیدہ زیب تھی۔ عہد شاہجہانی میں منصب پنج ہزاری پر فائز تھے نیز شاہی کتب خانے کے مہتمم بھی رہے۔ صاحبِ تصنیف تھے۔ مجموعۂ راز، اور مناقب مرتضوی ان کی تصانیف ہیں ۱۰۶۱ھ میں انتقال ہوا"

میر عبداللہ مشکین قلم کے دونوں بیٹے میر محمد صالح اور میر محمد مومن شاہی کتب خانے کے مہتمم رہے۔ یہ دونوں عہدِ شاہجہانی میں دربارِ شاہی سے منسلک رہے۔ شاہی کتب خانے کے متعدد مخطوطوں پر ان کے دستخط اور تحریریں موجود تھیں۔

میر محمد صالح کا انتقال ۱۰۶۱ھ میں آگرہ میں ہوا اور نگلہ جواہر کے متصل اپنے والد کے گنبد کے قریب مشرقی جانب چبوترے کے نیچے مدفون ہوئے۔

یہ کتاب ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے قلمی نسخے بھی حد درجہ کمیاب ہیں۔ بڑے بڑے کتب خانوں میں اس کتاب کا کوئی نسخہ محفوظ نہیں ہے۔ ایک مشہور خطاط کی تصنیف کو انتہائی خوشنما نستعلیق میں جلی قلم سے کسی استاد نے کتابت کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کاتب بھی اپنے عہد کا ممتاز خطاط تھا۔

کاتب نسخہ ہذا : مولا داد ولد پیر محمد قریشی سیستانی

تاریخ اختتام کتابت : ۱۱ ربیع الاول ۱۲۶۱ھ۔

حسن خط، صحتِ متن اور غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ سے اہم و نادرالوجود مخطوطہ ہے۔

تقطیع: ۲۶٫۸ × ۲۰ س م ، سطور: ۱۵ ، صفحات: ۲۱۰

عربی ترجمہ "الانہار الاربعہ"

متنِ فارسی: از احمد سعید مجددی نسباً و طریقتاً جو شاہ ابو سعید مجددی کے انتقال ۱۲۵۰ھ کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ مؤلفِ علام ۱۲۱۷ھ میں رام پور میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۷ھ میں وفات پائی۔ انہارِ اربعہ مخزوا پیش حاجی علاء الدین احمد تالیف کی جس میں مراقبات و اشغال و اذکار جو خاندانِ مجدد الف ثانی کے معمولات تھے قلمبند کئے، اور سلاسلِ اربعہ مشہورہ کو چار نہروں میں منضبط کیا: نہر ۱ - در بیانِ اشغال و اذکار و مراقبات طریقہ مجددیہ - ۲ - اذکار و اشغال مشائخ جیلانیہ ۳ - اشغال و اذکار چشتیہ ۴ - معمولی طریقۂ نقشبندیہ۔

عربی ترجمہ: از محمد الحفظی ابن سید دلی الدین

تاریخ اتمامِ تالیف و ترتیب: سلخ ربیع الاول سنہ ثمان و خمسین و مائتین والف (۱۲۵۸ھ) مکۃ مکرمہ۔

ترجمہ: یہ ترجمہ مؤلفِ علام احمد سعید مجددی کے صاحبزادے عبد الرشید مجددی کی فرمائش پر انجام دیا۔ مؤلفِ علام کا انتقال ۱۲۷۷ھ میں ہوا ہے اور موجودہ عربی ترجمہ ۱۲۵۸ھ میں یعنی مؤلفِ علام کی حیات میں ہی مکمل ہوا ہے۔

کاتبِ نسخہ ہذا: اللہ عبد القیوم

تاریخ اتمامِ کتابتِ نسخہ ہذا: ۱۱ شعبان ۱۳۲۳ھ۔ غیر مطبوعہ اور یہ نسخہ فرد مخطوطہ ہے جو دستبردِ روزگار سے محفوظ رہ گیا ہے۔

unpublished and unique mss. copy

تقطیع: ۲۰×۱۲.۵ س-م، سطور: ۱۷، صفحات ۱۲۱

داؤدی صاحب کے دو اہم مکتوب

بنام ڈاکٹر وحید قریشی

مکاتیبِ مشاہیر

بنام خلیل الرحمٰن داؤدی

۱۔ محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھی قادری ۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ

۳۔ ممتاز حسن ۴۔ سید امتیاز علی تاج

۵۔ حجاب امتیاز علی ۶۔ مشفق خواجہ

۷۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری ۸۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ

۹۔ جناب امداد صابری ۱۰۔ محمد ادریس السندی

4, Rue de Tournon,
Paris-6 / France

باسمہ تعالیٰ

لیلۃ القدر ۱۴۱۲ھ

محترمی و مکرم زاد مجدکم

سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ رمضان مبارک، عید مبارک۔
میں انجمن کے دفتر کو ہفتے میں صرف ایک بار جا سکتا ہوں اس لئے
ڈاک کے پہنچنے میں دیری ہو جاتی ہے۔ معذور معاف۔

انگلو عرب تفسیر کے اوراق پڑھے۔ خط مشرقی ہے۔ یعنی کسی
اسپین اور افریقہ والے کی تالیف یا نقل کردہ کتاب ہونی
چاہئے۔ میرے پاس گھر میں صرف تفسیر ابن کثیر ہے۔ عرب
تفسیروں کا جو سیکڑوں ہیں، ذخیرہ کہاں ملے؟
آپ کے ذاتی مبارک ذخیرۂ مخطوطات سے ممکن ہے کبھی
آپ کی زحمت فرمائی سے کم از کم نوادر کی حد تک، واقفیت ہو سکے
اور باعث استفادہ ہے۔

خادم
محمد حمید اللہ

No. IC/2/62-1843 - Dated the 25th June, 1963

To,

Mr. Khalilur Rahman Dawoodi,
Tagore Park, Lahore.

Dear Sir,

Please find enclosed a cheque No. 00359/035682 dated the 19th June, 1963 for Rs. 500/00 (Rupees five hundred only) in full and final payment of your bill dated 24.3.1963 on account of cost of the following manuscripts:-

1. One manuscript of Risalah Abdullah Ansari calligraphed by Ali Naqvi.
2. One manuscript of Diwan-i-Jaffar Zatalli.
3. Four printed copies of Kulliat-i-Jaffar Zatalli.

Please send a stamped receipt for record in this office.

Yours faithfully,

sd/-

For Superintendent,
National Museum of Pakistan
Karachi.

ٹیلیفون نمبر : ۳۹۹۵

مجلس ترقی ادب ○ لاہور

۲ ، نرسنگھ داس گارڈن ، کلب روڈ، لاہور

مؤرخہ یکم نومبر ۱۹۶۳ء

نشان 3679

جناب محترم السلام علیکم ـ

یادگار غالب کا صحت نامہ تیار کروایا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں کل ۱۵۲ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ چنانچہ پریس سے کہا گیا کہ وہ کتاب کا صحت نامہ اپنے خرچ پر چھاپ کر کتاب میں شامل کرے، لیکن پریس کا کہنا ہے کہ ۱۵۲ غلطیوں میں سے صرف ۶۳ غلطیاں ایسی ہیں جن کے لیے پریس کو ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے، باقی غلطیاں مرتب کی ہیں اس کے علاوہ مرتب کی ذمہ داری یوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ چھاپنے سے پہلے تمام پروف انھیں دکھا لیے گئے تھے۔ ایسی صورت میں صحت نامے کے تمام اخراجات پریس پر ڈال دینا مناسب نہیں ـ صحت نامے پر کل اخراجات کا اندازہ کم و بیش -/۸۰ روپے ہے! پریس اس میں سے -/۳۵ روپے اپنے ذمے لینے کو تیار ہے اگر آپ کو پریس کے بیان سے اتفاق ہے تو از راہ نوازش اجازت دیجئے کہ باقی رقم آپ کے حساب میں درج کرلی جائے۔اس قسم کے اخراجات اور کسی حساب میں ڈالنے ممکن نہیں ہیں ـ

امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خاکســــــار

[دستخط]

ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور

فون نمبر : ۳۹۹۵

مجلس ترقی ادب ، لاہور

۲ ، نرسنگھ داس گارڈن ، کلب روڈ ، لاہور

مؤرخہ ۵ - ستمبر ۱۹۶۳ء

نشان 2417

مکرمی - سلام مسنون -

آپ نے ۳۰ اگست ۱۹۶۳ء کو کلیات انشاء طبع ۱۸۵۵ء اور گلستان سخن طبع ۱۸۵۵ء مبلغ دو سو روپے میں فروخت کی تھیں - اور ۳۱ - اگست ۱۹۶۳ء کو چیک دو سو روپے کا وصول کیا تھا - لیکن یہ کتابیں لائبریری کے رجسٹر میں اس لئے درج نہ ہو سکیں کہ آپ نے بسلسلہ طباعت کلیات انشاء اور گلستان سخن ہر دو کتب کو اپنے پاس رکھا - براہ کرم ہر دو کتب رجسٹر موجودات کتب لائبریری میں اندراج کرنے کے لئے واپس کردیں - بعد اندراج اپنے نام کتابیں جاری کرالیں -

خاکسار

[signature]

ناظم مجلس ترقی ادب لاہور

TELEPHONE : 4995

REF. NO. 2541 Dated 7-11-64

Board for Advancement of Literature

2, NARSINGH DAS GARDEN
CLUB ROAD, LAHORE - PAKISTAN

جناب محترم السلام علیکم ۔

گزشتہ دنوں دوران گفتگو میں آپ نے فرمایا تھا کہ کراچی سے آپ کو غالب کی کوئی اور نادر نثر دستیاب ہوئی ہے اور آپ اسے مجموعۂ نثر غالب میں شامل کرنا چاہتے ہیں ۔ کتاب کو چھاپ دینے کا پرنٹ آرڈر پریس کو دیا جا رہا ہے، لہذا گزارش ہے کہ از راہ کرم وہ تحریر ارسال فرمادیجئے تاکہ اسے کتاب کے آخر میں شامل کیا جا سکے ورنہ مجبوری کو اس کے بغیر ہی کتاب کی جلد سازی کروالی جائے گی۔

امید کہ آپ بخیریت ہوں گے ۔ والسلام ۔

خاکسار

سید امتیاز علی

ناظم مجلس ترقی ادب

۲۸۳

مجلس ترقیِ ادب

۲- کلب روڈ - لاہور
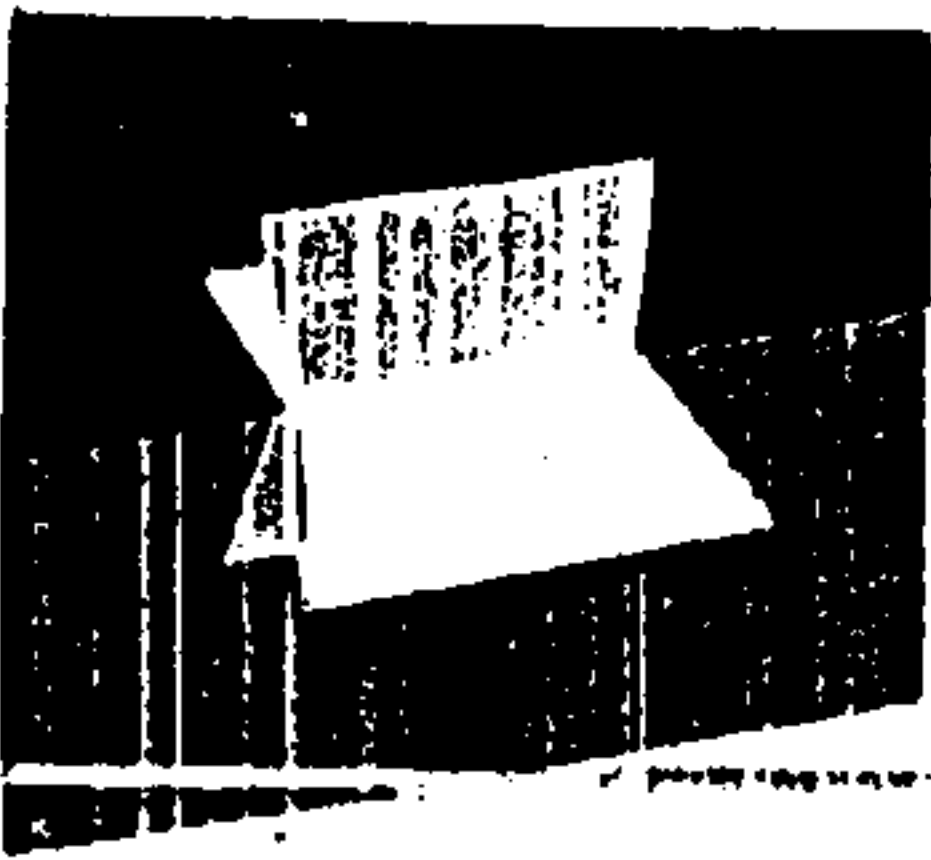
تاریخ ۱۵ - جون ۱۹۶۶ع

۲/م

جناب محترم السلام علیکم -

امید ہے مزاج گرامی بہ خیر ہوں گے -

مشفق خواجہ صاحب نے اپنی کتاب مثنوی سراج نظم کی واپسی کا تقاضا کیا ہے ، میں یہ کتاب ہفتے کے روز (۱۸-جون) واپس کر دینا چاہتا ہوں ، براہ کرم اس سے پہلے مجلس کے دفتر میں تشریف لاکر نقل شدہ نسخے کا مقابلہ اصل سے کر لیجئے، اصل اور نقل کے مقابلے کے لیے مجلس کسی موزوں آدمی کی خدمات بھی مہیا کرنے کو حاضر ہے لیکن اس وقت تک کام مکمل کرنے کو آپ کے لیے وقت نکالنا اگر ممکن نہ ہو سکا تو اس صورت میں مجلس مسودہ بغیر مقابلے کے اس لیے واپس کردے گی کہ مشفق خواجہ صاحب سے اس قسم کے کام اکثر پڑتے رہتے ہیں اور ان کے تقاضے پر کتاب واپس نہ کرنے میں اندیشہ ہے کہ آیندہ وہ مجلس کی امداد سے پہلو تہی فرمائیں گے -

خاکسار

[signature]

ناظم مجلس ترقی ادب لاہور

ٹیلیفون : ۶۳۲۶۲/۳۹۹۵

مجلسِ ترقیِ ادب

۲۔ کلب روڈ۔ لاہور

نشان ________ تاریخ ۲۲۔ ستمبر ۱۹۶۶ء

محترمی داؤدی صاحب۔ تسلیم۔ "طلسمِ حیرت" کا مقدمہ
اور متن دیکھا۔ مقدمہ درست ہے لیکن متن نظرِ ثانی کا محتاج
ہے۔ جو صفحے دیکھے گئے ان میں بعض لفظ غلط نقل ہوئے
ہیں۔ دوسرے مجلس نے ترتیب کے جو اصول بنائے تھے انہیں مدنظر
نہیں رکھا گیا۔ نہ املا کا لحاظ کیا گیا ہے نہ ملے ہوئے الفاظ
جدا کیے گئے ہیں۔ تیسرے بعض الفاظ نقل کرنے والے سے چھوٹ گئے
ہیں، ان کو بھی عبارت میں شامل نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں عبارت
میں کئی الفاظ اس قدر مشکل اور غیر مانوس ہیں کہ ان کے معنی
درج کرنا لازمی تھا کہ وہ بھی نہیں لکھے گئے۔ مسودہ واپس
بھیج رہا ہوں۔ از راہ نوازش سب باتوں کا خیال کرکے ایک دو
روز میں اس پر نظرِ ثانی فرما دیجئے کہ یہ پریس میں دیے جانے کے
قابل بن جائے اور معاوضہ ادا کیا جا سکے۔ کاتب کا بل مسودہ
وصول ہوتے ہی ادا کر دیا جائے گا۔

امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام۔

خاکسار

امتیاز

ناظم مجلس ترقی ادب لاہور

۴۔ ایبٹ روڈ
لاھـور

محترمی و مخدومی ۔ تسلیم ۔ آپ کے تشریف لے جانے کے کئی روز بعد آپ کے گھر سے اطلاع ملی کہ آپ کراچی میں ھیں ۔ وھاں از راہ کرم میرے دو کام کر دیجئے ۔ پٹیالہ وکیل خانے کی عمارت کے سلسلے میں میں آج ممتاز حسن صاحب کو خط لکھ رہا ھوں ۔ مجھے ایک ذریعے سے معلوم ہوا ھے کہ میرے کاغذات وھاں فوث محی الدین صاحب کے پاس اٹکے ہوئے ھیں" سنا ھے وہ کسی بات کا فیصلہ کرنے میں بہت سست واقع ہوئے ھیں۔ ممتاز حسن صاحب از راہ کرم مجھ پر دو مہربانیاں فرمائیں ۔ ایک تو فوث صاحب سے یہ کہ کر کاغذات منگوائیں کہ جس شخص سے اس معاملے کا تعلق ھے، وہ یاد دھانیوں کے خط برابر لکھ رہا ھے۔ دوسرے عمارت دس سال کے لیے کرائے پر لیں تاکہ میرا بنک کا قرضہ اتر سکے اور تعمیر کے سلسلے میں بعض ضروری کام کرنے کے لیے روپیہ مہیا ہو سکے ۔ میں ممتاز حسن صاحب کو خط لکھ رہا ھوں ۔ ممکن ھے اپنی بے شمار مصروفیتوں میں اِس معاملے کا فیصلہ کرنا اُن کے ذھن سے اتر جائے، اِس لیے آپ میرے دن رات کے تفکرات کا ذکر کرکے یہ کام کسی طرح ختم کرانے کی کوشش فرمائیے جس کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ھوں گا ۔

دوسرے عمارت کے لیے وھاں کے بعض پراپرٹی ایجنٹوں سے کرائے دار حاصل کرنے کی بات کیجئے کراچی کے کئی بڑے تاجر لاھور میں دفتر کھولنے کے لئے جگہ تلاش کرتے رھتے ھیں ۔ عمارت کے متعلق مفصل اور ضروری معلومات میں انشاء اللہ تعالیٰ کل آپ کی خدمت میں روانہ کردوں گا ۔

پولیس کیس میں کوئی خاص نئی بات نہیں ہوئی ۔ کئی چھوٹی چھوٹی تفصیلیں ھیں جو آپ کے آنے پر زبانی بیان کروں گا ۔ بورڈ کی میٹنگ ۲۰ ۔ مئی کو وزیر تعلیم کی صدارت میں ہو گئی ۔ میں نے اس میں تمام الزامات کا مفصل جواب دیا اور مجلس نے بہ اتفاق رائے تمام الزامات کو بے بنیاد پایا اور ناظم کی حسن کارکردگی کو قابل تحسین قرار دیا ۔ قرار داد کی نقل اے پی پی کو بھیج دی گئی ھے۔ انشاء اللہ آج کل میں اخبارات میں شایع ہو جائے گی ۔

جس طرح بھی بنے ممتاز حسن صاحب سے میرا کام کرا دیجئے ۔ بنک دس سال کے لیے دفتر لے لے تو ایسے تردد سے نجات مل جائے جو پہاڑ کی طرح دن رات سینے پر رکھا ھے۔

امید کہ آپ بہ خیریت ھوں گے ۔ والسلام ۔

خاکسار

سید امتیاز علی تاج

۲۷ ۔ مئی ۶۴ء

[illegible handwritten note]

۳۰- ایبٹ روڈ لاھور

۱۷- اکتوبر ۱۹۶۷ء

محترمی و مخدومی داؤدی صاحب - تسلیم - گرامی نامہ موصول ھوا تھا -

افسوس کہ رحمٰن صاحب نے طلسم حیرت کو اِس سال کے پروگرام میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دی - اُن کا ارشاد تھا کہ جو پروگرام بورڈ میں پیش ھوا اور بورڈ نے منظور کر لیا اُس میں ترمیم کا حق ھمیں نہیں پہنچتا - اِس قسم کی بعد کی ترمیموں سے ایک تو سارا طریق کار بے معنی بن جائے گا، دوسرے ایک غلط مثال قایم ھو جانے کے بعد اِس قسم کی (ایرادِ؟) ترمیموں کے اَور مطالبوں کے لیے ھمیشہ کو راستہ کُھل جائے گا - مجھے دلی افسوس ھے کہ میں آپ کی فرمایش کی تعمیل سے قاصر رھا مگر مجبور ھوں - البتہ اگلے سال کا جو پروگرام محکمۂ تعلیم کو اِن دنوں بھیجا ھوتا ھے، اُس میں میں نے آپ کے اِس مسودے کا نام درج کر لیا ھے -

آپ یہاں تھے تو میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ بھائی جان نے خطوط کے سلسلے میں وکیل سے نوٹس بھجوایا ھے - اب اُنھوں نے دعوےٰ دائر کر دیا ھے - میرا وکیل معلوم کرنا چاھتا ھے کہ خطوط کس تاریخ کو فروخت ھوئے اور فروخت کا چک کس تاریخ کا ملا - دوسرے وہ یہ معلوم کرنا چاھتا ھے کہ اِس سلسلے میں بھائی جان اور میوزیم والوں کے جو خط و کتابت ھوئی، کیا اُس کی نقل مل سکتی ھے ؟

مقدمے کی تاریخ قریب ھے اور جواب دعوےٰ لکھنے میں اِن معلومات کی اشد ضرورت ھے اگر وھاں کی مصروفیت اور پریشانیاں آپ کو اِتنی کام کے لیے کچھ وقت نکالنے کی مہلت دے سکیں تو براہ کرم تاخیر کو راہ نہ دیجئے گا - یہ معلومات بواپسی مجھے مل جائیں تو میں آپ کا بے حد احسان مند ھوں گا - امید کہ آپ بخیریت ھوں گے -

آپ کب تک لاھور واپس آنے کا قصد رکھتے ھیں ؟

خاکسار

(دستخط)

(سید امتیاز علی تاج)

۳۰۔ ایبٹ روڈ لاہور
۱۲- مئی ۱۹۶۹ء

محترمی و مخدومی داؤدی صاحب۔ تسلیم ۔ آپ کے گرامی نامے کا جواب لکھ چکا ہوں ۸۔ مئی تو گزر چکی ۔ نہ معلوم آپ کے معاملات کا کیا ہوا؟۔ یہ خط ایک ضرورت سے لکھ رہا ہوں۔ آپ کو علم ہوگا کہ مختار مسعود صاحب کمشنر لاہور ڈویژن W.P.I.D.C. کے چیئرمین بن کر کراچی تشریف لے گئے ہیں اور حکومت کی ایماء پر ان دنوں کوشش فرما رہے ہیں کہ اس کارپوریشن کو کراچی سے لاہور منتقل کر لیا جائے چنانچہ سنا ہے کہ اس کے لیے لاہور میں مناسب جگہوں کی تلاش سرگرمی سے جاری ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ انھیں کل ۷۰ ہزار مربع فٹ جگہ کی ضرورت ہے جس میں سے تھوڑی سی جگہ تو وہ واپڈا ہاؤس لاہور میں لے چکے، باقی جگہ حاصل کرنے کی کوششیں عمل میں آرہی ہیں ۔ میں نے اپنی پٹیالہ وکیل خانہ گراؤنڈ کی عمارت کا نقشہ اور جملہ تفصیلات مختار مسعود صاحب کی خدمت میں کراچی بھیج دی تھیں ۔ کل اُن کے ڈپٹی سیکرٹری محمد موجود صاحب نے میرے خط کے جواب میں لکھا ہے کہ جب موقع نکلے گا تو مجھے مطلع کیا جائے گا ۔ میں چاہتا تھا کہ اگر آپ W.P.I.D.C. کے کسی ایسے صاحب کو جانتے ہوں جن کی رائے اِس معاملے میں دخل رکھتی ہو تو آپ از راہ کرم انھیں میری عمارت کی تفصیلات سے مطلع فرمادیں کہ یہ نئی بنی ہوئی، صاف ستھری اور بہت مرکزی جگہ واقع ہے، بجری کا فرش ہے، چاروں طرف سڑکیں ہیں۔ پہلوؤں کی سڑکیں ایسی ہیں جن پر شہر اور مال روڈ کے درمیان دوسری سب سڑکوں سے زیادہ آمد و رفت ہے۔ چنانچہ جیسی پبلسٹی اِس جگہ ہو سکتی ہے فی الحال لاہور میں اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ دو ہال اوپر ہیں، دو نیچے تہ خانے میں۔ اوپر نیچے کے ہالوں میں سے بڑے ہالوں میں سے ایک ایک کا رقبہ ۲۵۰۰ مربع فٹ اور چھوٹے ہالوں میں سے ایک ایک کا رقبہ ۱۰۰۰ مربع فٹ ہے، گویا عمارت میں کرائے کے لیے کل رقبہ فی الحال ۷۰۰۰ مربع فٹ ہے کرایہ اس علاقے کے نرخ کے مطابق اوپر کے ہالوں کا عہ/۱ فی مربع فٹ اور نیچے کے ہالوں کا ۱۰/ مربع فٹ ہے ۔

میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا اگر آپ کی توجہ سے یہ عمارت کرائے پر چڑھ جائے۔ بنائی تو یہ سمجھ کر تھی کہ ریٹائر ہونے کے بعد سہارا بنے گی۔ صورت یہ ہے کہ تعمیر کے لیے بنک سے جو روپیہ قرض لیا ابھی وہ بھی نہیں اُتر سکا۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری امداد میں اپنے بس کی کوئی جائز کوشش اٹھا نہ رکھیں گے۔ اور مجھے دلی سکریے کا موقع بخشیں گے ۔

خادم
امتیاز
(سید امتیاز علی تاج)

٢٨٨ (اعترافِ امتیاز)

PHONE: 4995
No.

Board for Advancement of Literature

2, NARSINGH DAS GARDEN
CLUB ROAD, LAHORE - PAKISTAN

This affords me immense pleasure to record my deep appreciation of the academic and literary performance made by Mr.Khalil-ur-Rehman Dawoodi during the last ten years in Pakistan. Mr.Dawoodi is a scholar of high intellectual pursuits and a writer of prolific pen. He has contributed his research writings to famous literary magazines of the Country. Radio Pakistan also stands in gratitude to Mr.Dawoodi for his scholarly and illuminating talks on History, Literature and Religion at frequent intervals.

Tremendously impressed as I am with his highly valuable contributions in the domain of modern and classical Urdu literature, I can safely recommend him for any academic assignment of extraordinary aptitude and talent. Mr.Dawoodi has recently accomplished his work for about half a dozen books on Urdu classics entrusted to him by the Board for the Advancement of Literature. I am confident he will prove really an asset for the Board and also to any other sphere of scholastic activity he be-takes himself.

(S.Imtiaz Ali Taj, Sitara-e-Imtiaz
Director,
Board for Advancement of
Literature, Lahore.

Dated:- 15.3.1961.

۲۷ شوکت حیات کالونی
لاہور۔
۱۴ اگست ۸۲ء

جناب داؤدی صاحب۔ تسلیم۔

میں نے سنا تھا آپ بیمار تھے۔ لیکن یقین ہی نہیں آیا۔ دوبارہ سنا تو یہ خیال آیا ممکن ہے۔ نور خاں سے خیریت پوچھی تو معلوم ہوا اب روبصحت ہیں۔ خیال تھا آپ کراچی ہوں گے۔

چند پرانے رسالے بھیج رہا ہوں معلوم نہیں آپ کے لیے کارآمد ہوں کیونکہ پرانے رسالے آپ کے ذخیرے میں پڑے ہوں گے۔

میں رسالے سنبھال کر رکھا کرتی تھی اب تو بچے آ کر سنبھالنا بھی مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔

کراچی کا کیا سوال ہے؟

شکرگزار
حمایت زیدی

48 L - Gulberg III
Lahore.
۱۷ نومبر ۷۷

محترمی جناب داؤدی صاحب تسلیم۔

دیکھئے از براۓ خدا مجھے کو رسیت
کی طرح نہ پامال کیجئے۔ کھلتے کھلتے رک گئی ہوں اور
کو رسیت کی رسم ضرورت ہے۔ آپ خود
عالم ہیں اور جانتے اور محسوس کر سکتے ہیں کہ
کسی کا کھلتے کھلتے رک جانا کیا قیامت ہوتا ہے
جیسے حرکت قلب۔۔۔
امید ہے کہ آپ خوش اور تندرست
ہونگی اور اس برزخ جیسی دنیا میں ہمت سے کام
لے رہے ہونگے
خدا حافظ حجاب امتیاز علی

مزید
رنگ خزاں ہے
یا زردی کا دور دورہ رنگ سیاہ بن ہے!

محترمی و مکرمی۔ سلام مسنون

عید کی مبارک باد کا ٹیلی گرام ملا۔ اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو آنے والی بے شمار عیدوں کی مسرتوں سے نوازے۔ آمین۔

یگانہ کا جو مضمون آپ نے عنایت فرمایا تھا، وہ ۱۹۲۵ء میں "صحیفہ" اناوہ میں چھپ چکا ہے۔ لیکن اس میں اور قلمی متن میں خاصے اختلافات ہیں۔ یگانہ نے اس مضمون کو "صحیفہ" میں چھاپتے وقت خاصی تبدیلیاں کی ہیں۔ دونوں کے تقابلی مطالعے سے دلچسپ نتائج سامنے آتے ہیں۔ آپ نے یہ ایک بیش قیمت تحفہ عنایت فرمایا۔ اسی پر کیا موقوف ہے، اس سے پہلے بھی آپ متعدد مرتبہ کرم فرما چکے ہیں۔ محمد شاہ اللہ قاسم کا مطبوعہ نسخہ اور مخطوطہ بھی نہایت نادر ہیں۔

خدا آپ کو خوش رکھے کہ آپ اپنے نیاز مندوں کو خوش رکھتے ہیں۔

آپ کی صحت و شادمانی کا طالب ہوں

خیر اندیش

مشفق خواجہ

۳-۸-۹۳ء

بخدمت گرامی

محترم خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب

لاہور

٣ڈی - ٩/٢٦ ناظم آباد
کراچی - ٧٤٦٠٨

محترمی و مکرمی۔ سلامِ مسنون

عزیزی رفاقت علی شاہد کے ذریعے شیخ چاند کی کتاب "سودا" کا نادر نسخہ ملا۔ اس عنایت کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

آپ اہلِ علم کو تو نوازتے ہی ہیں، لیکن مجھ جیسے بے علموں پر بھی عنایت کی نظر رکھتے ہیں۔ یہ آپ کی عظمت ہے، ورنہ اس دور میں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں۔

میں کئی بار آپ سے گزارش کر چکا ہوں، اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو آنے والی نسلوں کے لیے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیجیے۔ کیسے کیسے لوگوں سے آپ کے تعلقات رہے ہیں، اور کیسے کیسے حالات میں آپ نے زندگی بسر کی ہے۔ ان سب احوال و واقعات کو محفوظ کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر میں لاہور میں ہوتا تو ہر روز تقاضا کرتا۔

خدا آپ کو صحت مند اور خوش و خرم رکھے۔

خیر اندیش
مشفق خواجہ
١٩-١١-٩٨

بخدمتِ گرامی
محترم خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب
لاہور

۳ ڈی - ۹/۲۶ ناظم آباد
کراچی - ۷۴۶۰۸

محترمی و مکرمی ۔ سلام مسنون

یہ خط مجھے بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا مگر طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے کوئی کام وقت پر نہ ہو سکا ۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں ۔

سب سے پہلے تو اس کا شکریہ کہ عید الفطر پر آپ کا تہنیت نامہ ملا تھا ۔ یہ آپ کا کرم ہے کہ آپ ہر عید پر مجھے یاد رکھتے ہیں اور یہ میری خوش قسمتی کہ ہر عید پر میں آپ کو یاد آتا ہوں ۔

عزیزی رفاقت علی شاہد کے ذریعے جولائی ۱۹۹۸ء کا "اردو" مجھے مل گیا تھا ۔ اس کا شکریہ میں ادا نہیں کروں گا کہ آپ کی اس قسم کی عنایات کا شکریہ ادا کرنا شروع کیا تو پھر زندگی اسی میں بیت جائے گی ۔
آپ کی صحت و توانائی کے لیے دعا کرتا ہوں ۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ
۱۹-۳-۱۹۹۹ء

بخدمت گرامی
محترم خلیل الرحمٰن داؤدی
۱۳۸

بسم

PROFESSOR
MOHD ANSAR ULLAH
M A Ph.D.
4/1172, Sir Sayed Road
Sir Sayed Nagar, Aligarh

19 JAN 2000

مخدوم گرامی   وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

آپکا دعاؤں اور خلوص سے بھرا ہوا گرامی نامہ مورخہ ۱ جنوری ۲۰۰۰
مل گیا تھا لیکن میں بیٹی کی شادی کی ترتیب میں مصروف رہا اور جواب میں تاخیر ہو گئی۔
شرمندہ ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ شادی خیریت کے ساتھ ہو گئی اور تمام ترتیبات
معقول طور پر انجام کو پہنچ گئیں۔ اللہ بچی کو اسکی سسرال میں خیروعافیت اور عزت کے
ساتھ رکھے۔ آمین

آپکا یہ خیال بہت مثبت اور مناسب ہے کہ فہرست کی جلد اول چھپوا دیں۔
اگر ایسا ہو جائے تو واقعی بڑی سہولت ہو جائیگی انشاء اللہ۔

تبلیغ سے متعلق کتابچہ کا خیال بہت اچھا ہے۔ دراصل ہو یہ رہا ہے کہ چند
معروف عنوانات اور موضوعات سے متعلق ہی کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور ان سے تکرار مطالب کے
سوا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ حال یہ ہے کہ مثال کے طور پر یوسف حسین خاں مرحوم نے اردو غزل
کے نام سے کئی سو صفحے کی کتاب لکھ ڈالی لیکن اس میں دیکھیے کہ غالب کی ایک غزل کو کم سے کم
سات جگہ مثال میں پیش کیا گیا ہے اور سینکڑوں ورق سیاہ کرنے کے بعد خود کاغذ
کالا کرنے والے کا حال یہ رہا کہ غزلوں کے انتخاب میں ذوق کا جو اسکی رائے میں کچھ بیچارہ
غزل کا نہیں ہے، قصیدے کا ہے۔

آپنے نئے موضوعات اختیار کیے ہیں۔ بے شک ایسے کاموں میں دشواریاں بہت ہوتی ہیں لیکن
عام کی توسیع کا مقصد انہیں سے پورا ہوگا انشاء اللہ۔ کوئی چیز میرے سامنے آئیگی تو ضرور مطلع
دیا کریں۔ آپ سے دعاؤں کا طالب
انصار اللہ
۳/۱

IMDAD SABRI
Madarsa Saulatiya
P. O. No. 114
Makkah Saudi Arabia
T.P. 5425105

Delhi Off.
Choori Walan, Delhi
Phone : 275690
277023

محترمی — سلام اللہ علیکم

میں ۲۳ مارچ کو کراچی آ گیا ہوں — لاہور آنا چاہتا ہوں
لیکن کمزور اتنا ہو گیا ہوں۔ کہ بغیر دوسرے آدمی کے سفر نہیں
کر سکتا — اسلئے آپ سے درخواست ہے اگر آپ کراچی
آ رہے ہوں تو مجھے ساتھ لے جائیں — یا آپ کا کوئی آدمی کراچی سے
آ رہا ہو لاہور — تو مجھے اپنے ساتھ لے جائے — لاہور
کے اور احباب کا بھی تقاضہ ہے دوسرے تاریخ صحافت اردو کی
چھٹی جلد کیلئے بھی لاہور جانا ضروری ہے۔ امید ہے
کہ آپ میری معروض پر توجہ دینگے اور آپ خیریت سے
ہونگے

خاکسار
امداد صابری
۲۳/۳/۸۵ — از کراچی

[illegible]

[illegible]

مولوی۔ ڈ۔ محمد ارسل السندی
قاسمیہ لائبریری۔ کنڈیارو۔ ضلع نوشہرو فیروز
سندھ

۱۷/۵/۱۹۹۹

سلاسلامت
محترم المقام محترم جناب سائیں خلیل الرحمٰن داؤدی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: بعد از آداب وعزت ملاحظہ گذارش اینکہ اس دن ٹیلیفون پر بات چیت ہوئی۔ کل عمدۃ الواعظین کا مخطوط بھی پہنچا ہے۔ جس کے بارے میں جلد ہی مفصل کرکے مطالعہ کرونگا اگر اصل رکھنا ہے یا اصل واپس کرکے فوٹو رکھنا ہے۔ سردست آپ کے مطالعہ کے لئے برائے ۵ نسخہ جات قلمیہ (جو کچھ مجھے ان کے بارے میں معلوم ہوا) ارسال خدمت ہیں۔ کچھ تاخیر ہوگئی (آپ کو انتظار بھی شدید ہوگا) کیونکہ میں کچھ سفر میں تھا۔ بہرحال آئندہ جلدی میں معذرت کرکے ارسال کرنے کی کوشش کرتا رہونگا۔

مخطوطات سندھی علماء کے سلسلہ میں آپ کی خصوصی نوازش کا نہایت ممنون و مشکور ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی ایسی عنایتیں فرماتے رہینگے۔ اگرچہ ہمارا ادارہ قاسمیہ لائبریری کسی سرکاری ادارہ تو نہیں۔ لیکن ایک پرائیویٹ ادارہ ہے۔ جس میں ریسرچ کے ساتھ ساتھ اشاعت کتب (سندھی زبان میں) کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ کافی اسکالر اور PhD کرنے والے اس سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ تقریباً ۳۰۰۰۰ تیس ہزار کتب جمع کردی ہیں (یہ الگ بات ہے کہ اتنے مالدار نہیں کہ ہر شوق پورا کیا جا سکے)۔ لیکن کتب بینی اور کتب جمع کا شوق انوکھا ہے۔ بہرحال سندھی علماء کی کتب بزبان عربی وفارسی و سندھی کا انتظار رہیگا۔ جب بھی آپ انہیں مطلع کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے علم میں برکت دے

● دو مخطوطہ کے بارے میں آپ جو جستجو فرما رہے ہیں۔ اس پر یہاں کے ساتھی حیران ہیں۔ ہر مخطوطہ کیلئے، فہارس وغیرہ کی کتب کھولنا، ان پر تحقیق کرنا۔ انکے فوٹو سٹیٹ لگانا۔ یہ ہر ایک کا کام تو نہیں۔ اللہ آپ کے علم و جستجو و تحقیق میں برکت دے آمین۔ اکفاف الکافر بمرد فات الشیخ عبدالقادر از تالیف مخدوم محمد قاسم ٹھٹوی کا ایک نسخہ تین دن پہلے پیر جو گوٹھ پیر جھنڈا کی لائبریری سے فوٹو اسٹیٹ کروایا ہے جو خود مخدوم صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اب اس پر کام کر رہا ہوں۔ اس

کے ایک مخطوطہ کے بارے میں آپ نے ملاقات کے دوران ارشاد فرمایا تھا کہ
ڈاکٹر عبدہ کے پاس ہجرہ کونسل اسلام آباد میں آیا تھا، لیکن انہوں نے نہیں
خریدا، جو بعد میں العین یونیورسٹی ابوظبی نے خریدا — کیا اس
کے فوٹو اسٹیٹ کروانے کا امکان ہے۔ کیا اس سلسلہ میں آپ تعاون کر سکتے
ہیں۔ تاکہ تحقیق کے دوران وہ بھی سامنے رہے —

● مولوی گل زمان صاحب نے کل پرسوں ٹیلیفون کیا تھا (لاہور سے) لیکن
افسوس کہ میں اس وقت موجود نہ تھا — آپ کا دعاگو

محمد اقبال المجددی

قاسمیہ لائبریری۔ کنڈیارو۔
نوشہرو فیروز سندھ

(ملاحظہ) (محمد اقبال مجددی)
یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ۵ صفحے پر مشتمل
علم سجاوندی کا، فوٹو اسٹیٹ ارسال کر رہا ہوں
اصل نسخہ مکتبہ راشدیہ پیر جو گوٹھ
خیرپور میرس سندھ میں موجود ہے

کسنڈا سارو
21.8.2001

محترم جناب محترمی ومکرمی سائمن داؤدی صاحب سلامت سلامت۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: بعد از سلام مسنون و آداب لائقہ گذارش اینکہ آپ کے دو خطوط یکے بعد دیگرے ۶ اور ۱۲ اگست ۰۱ء کو موصول ہوئے۔ پہلے خط میں آپ نے شرح ھدایۃ الحکمۃ للمیبذی کا حاشیہ مؤلفہ محمد بن الحسن العلمی کے بارے میں استفسار کیا تھا اور دوسرے خط میں فتاوی مسافری کے بارے میں۔ آنجناب کے خط لکھنے کا شکریہ۔ ساتھ ساتھ ابھی تک قرآن مجید مخطوطات (جو کہ چوری ہوگئے ہیں) کے نہ ملنے پر افسوس اور دکھ قائم رہا۔ اللہ تعالی ان شاء اللہ ان سارے مخطوطات کو آپ کے پاس واپس راجع کرے گا۔ ہم آپ کے لیے اس سلسلے میں دعا کرتے رہتے ہیں۔ اللہ پاک ان ظالموں کو (اگر وہ ھدایت کے لائق نہیں) ھدایت کرے ورنہ برباد کرے۔

● حاشیہ میبذی کے بارے میں میں نے جو ۶/۵/۱۹۹۹ کو آپ کی طرف تفصیل لکھا تھا۔ وہی ارسال کر رہا ہوں۔ قبول افتد۔

● فتاوی مسافری کے بارے میں سردست مجھے کوئی معلومات نہ مل سکی۔ جیسے ہی کوئی کامیابی ہوئی اگلے خط میں لکھ بھیجوں گا۔ ان شاء اللہ تعالی۔

● میں آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک آپ کے پریشانی دور فرمائے۔ قرضے کا بوجھ ہلکا کرے۔ چوری شدہ مخطوطات واپس لائے۔ اور رزق و اولاد میں برکت عنایت کرے۔ فقط

الداعی الی الخیر [illegible]

مشفق خواجہ

داوٗدی صاحب — چند تأثرات

خلیل الرحمٰن داوٗدی ہمارے اُن اہلِ علم میں سے تھے، جنھوں نے نام و نمود سے بے پروا ہو کر اور ایک گوشے میں بیٹھ کر ایسے ایسے علمی و ادبی کارنامے انجام دیے، جن سے اہلِ علم و ادب ہمیشہ روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔ وہ اُردو فارسی اور عربی زبانوں سے گہری آشنائی رکھتے تھے اور ان تینوں زبانوں کے حوالے سے علمی معلومات کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ خصوصاً اِن زبانوں کے مخطوطات کا وسیع علم رکھتے تھے۔ وہ دنیا کے تمام اہم کتب خانوں میں موجود مخطوطات کے ذخائر سے واقف تھے اور انھیں معلوم تھا کہ کس کتاب کا اہم ترین یا قدیم ترین نسخہ کہاں ہے۔ مخطوطہ شناسی میں حافظ محمود شیرانی کے بعد اُن جیسا صاحبِ نظر شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ چونکہ یہ فن اُن کا ذریعۂ معاش بھی تھا، اس لیے بلا مبالغہ ہزاروں مخطوطات سے وہ براہِ راست آگاہی رکھتے تھے۔ تجارتی مقاصد سے اُنھوں نے مخطوطات کی جو فہرستیں تیار کی تھیں، وہ اگر شائع ہو جائیں تو دنیا بھر کے مخطوطہ شناسوں کی رہنمائی کریں گی۔ میرے پاس اُن کی اس قسم کی چند فہرستیں ہیں جو تحقیقی کاموں میں بے حد مفید ثابت ہوتی ہیں اور میں نے انھیں بنیادی کتبِ حوالہ کے ساتھ رکھا ہے۔

اُردو ادب کے حوالے سے داوٗدی صاحب نے بڑا وقیع کام کیا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ درجن نظم و نثر کی کتابیں اُنھوں نے مرتب کی ہیں۔ یہ سبھی مطبوعہ کتابیں ہیں،

لیکن نوادر کا درجہ رکھتی ہیں۔ اُنھوں نے ان کتابوں کے مقدموں میں جو دادِ تحقیق دی، وہ کچھ اُنھیں کا حصہ ہے۔ اُنھوں نے مضامین نو کے ایسے انبار لگائے ہیں کہ ان کی نظر کی وسعت اور گہرائی پر حیرت ہوتی ہے۔ ایسے ایسے مصادر سے مفید مطلب لوازمہ حاصل کیا ہے، جن کی طرف عام طور پر دھیان نہیں جاتا۔ اس طرح اُنھوں نے ثابت کر دیا کہ ادبی تحقیق کے لیے صرف ادبی کتابوں سے استفادہ کرنا کافی نہیں، دیگر موضوعات کی کتابوں سے بھی بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

داؤدی صاحب کی نظر جتنی وسیع تھی، اُس سے کہیں زیادہ اُن کے دل میں وسعت و کشادگی تھی۔ وہ علمی کاموں میں دوسروں کی مدد جس طرح کرتے تھے، اُس کی کوئی دوسری مثال میری نظر میں نہیں ہے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی کام کرنے والا اُن کے پاس جائے اور وہ اُس کی مدد نہ کریں۔ مدد کرنے کا انداز بھی منفرد تھا۔ مآخذ و مصادر کے سلسلے میں رہنمائی کرنے کے ساتھ ایسا بھی ہوتا تھا کہ متعلقہ موضوع پر اُن کے پاس جو کچھ ہوتا، وہ بھی کام کرنے والے کو تحفتاً پیش کر دیتے۔ میرے ساتھ بارہا ایسا ہوا کہ کسی موضوع پر کام کرتے ہوئے اُن کی مدد چاہی تو اُنھوں نے کئی نادر اور کمیاب کتابیں یہ کہہ کر میرے حوالے کر دیں کہ یہ آپ کی نذر ہیں۔ یہی نہیں، بعد میں بھی انھیں میرے موضوع سے متعلق کوئی کتاب ملتی تو بھجوا دیتے۔ میرے کتب خانے میں اُن کی عنایت کردہ درجنوں کتابیں موجود ہیں اور اُنھیں میں جب دیکھتا ہوں تو اُن کا مہربان چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

خدا اُن کی روح کو شاد رکھے کہ اُنھوں نے زندگی بھر دوسروں میں خوشیاں تقسیم کیں۔

۳۱-۱-۲۰۰۳ء

خلیل الرحمٰن داؤدی ہمارے ان اہل علم میں سے تھے، جنھوں نے نام و نمود سے بے پروا ہو کر اور ایک گوشے میں بیٹھ کر ایسے ایسے علمی و ادبی کارنامے انجام دیئے، جن سے اہل علم و ادب ہمیشہ روشنی حاصل کرتے رہیں گے۔ وہ اُردو، فارسی اور عربی زبانوں سے گہری آشنائی رکھتے تھے اور ان تینوں زبانوں کے حوالے سے علمی معلومات کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ خصوصاً ان زبانوں کے مخطوطات کا وسیع علم رکھتے تھے۔ وہ دنیا کے تمام اہم کتب خانوں میں موجود مخطوطات کے ذخائر سے واقف تھے اور انھیں معلوم تھا کہ کس کتاب کا اہم ترین یا قدیم ترین نسخہ کہاں ہے۔ مخطوطہ شناسی میں حافظ محمود شیرانی کے بعد ان جیسا صاحب نظر شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ چونکہ یہ فن اُن کا ذریعہ معاش بھی تھا، اس لئے بلا مبالغہ ہزاروں مخطوطات سے وہ براہ راست آگاہی رکھتے تھے۔ تجارتی مقاصد سے انھوں نے مخطوطات کی جو فہرستیں تیار کی تھیں، وہ اگر شائع ہو جائیں تو دنیا بھر کے مخطوطہ شناسوں کی رہنمائی کریں گی۔ میرے پاس اُن کی اس قسم کی چند فہرستیں ہیں جو تحقیقی کاموں میں بے حد مفید ثابت ہوتی ہیں اور میں نے انھیں بنیادی کتب حوالہ کے ساتھ رکھا ہے۔

اُردو ادب کے حوالے سے داؤدی صاحب نے بڑا وقیع کام کیا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ درجن نظم و نثر کی کتابیں انھوں نے مرتب کی ہیں۔ یہ سبھی مطبوعہ کتابیں ہیں لیکن نوادر کا درجہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے ان کتابوں کے مقدموں میں جو دادِ تحقیق دی، وہ کچھ اُنھی کا حصہ ہے۔ انھوں نے مضامینِ نو کے ایسے انبار لگائے ہیں کہ اُن کی نظر کی وسعت اور گہرائی پر حیرت ہوتی ہے۔ ایسے ایسے مصادر سے مفید مطلب لوازمہ حاصل کیا ہے، جن کی طرف عام طور پر دھیان نہیں جاتا۔ اس طرح انھوں نے ثابت کر دیا کہ ادبی تحقیق کے لیے صرف ادبی کتابوں سے استفادہ کرنا کافی نہیں، دیگر موضوعات کی کتابوں سے بھی بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یادنامۂ داؤدی

مرتبین:
تحسین فراقی
جعفر بلوچ